A Disastrous History of the World

تاریخ آفاتِ عالم

تحقیق وتالیف
اخلاق احمد قادری

A Disastrous History of the World

تاریخ آفاتِ عالم

آتش فشانیاں، زلزلے، طوفان، سونامی، وبائیں، حادثات، جنگیں، سیلاب، آتش زدگیاں، قتل عام، دہشتگردی اور دیگر آفات۔ کرہ ارض پر آنے والی آفتوں کی ایک مبسوط تاریخ اور تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کیے گئے اہم وقائع جو انسانیت کو پیش آنے والے قدرتی و غیر قدرتی مصائب کا ایک گوشوارہ جو قاری کے دل کو ہلا دے گا

تحقیق و تالیف

اخلاق احمد قادری

DUA PUBLICATIONS

"اے رب! میرے علم میں اضافہ فرما"

ہماری کتابیں، معیاری کتابیں، پیاری کتابیں

انتباہ

تمام پبلشرز/دکاندار حضرات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کتاب ہذا کی جعلی کاپی فروخت کرنے والے کے خلاف سخت سے سخت قانونی کاروائی کی جائے گی۔

حقوقِ اشاعت محفوظ

نام کتاب	ـــــ	تاریخ آفاتِ عالم
تحقیق وتالیف	ـــــ	اخلاق احمد قادری
اشاعت	ـــــ	2018ء
کمپوزنگ	ـــــ	التمش مبین
ڈیزائن	ـــــ	محمد احسن گل
مارکیٹنگ	ـــــ	عقیل باقر
مطبع	ـــــ	وقاص جاوید پرنٹرز، لاہور
قیمت	ـــــ	-/695 روپے

گھر بیٹھے پاکستان کے کسی بھی کونے میں
اپنی پسندیدہ کتب منگوانے کے لیے ابھی ہم سے رابطہ کریں
کال، میسج، واٹس ایپ کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں 0300-4352745
یا ہمارے پیج کے ان باکس میں میسج کریں
www.facebook.com/booksparadisepakistan

دُعا پبلی کیشنز

الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: 042-37233585
E-mail: duapublications@yahoo.com

DUA PUBLICATIONS

ناشر: زاہد شیخ

خوبصورت اور معیاری کتب شائع کروانے کے لیے رابطہ کریں۔ زاہد شیخ : 0300-9476417

پیش لفظ

آج کل ہم جب کسی نیوز چینل پر خبروں کا ہلٹین دیکھتے ہیں تو ہمیں سونامیوں، زلزلوں، مون سون کے سیلابوں، بگولوں، دیگر طوفانوں اور برڈ فلو جیسے وبائی امراض دنیا میں پھیلنے کی خبریں سنائی دیتی ہیں تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ دنیا دن بدن آفات میں گھرتی جا رہی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ آفات کا گھر ہے آئے دن ہمیں شدید تباہیوں آفات اور مصائب کا سامنا ہے۔ یہ آفات قدرتی بھی ہو سکتی ہیں جیسے وبائی امراض آتش فشانیاں اور ہمہ قسم کے طوفان وغیرہ اور حادثاتی بھی ہو سکتی ہیں جیسے آتش زدگیاں، جہازوں کی غرقابی فضائی اور ٹریفک حادثات اور انسانوں کی خود ساختہ بھی ہو سکتی ہیں جیسے جنگیں قتل عام اور دہشتگردی کے واقعات۔ ہم جب نوع انسانی کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ ایسے ہی بے شمار واقعات کا مرقع نظر آتی ہے۔ اس کتاب کے پہلے ہی باب میں ہم نے آج سے 74000 سال پہلے رونما ہونے والی ایک ایسی آتش فشانی کی داستان بیان کی ہے جو شائد تاریخ عالم کی سب سے بڑی آتش فشانی تھی اس کی ہلاکت آفرینی سے نوع انسانی بمشکل ہی بچی تھی۔ اسی طرح چودھویں صدی عیسوی میں دنیا کے کئی بر اعظموں کو اپنی لپیٹ میں لینے والی ہلاکت خیز وباء ''مرگ سیاہ Black death'' کو بھلا کیسے بھلایا جا سکتا ہے کہ جس نے بر اعظم یورپ و ایشیا کی آبادی کے بڑے حصے کو معدوم کر دیا تھا۔ 19 ویں صدی میں انڈونیشیا میں کراکاٹوا کی آتش فشانی سے پورا کرہ ارض آتش فشاں راکھ کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ 20 ویں صدی کی قدرتی آفات بھی کچھ کم نہیں ہیں مگر اس صدی میں ظالم حکمرانوں، ہٹلر، سٹالن، ماؤزے تنگ اور پول پاٹ جیسے ظالموں نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ماضی کے چنگیز خان اور ہلاکو خان کی یاد کو تازہ کر دیا۔

یہ کتاب ہمیں دنیا میں آنے والی قدیم اور جدید آفات کا احوال یکساں سناتی ہے۔ ان آفات عالم نے لاکھوں انسانوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا، ساتھ ہی یہ ہمیں ان حوصلہ مند اور بہادر انسانوں کی کہانیں بھی سناتی ہے جنہوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے طوفانوں کا سینہ چیر کر دوسرے انسانوں کو موت کے منہ میں جانے سے بچایا۔

ان آفات کو بعض اوقات ان انسانوں کی اس بڑی تعداد کی وجہ سے نام دیا جاتا ہے جو ان آفات کی

زد میں آکر ہلاک ہو گئے ۔یا پھر بعض اوقات ان نقصانات کی وجہ سے نام دیا جاتا ہے جو ان آفات کی وجہ سے انسان کی ملکیتی اثاثوں کو پہنچے مگر یاد رہے آج کے انسان کو جن آفات اور تباہیوں کا سامنا ہے ان میں سب سے زیادہ ہلاکت خیز خود انسان کی خود ساختہ دہشتگردی ہے ۔1972 کی میونخ اولمپک گیمز میں ہونے والی دہشتگردی ہو یا 2001 میں رونما ہونے والی نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی ،1937 میں جاپانی افواج کے ہاتھوں ہونے والا نانکنگ کا قتل عام ہو یا ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کا اجتماعی قتل سبھی انسان کی خود ساختہ تباہیاں ہیں جو اس نے اپنی ہی نوع پر ڈھائیں ۔اسی طرح اگست 1945 میں جاپان پر گرائے جانے والے ایٹم بموں کا زکر ہو یا امریکہ بہادر کے ہاتھوں عراق و افغانستان کی عوام پر توڑے جانے والے مظالم ہوں یا برما کے مسلمانوں کا قتل عام سبھی ہمیں انسانیت کے آفات عالم میں گھرے ہونے کی یاد دلاتے ہیں ۔

اخلاق احمد قادری، 13 اپریل 2018

زکریا ٹاؤن، ملتان

Mob= 03337619827

email: qadriikhlaq@gmail.com

فہرست

- 72000 ق م، تاریخ عالم کی پہلی معلوم آتش فشانی 11
- طوفان نوحؑ 13
- 2500 زم۔1202ء قحط یا خشک سالی مصر 15
- 431 ق م ایتھنز قدیم میں طاعون کی وباء 17
- 64 عیسوی شہر رومہ کی مشہور آتشزدگی 19
- 79 عیسوی پومپی آئی کی آتش فشانی راکھ میں تدفین 21
- 365ء.....سونامی کے ہاتھوں اسکندریہ کی تباہی 23
- 447ء اٹیلا ہن کی خونریزیاں 25
- 526ء انطاکیہ کا تباہ کن زلزلہ 27
- 542ء قسطنطنیہ میں طاعون یا ''سیاہ موت'' 29
- 856ء عیسوی کارنتھ، یونان میں آنے والا زلزلہ 31
- 856ء دامغان، ایران کا تباہ کن زلزلہ 32
- 1138ء حلب، شام میں آنے والا تباہ کن زلزلہ 34
- 1213ء کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرنے والا فاتح 35
- 1383ء امیر تیمور کی ترکتازیاں یا مظالم کے افسانے 37
- 1202ء.....مشرقی بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں کا سب سے بڑا زلزلہ 39
- 1347ء.....یورپ ''سیاہ موت'' کی زد میں 40
- 1520ء.....نئی دنیا میں چیچک کی وباء 46
- 1556ء.....صوبہ شانسی کا زلزلہ 48
- 1600ء پیرو میں کوایریکوپا کی آتش فشانی 50
- 1665ء.....لندن میں ''سیاہ موت'' کی واپسی 52

- 1618ء..... یورپ میں تیس سالہ جنگ کی مصیبتیں 55
- 1640ء..... چین میں مانچو خاندان کی خونریز فتح 57
- 1666ء..... لندن میں رونما ہونے والی تاریخی آتشزدگی 59
- 1692ء..... پورٹ رائل جمیکا کا زلزلہ اور سونامی 62
- 1700ء..... کیسکیڈیا کا زلزلہ 64
- 1703ء..... جزائر برطانیہ میں طوفانِ عظیم 65
- 1775ء..... لزبن میں یورپ کا ب سے بڑا تباہ کن زلزلہ اور سونامی 68
- 1770ء..... بنگال میں قحط 71
- 1780ء..... تباہ کن ہری کین 74
- 1783ء..... آئس لینڈ میں کوہ لیکی کا پھٹنا 76
- 1811-12ء..... نیو میڈرڈ، میسوری کا زلزلہ 78
- 1812ء..... ماسکو کی آگ 80
- 1815ء..... تمبورا کی آتش فشانی 82
- 1840..... ناٹچز، مسسپی کا بگولے دار طوفان 84
- 1850ء..... آئرلینڈ میں آلوؤں کا قحط 86
- 1863ء..... سان ٹیاگو، چلی میں آتشزدگی 88
- 1864ء..... کلکتہ میں سمندری طوفان 89
- 1865ء..... بحری جہاز ''سلطانہ'' کی غرقابی 91
- 1871ء..... شکاگو کی خوفناک آتشزدگی 93
- 1881ء..... ہے فونگ، ویتنام کا سمندری طوفان 96
- 1883ء..... کراکاٹوا کی آتش فشانی 98
- 1887ء..... چین کے دریائے زرد میں سیلاب 101
- 1888ء..... نیویارک برفانی طوفان کی زد میں 104
- 1889ء..... جونز ٹاؤن، پینسلوانیا میں سیلاب بلاخیز 106
- 1891ء..... جاپان میں زلزلہ 108
- 1894-1905ء..... آرمینیائی قتل عام 110

- 1896ء..... برطانوی ہندوستان میں قحط اور خشک سالی 113
- 1896ء..... جاپان پر سونامی کا حملہ 115
- 1897ء..... برطانوی ہندوستان کے صوبے آسام میں زلزلہ 117
- 1899ء..... یاکوٹاٹ، الاسکا میں آنے والا شدید زلزلہ 119
- 1900ء..... گیلیو اسٹون ٹیکساس میں آنے والا ہری کین 121
- 1902ء..... کوہ پیلی کی آتش فشانی 124
- 1903ء..... شکاگو، ایروکوئیس تھیٹر میں ہونے والی آتش زدگی 126
- 1904ء..... امریکی بحری جہاز جنرل سلوکم پر آتش زدگی 129
- 1905ء..... سینٹ پیٹرز برگ، روس کا خونیں انقلاب 131
- 1906ء..... سان فرانسسکو، کیلی فورنیا میں زلزلہ 133
- 1906ء..... کوریئرز، کوئلے کی کان میں دھماکہ 135
- 1907ء..... ونونگاہ کوئلے کی کان میں دھماکہ 137
- 1908ء..... میسینا، سسلی کا ہولناک زلزلہ 139
- 1912ء..... ٹائی ٹینک کے آئس برگ سے ٹکرانے کا المیہ 141
- 1913ء..... اوماہا، نبیراسکا میں بگولے دار طوفان 145
- 1917ء..... ہیلی فیکس، کینیڈا کی بندرگاہ میں دھماکہ 147
- 1918ء..... انفلوائینزا۔ ایک عالمگیر قاتل وباء 149
- 1923ء..... زلزلے کے ہاتھوں ٹوکیوں کی تباہی 153
- 1925..... ٹرائی اسٹیٹ ٹورنیڈو 155
- 1926..... فلوریڈا ہری کین 157
- 1928ء جوزف سٹالن کے مظالم 159
- 1929ء..... وال اسٹریٹ نیویارک کا مالیاتی دھماکہ 161
- 1932ء..... یوکرین میں آفت ناگہانی 163
- 1934..... برطانوی ہند کے صوبہ بہار میں زلزلہ 166
- 1934-1945 یہودیوں پر ایڈولف ہٹلر کے مظالم کا طوفان 168
- 1935ء..... کوئٹہ کا تباہ کن زلزلہ 172

- 1937ء: نانکنگ کا قتل عام — 175
- 1939-45 جنگ عظیم دوم کے مصائب — 179
- 1944 سان جوآن، ارجنٹینا، میں قیامت خیز زلزلہ — 183
- 1944ء لیک لیننڈ، اوہیو میں قدرتی گیس کا دھماکہ — 184
- 1945ء ہیروشیما پر ایٹم بم کا گرایا جانا — 187
- 1947ء ٹیکساس سٹی میں دھماکہ — 190
- 1947 تقسیم ہند کے فسادات و ہنگامے — 193
- 1952ء لندن میں قاتل دھند — 197
- 1953ء ہالینڈ شدید سیلاب کی زد میں — 199
- 1957ء تھسیلیڈومیڈ، ڈرگ ٹریجیڈی — 202
- 1959ء جاپان ہائفون، وشیش ویرا کی زد میں — 204
- 1958ء ماؤزے تنگ، کمیونسٹ دنیا کا دوسرا سٹالن — 207
- 1960ء چلی میں آنے والا ہولناک زلزلہ — 210
- 1960ء نیویارک شہر پر ہونے والا فضائی تصادم — 212
- 1963ء اٹلی میں وایونٹ ڈیم کی تباہی — 215
- 1966ء ایبرفان، ساؤتھ ویلز کا سانحہ — 218
- 1970ء پیرو کا ہولناک زلزلہ — 220
- 1970ء مشرقی پاکستان میں ہولناک سمندری طوفان — 222
- 1971ء عراق میں پارے سے ہونے والی زہر خورانی — 224
- 1972ء میونخ اولمپک ویلج میں ہونے والی دہشت گردی — 227
- 1973ء آئس لینڈ میں آتش فشانی — 230
- 1974ء برسبین، آسٹریلیا میں آنیوالا سیلاب — 232
- 1976ء پول پاٹ حکومت کے مظالم — 234
- 1976ء اٹلی کے قصبے سیوسو میں زہریلی گیس کا پھیلاؤ — 236
- 1976ء بیسویں صدی کا بدترین زلزلہ — 239
- 1977ء دنیا کا بدترین فضائی حادثہ جو روئے زمین پر رونما ہوا — 242

- 1978ء..... لو کینال، نیویارک کی تابکاری سے آلودگی 245
- 1979ء..... امریکہ کی تاریخ کا بدترین، ایٹمی حادثہ 247
- 1982ء..... افغانستان میں سرنگ کا حادثہ 249
- 1982ء..... کینیڈا میں آئل پلیٹ فارم کی غرقابی 251
- 1984-86ء..... جھیل نیوس کا اسرار 253
- 1984ء..... بھوپال زہریلی گیس کی لپیٹ میں 256
- 1985ء..... سب سے زیادہ شرح اموات والا فضائی حادثہ 258
- 1985ء..... فضائی دہشت گردی جو 331 کی جان لے گئی 260
- 1986ء..... خلائی شٹل، چیلنجر کی تباہی 262
- 1986ء..... چرنوبائیل، یوکرین کا نیوکلیئر حادثہ 264
- 1988ء..... آرمینیا میں آنے والا ہولناک زلزلہ 267
- 1989ء..... تیانن مین اسکوائر کا قتل عام 269
- 1989ء..... الاسکا کے ساحل کی تیل سے آلودگی 272
- 1990ء..... حج کے موقع پر بھگدڑ مچنے کی وجہ سے ہلاکتیں 274
- 1991ء..... اور خلیج فارس تیل کا جہنم زار بن گیا 276
- 1992ء..... ہری کین، اینڈریو سے فلوریڈا میں ہونے والی تباہی 279
- 1991ء..... فلپائن میں ہونے والی بیسویں صدی کی دوسری بڑی آتش فشانی 281
- 1994ء..... روانڈا میں ہونے والی گردوہی نسل کشی 283
- 1995ء..... کوبے، جاپان میں آنے والا ہولناک زلزلہ 286
- 1995ء..... اوکلاہاما میں ہونے والی دہشت گردی 288
- 1995ء..... زمین دوز ریلوے کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ 290
- 1995ء..... بوسینیا ہرزیگووینا میں مسلمانوں کی نسل کشی 291
- 1997ء..... کینیڈا کے دریائے سرخ میں سیلاب 295
- 1998ء..... وسطی امریکہ میں ہری کین مچ سے تباہی 297
- 1999ء..... ہری کین فلائیڈ 299

- 2000ء..... روسی ایٹمی آبدوز کی غرقابی 301
- 2001ء..... نیویارک پر دوسرا بڑا دہشت گردانہ حملہ 303
- 2004ء سماٹرا، انڈونیشیا میں آنے والا زلزلہ اور سونامی 305
- 2005ء..... ہری کین کیٹرینہ 308
- 2005ء..... پاکستان میں آنے والا تباہ کن زلزلہ 310
- 2006ء..... تائیوان میں آنے والا شدید زلزلہ 312
- 2007ء.....گرین برگ، کنساس امریکہ میں آنے والا ٹورنیڈو 314
- 2008ء..... کے ٹو، کا حادثہ 316
- 2009ء.....اٹلی میں لاقیلا کا ہولناک زلزلہ 318
- 2010ء..... پاکستان میں آنے والے قیامت خیز سیلاب 320
- 2011ء.....کرائسٹ چرچ نیوزی لینڈ میں آنے والا تباہ کن زلزلہ 323
- 2011-12ء.....مشرقی افریقہ میں خشک سالی اور قحط 325
- 2012ء.....چین کے دارالحکومت بیجنگ میں سیلاب 327
- 2012ء.....جنوبی بھارت سائیکلون نیلم کی زد میں 328
- 2013ء.....فلپائن میں ٹائفون ہے یان 329
- 2014ء..... بدخشاں میں مٹی کے تودے گرنے سے ہلاکتیں 331
- 2015ء.....کراچی میں گرمی کی شدید لہر 333
- 2015ء..... حج کے موقع پر دو شدید سانحات 335
- 2015ء..... نیپال میں آنے والا بدترین تاریخی زلزلہ 337
- 2015ء.....فرانس کا نائن الیون 339
- 2016ء..... ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں برف کا طوفان 342
- کتابیات و ویب سائٹس 344

72000 ق م، تاریخ عالم کی پہلی معلوم آتش فشانی

تاریخ عالم کا اولین معلوم سانحہ جو دنیا میں پیش آیا اور جو اس حد تک بڑا سانحہ تھا کہ اس کی وجہ سے نوع انسانی کے معدوم ہوجانے کا خطرہ درپیش آ گیا تھا۔ یہ سانحہ مؤرخین کے مطابق 74000 سال پہلے انڈونیشیا کے جزیرے سماٹرا میں اس مقام پر پیش آیا تھا جہاں آج کل جھیل طوبیٰ Lake Toba واقع ہے۔ اس سانحہ کے متعلق قائم کیے جانے والے حالیہ مفروضوں کے مطابق اس سانحہ کی وجہ سے اس زمانے میں زمین کی آبادی 20 لاکھ سے کم ہو کر صرف 10000 انسانوں تک محدود ہوگئی تھی۔ یہ آتش فشانی تاریخ عالم کی سب سے اولین بڑی معلوم آتش فشانی تھی ۔ یہ 1815ء میں ہونے والی جوالا مکھی تمبورا Tambora کی آتش فشانی سے آٹھ گنا زیادہ بڑی تھی۔ آتش فشانی کے ماہرین کے مطابق یہ آتش فشانی کم از کم دس دن تک جاری رہی تھی ۔ تاہم جیسا کہ جدید زمانے میں ہونے والی آتش فشانیوں کے نتائج سے ظاہر ہے ۔کسی آتش فشاں کی آتش فشانی اتنی خطرناک نہیں ہوتی جتنی اس آتش فشانی کے نتیجے میں پھیلنے والی آتش فشاں راکھ ہوتی ہے۔ یہ راکھ فضاء میں پھیل کر موسموں پر برے نتائج مرتب کرتی ہے ۔آج کل ہمیں بڑھتی ہوئی Global Warming کا سامنا ہے۔مگر طوبیٰ کی آتش فشانی کے نتیجے میں Global Cooling بڑھ گئی تھی۔ اس آتش فشانی کے نتیجے میں 670 کیوبک راکھ اس جوالا مکھی سے خارج ہوئی تھی جس نے زمین کے بڑے حصے پر پھیل کر سورج کی شعاعوں کو روک لیا تھا اور زمین کے اس بڑے حصے پر تاریکی پھیل گئی تھی جو درجہ حرارت کے منفی ہوجانے کا باعث بنی تھی ۔ یہ تاریکی اور سردی کی لہر زمین پر اگلے چھ سال تک جاری رہی ۔ کرہ ارض پر اسی آتش فشانی کی وجہ سے تیزابی بارشیں ہوئیں جن کے بعد زمین پر آخری برفانی دور کے شروع ہوجانے کی وجہ سے بہت سے پودے ،جاندار اور ہمارے آباؤ اجداد میں سے بہت سے انسان مارے گئے۔ اس آتش فشانی کا اندازہ ہمیں اس بات سے ہوتا ہے کہ جدید زمانے میں وسطی ہندوستان میں ہونے والی اثریاتی کھدائیوں سے ایک مقام پر تقریباً 20 فٹ موٹی آتش فشانی راکھ کی تہہ دریافت ہوئی جو طوبی کی آتش فشانی سے تعلق رکھتی ہے ۔ جبکہ جزیرہ نما ملائشیا کے بہت سے حصوں میں یہ راکھ کی تہہ 30 فٹ موٹی جمی ہوئی ملی ہے۔ آج کی جھیل طوبیٰ سماٹرا کے وسط میں ایک رخنہ دار خط پر واقع ہے۔ یہ زمین کی پرت پر ایک کمزور مقام

ہے۔ جزائر انڈونیشیا خود بھی زمین پر سب سے زیادہ آتش فشانی کے سرگرم علاقے تصور کیے جاتے ہیں۔
جھیل طوبیٰ اپنے طول وعرض میں 18 میل کشادہ اور 60 میل طویل ہے جبکہ چند مقامات پر اس کی گہرائی 5000 فٹ تک پہنچتی ہے۔ اس جھیل کا یہ طول وعرض خود اس دنیا کی سب سے بڑی آتش فشانی کی علامت ہے۔ اس سے بڑی آتش فشانی کرہ زمین پر کہیں اور نہیں ہوئی۔ 74000 سال پہلے اس جھیل کی جگہ ایک بڑا جوالا مکھی واقع تھا جو آتش فشانی کے بعد اس جھیل میں بدل گیا۔

ماہرین جینیات Genetics کا خیال ہے کہ طوبیٰ کی آتش فشانی نے نوع انسانی پر 74000 سال پہلے تباہ کن اثرات مرتب کیے تھے۔ 20 لاکھ سے زائد (زمین کی) انسانی آبادی کو چند ہزار انسانوں کی حد تک محدود کردیا تھا جس کی وجہ سے نوع انسانی معدومیت کی حدوں کو چھونے لگی تھی اور ہوموسپین HomoSapiens معدوم ہوتی ہوئی انواع زندگی میں شامل ہوگئے تھے۔ طوبیٰ کی آتش فشانی کے زمانے میں نوع انسانی میں تباہ کن حد تک ہونے والی کمی کا سراغ انسانی تولیدی خلیوں میں پائے جانے والے جسیمہ کے تجزیہ Analysis of Mitochondrial (DNA) سے لگایا گیا ہے۔ یہ جسیمہ اپنے اندر پائے جانے والے تنفس اور توانائی کی پیدائش کے لیے وقف خامروں کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ طوبیٰ کی آتش فشانی کے بعد کے زمانے میں صرف 10 ہزار انسانوں کے زندہ بچ جانے کا پتہ چلا ہے۔ طوبہ کی آتش فشانی کے واقعہ کے تقریباً 20 ہزار سال بعد 50000 ق م بھی کہیں جا کر نوع انسانی میں دوبارہ اضافہ کا ثبوت ملا ہے۔ ماہرین جینیات نے چمپینزی بندر کی نوع کے تولیدی خلیوں میں پائے جانے والے جسیموں کے تجزیہ سے یہ سراغ بھی لگایا ہے کہ اس نوع زندگی پر بھی طوبہ کی آتش فشانی کے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے تھے اور یہ نوع زندگی بھی معدومیت کی حد تک پہنچ گئی تھی۔

طوفان نوحؑ

حضرت نوح علیہ السلام جب اپنی عمر شریف کے 600ویں سال کو پہنچے تو اس سال کے دوسرے مہینے کے 17ویں دن زمین پر موجود تمام پانی کے سوتے پھوٹ پڑے اور آسمان کی کھڑکیاں کھول دیں گئیں۔ اور 40دن اور 40رات تک زمین پر مسلسل بارش ہوتی رہی۔ زمین کو پانی کے ایک بڑے طوفان نے گھیر لیا۔ طوفان کا پانی بائبل کے مطابق اگلے 110دن تک مسلسل چڑھتا رہا۔ پھر اس کے بعد اگلے 74دن تک پانی گھٹتا رہا جس کے 40دن بعد حضرت نوح علیہ السلام نے کوے کو بھیجا۔ اس کے سات دن بعد کبوتری کو بھیجا۔ سات دن ٹھہر کر پھر اسی کبوتری کو بھیجا۔ پھر اس کے 29ویں دن بعد حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی کی چھت کو کھولا۔ اس کے 57دن بعد بالآخر زمین بالکل خشک ہوگئی۔ یوں یہ طوفان 371دن تک جاری وساری رہا۔ (قاموس الکتاب صفحہ 614)

قرآن کریم کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے صاحب شریعت پیغمبر (رسول) تھے اور ان پانچ پیغمبروں میں سے ایک تھے جن سے خصوصی عہد ومیثاق ہوئے تھے۔ (القرآن) حضرت نوح علیہ السلام نے 1000 سال عمر پائی تھی اور آپ علیہ السلام ایک طویل عرصے تک اپنی قوم کو تبلیغ کرتے رہے تھے مگر ان کی تبلیغ کے نتیجے میں ان کی قوم کے معدودے چند افراد ان پر ایمان لائے تھے۔ ان کی تبلیغ کا ان کی قوم پر الٹا اثر ہوا تھا اور وہ ان کو تکلیف پہنچانے پر کمربستہ ہوگئی تھی۔ اپنی قوم کی اس حالت سے مایوس ہوکر حضرت نوح علیہ السلام نے دعا مانگی کہ:

''اے پروردگار کسی کافر کو روئے زمین پر آباد نہ رہنے دے۔''

آپ علیہ السلام کی اسی دعا کے نتیجے میں زمین پر طوفان نوح بھیجا گیا تھا۔

ایک عظیم طوفان کی وعید کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ایک کشتی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم کی تعمیل میں حضرت نوح علیہ السلام نے ایک کشتی تعمیر کی۔ جب اس کشتی کو تعمیر کر رہے تھے تو آپ علیہ السلام کی قوم کے شر پسندوں نے آپ علیہ السلام پر آوارہ کتے چھوڑ دیے اور آپ علیہ السلام کو ہر طرح سے تنگ کیا۔ پھر جب اس کشتی کی تعمیر کے بعد حضرت نوح علیہ السلام اپنی کشتی پر ہر جاندار شے کا ایک جوڑا سوار کر چکے تو زمین پر پانی کے سوتے پھوٹ پڑے اور طوفان کی آمد کے نشان کے طور پر ایک تنور سے پانی ابلنے لگا۔ اسرائیلی روایات کے مطابق یہ طوفان 371دن تک جاری رہا۔

توریت کے مطابق پھر خدا نے حضرت نوح علیہ السلام کو جو کشتی میں تھے یاد کیا اور پانی کو (بڑھنے سے) روک دیا اور پانی بتدریج کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ان کی کشتی ارارط کے پہاڑوں پر ٹک گئی۔ یہ

اندازہ لگانے کے لیے کہ کشتی سے اترنے میں کوئی خطرہ تو نہیں آپ علیہ السلام نے پہلے ایک کوے کو بھیجا مگر وہ واپس لوٹ کر نہیں آیا۔ غالباً وہ مردار کھانے لگا اور اس نے کشتی کی چھت پر بسیرا کرلیا۔ اس پرندے کے بعد آپ علیہ السلام نے ایک کبوتری کو خبر لینے کے لیے بھیجا جو دوسری مرتبہ اڑنے کے بعد اپنی چونچ میں زیتون کی ایک شاخ لے ائی جو اس بات کی علامت تھی کہ پانی پہاڑوں کے دامن تک اترچکا ہے۔ جہاں زیتون کے یہ درخت اگتے ہیں اور جانوروں کے لیے کافی خوراک موجود ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے تیسری مرتبہ پھر اسی کبوتری کو بھیجا مگر اس مرتبہ وہ کبوتری بھی واپس نہ آئی۔ اس پر حضرت نوح علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ سطح زمین مکمل طور پر خشک ہوچکی ہے۔ خدا نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی سے اترنے کا حکم دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی سے اترنے کے بعد سب سے پہلے خدا کے حضور میں پاک جانوروں کی قربانی چڑھائی اور خدا نے قسم کھائی کہ وہ اب روئے زمین پر کبھی اس قسم کا طوفان نہیں بھیجے گا۔ (یسعیاہ)

جنوبی میسو پوٹیمیا میں اثریاتی کھدائی کے دوران ایک شدید طوفان کے آثار ملے ہیں۔ اس اثریاتی کھدائی کے ذمہ دار سرلیو نارڈ وولے Sir Leonard Wooley کے مطابق اس طوفان کی شہادتوں کا تعلق بائبل میں ذکر کیے طوفان سے ہے۔ اسی طرح 2000ء میں مشہور اوشیانوگرافر Oceanographer رابرٹ بیلا رڈ Robert Ballard نے بحر اسود Black Sea کی تہہ میں طوفان نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی کے بقایا جات کو کھوجنے کا اعلان کیا تھا۔ رابرٹ بیلارڈ اور اس کی ٹیم کو یقین تھا کہ انہوں نے ایک عظیم غرقابی کی شہادتیں تلاش کرلیں ہیں۔ تاہم وہ کسی کشتی یا بحری جہاز کو ڈھونڈنے میں ناکام رہے تھے۔ اگرچہ بائبل کے مطابق کشتی نوح علیہ السلام کوہ اراراط پر لنگر انداز ہوئی تھی اور وہیں چھوڑ دی گئی تھی۔ مگر بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ کوہ اراراط کی چوٹی ہی ہو۔ 1829ء میں اس پہاڑ کی چوٹی سر کیے جانے کے بعد سے اکثر کوہ پیما اس پہاڑ پر کشتی نوح علیہ السلام کا سراغ لگانے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ 1955ء میں ایک فرانسیسی کوہ پیما نے 14000 فٹ کی بلندی پر لکڑی کے کچھ ٹکڑے دریافت کیے تھے اور دعویٰ کیا تھا کہ اس نے کشتی نوح علیہ السلام کو ڈھونڈھ نکالا ہے، مگر اس لکڑی کے کاربن تجزیے کے بعد اس کا یہ دعویٰ سچ ثابت نہیں ہوسکا تھا۔ وہ لکڑی کے ٹکڑے صرف 1300 سال پرانے تھے۔ 1990ء کی دہائی میں ایک خلائی سیارے سے لی گئی اس علاقے کی تصویر میں ایک کشتی نما چیز دکھائی دی تھی جو برف میں دھنسی ہوئی تھی۔ 1988ء میں ایک امریکی ماہر اثریات نے بھی کہا تھا کہ یہ کشتی نوح علیہ السلام ہی ہے۔ تاہم 1996ء میں ایک امریکی پروفیسر نے ثابت کیا کہ جسے کشتی نوح علیہ السلام سمجھا جارہا ہے وہ ایک کشتی نما چٹان ہے۔

2500زم۔1202ء قحط یا خشک سالی مصر

یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے مطابق مصر دریائے نیل کا تحفہ ہے۔ ہیروڈوٹس آگے چل کر لکھتا ہے کہ اگر دریائے نیل نہ ہوتا تو یہ ملک ضرور صحرا ہوتا۔ عام طور پر دریائے نیل سالانہ طور پر جون کے مہینے میں چڑھنا شروع ہوتا ہے اور ستمبر تک اس میں اونچے درجے کا سیلاب رہتا ہے۔ جب دریا کا پانی اترتا ہے تو سیلابی زمینوں پر زرخیز تلچھٹ چھوڑ جاتا ہے جو اس ملک کی زراعت کے لیے بڑی سودمند شے ہے۔ تاہم دریائے نیل میں اگر سیلاب 35فٹ سے زیادہ بلند ہوجاتا ہے تو بہت سے دیہات زیرآب آجاتے ہیں اور بہت سے لوگ ڈوب جاتے ہیں اور اگر یہ سیلاب 28فٹ سے نچلے درجے کا ہوتو زرخیز تلچھٹ کی بہت پتلی سی تہہ زمین پر جمتی ہے جو زراعت کے لیے بہت کم مفید ہوتی ہے جس کے نتیجے میں زرعی پیداوار میں کمی ہوجانے کی وجہ سے ملک میں خوراک کی کمی ہوجاتی ہے اور اگر یہ عمل مسلسل دو سال تک رہے تو انتہائی خطرناک صورتحال سامنے آتی ہے۔ ملک میں قحط سالی کا دور دورہ ہوجاتا ہے۔ یاد رہے کہ دریائے نیل میں آنے والا ہر پانچواں سیلاب یا تو اونچے درجے کا ہوتا ہے یا پھر نچلے درجے کا ہوتا ہے۔

مصر میں ملنے والے ایک پتھر پر اس ملک میں 2500ق م میں آنے والے ایک قحط کا حال درج ملا ہے۔ یہ قحط مسلسل سات سال تک رہا تھا جس کی وجہ ہر شخص کی زندگی دشوار ہوگئی تھی۔ الہامی کتب توریت اور قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں پڑنے والے ایک سات سالہ طویل قحط سالی کا ذکر ملتا ہے۔ مؤرخین کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام کا زمانہ 1800ق م تھا۔ جن دنوں حضرت یوسف علیہ السلام اپنے آقا فوطیفار کی بیوی کے دست درازی کے غلط الزام میں قید میں تھے تو انہیں خدا کی طرف سے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھی قیدیوں میں فرعون کے دو خادم بھی شامل تھے جن میں سے ایک فرعون کا ساقی اور دوسرا/نان پز تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کے خوابوں کی تعبیر بیان کی تھی جس میں انہیں بتایا تھا کہ صرف تین دن بعد نان پز کو فرعون کے جنم دن پر پھانسی دے دی جائے گی جبکہ ساقی کو اس کے عہدہ پر بحال کردیا جائے گا۔ جب یہ ساقی بحال ہوگیا تو انہیں دنوں فرعون مصر نے دو خواب دیکھے۔ ایک دبلی اور موٹی گائیوں کا اور دوسرا ہری بھری اور سوکھی گندم کی بالیوں کا۔ جب فرعون کے ان خوابوں کی کوئی معبر تعبیر بیان نہ کرسکا تو ساقی نے اس سلسلے میں حضرت

یوسف علیہ السلام کا ذکر کیا۔ جب فرعون نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلوایا تو آپ علیہ السلام نے بتا
کہ بادشاہ کے دونوں خوابوں کی تعبیر ایک ہی ہے۔ سات سالوں تک خوب اناج پیدا ہوگا جبکہ اس کے
بعد کے سات سالوں میں قحط سالی رہے گی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ساتھ ہی فرعون کو مشورہ دیا کہ
اگر ارزانی کے سالوں میں غلہ جمع کرلیا جائے تو قحط کے دن آسانی سے گزر جائیں گے جس پر فرعون نے
حضرت یوسف علیہ السلام کو ذخیرہ خانوں کا حاکم مقرر کردیا اور یوں حضرت یوسف علیہ السلام کی منصوبہ
بندی سے مصر میں قحط سالی کے سارے سال اچھے گزرے۔ مگر یہ خشک سالی مصر میں بعد کے زمانوں میں
بھی آتی رہی ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں بھی دریائے نیل کا پانی نیچے اتر گیا تھا مگر آپؓ کے
بھیجے ہوئے دریائے نیل کے نام ایک خط کی وجہ سے دریائے نیل کا پانی بحال ہوگیا اور یوں قحط سالی کا
خطرہ ٹل گیا۔ 967 عیسوی میں نیل کا پانی ایک مرتبہ پھر نیچے اتر گیا تھا جس کی وجہ سے مصر دو سالہ قحط سالی
کا شکار ہوگیا اور تقریباً 6 لاکھ افراد مارے گئے۔ 1064ء سے 1071ء کے دوران ایک شدید قحط سالی کا
سامنا کرنا پڑا تھا جس کے دوران خواتین نے اپنے قیمتی ہیرے جواہرات کے عوض خوراک خرید کر گزارا
کرنا چاہا تھا مگر جب ان قیمتی اشیاء کے عوض بھی خوراک میسر نہ آئی تو انہیں دریا برد کردیا گیا تھا۔

تاہم مصر کی تاریخ کا سب سے شدید قحط تیرھویں صدی کے آغاز میں پڑا تھا۔ بغدادی مورخ
عبداللطیف نے لکھا تھا کہ گزشتہ چھ سو سال میں دریائے نیل چھ مرتبہ 24 فٹ بلندی تک پہنچنے میں ناکام
رہا تھا مگر 1200ء میں یہ بلندی 23 فٹ رہ گئی تھی جس کی وجہ سے اسی سال اپریل میں قحط پڑ گیا اور دریا
میں سیلاب نہ آنے کی وجہ سے اشیائے خورد کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ خشک سالی کی وجہ
سے لوگوں نے دیہات چھوڑ کر شہروں کا رخ کیا جہاں قحط سالی کی وجہ سے لوگوں کا اخلاق اتنا پست ہوگیا
تھا کہ غرباء مردار لاشیں اور کتے تک کھانے پر مجبور ہوگئے۔ مایوسی مزید بڑھی تو لوگ آدم خوری پر اتر آئے
اور لوگ اپنے بچوں کو بھون کر کھانے لگے۔ عبداللطیف لکھتا ہے کہ اس نے خود ایسے والدین کو دیکھا جو
اپنے بچے کو بھون کر کھا رہے تھے جس کی سزا کے طور پر انہیں زندہ آگ میں ڈالا گیا، مگر لوگوں کے
گھروں میں انسانی ہڈیوں کے ذخیرے پائے گئے۔ دیہاتوں میں لٹیروں کے ایسے طائفے عام گھومتے تھے
جو ہر شے کو کھا جاتے تھے۔ ان لوگوں نے قبروں کو لاشوں سے خالی کردیا۔ نوجوان لڑکیوں کو کوڑیوں کے
مول بیچ دیا جاتا تھا اور والدین اپنی بیٹیوں کو بیچ کر دو وقت کا کھانا کھا لیتے تھے۔

431ق م ایتھنز قدیم میں طاعون کی وباء

431ق م میں ایتھنز کو فارقلیس Pericles نے ایک ایسی شہنشاہی بنادیا تھا جس کا نظام حکومت جمہوریت تھا۔ اس کے شہر نفیس اور نادر تھے اور باہم سمندری راستے سے مربوط تھے۔ تاہم ان دنوں یہ بڑی مملکت اپنی ہمسایہ ریاست سپارٹا کے ساتھ جنگ میں ملوث تھی ۔ ان قدیم ریاستوں کے درمیان لڑی جانے والی یہ طویل جنگ، جنگ پیلو پونیسز Peloponnese کہلاتی ہے جہاں ایتھنز کے پاس ایک مضبوط بحریہ تھی ۔وہیں سپارٹا کی بہت سی بڑی بڑی بری افواج تھیں جنہیں اہل ایتھنز ناقابل شکست سمجھتے تھے ۔ اسی وجہ اہل ایتھنز نے اپنے شہروں کی فصیلوں کے اندر بیٹھ کر اہل سپارٹا کا مقابلہ کرنے کی پالیسی ترتیب دی اور دشمن کو ریاست اٹیکا کے مضافاتی علاقوں پر قبضہ کرنے دیا۔اہل سپارٹا نے ان حالات میں اہل ایتھنز کی خوراک کی سپلائی کو معطل کرکے رکھ دیا۔

شہر بند ہونے کی حکمت عملی اختیار کرنے سے اہل ایتھنز کو یہ فائدہ پہنچا کہ میدان جنگ کی نسبت ان کے ہاں اموات بہت کم ہوئیں۔ تاہم جب جنگ پیلو پونیز کا اگلا جنگی مہماتی سیزن موسم بہار 430ق م میں شروع ہوا تو ایک بار پھر ایتھنز یوں نے اپنے شہروں کی فصیلوں کے پیچھے پناہ لی جس کی وجہ سے گھروں میں باسیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ۔مہاجرین نے شہروں کے کونے کونے میں گندی جھگیاں بنا ڈالیں۔ اپنے وقت پر اہل سپارٹا نے حملہ کیا اور اٹیکا کے دیہی علاقوں کو تاخت وتاراج کردیا۔

اسی دوران جب شہروں میں حفظان صحت کے اصولوں کا فقدان دیکھنے میں آیا تو اٹیکا کے شہروں میں عجیب وغریب بیماریاں پھیلنا شروع ہوگئیں۔ اٹیکا کے شہری جواب تک انتہائی صحت مند تھے اب شدید سردرد، خارش اور آنکھوں کی سرخی کا شکار ہوگئے۔ ان کے گلوں اور زبانوں سے خون بہنے لگا اور سانس لینے میں دشواری پیش آنے لگی اور ناخوشگوار بو آنے لگی۔ اگلے مرحلے پر انہیں شدید کھانسی نے آگھیرا اور ساتھ ہی تکلیف دہ طور پر متلی وقے ہونے لگی۔ ان کے جسموں پر پھنسیوں اور زخموں کے نشان ابھرنے لگے ۔ یہ زخم اور پھنسیاں اگر باریک ترین کپڑے سے بھی ڈھانپے جاتے تو مریض تڑپنے لگتا ۔لہٰذا ان کو کھلا چھوڑنا لازم ہوگیا ۔ ان مریضوں کو چھوا جاتا تو ان میں حرارت کا ذرہ بھی محسوس نہ ہوتا۔ یہ سب اذیت ناک پیاس میں مبتلا تھے اور ہمہ وقت ٹھنڈے پانی کو ترستے رہتے تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے

خود کو کنوؤں میں گرالیا۔ تاہم جتنا پانی بھی وہ پی لیتے ان کی پیاس کسی صورت نہ بجھتی تھی۔

مورخ تھیوسی ڈیڈیز کے مطابق یہ وبائی مرض پہلے پہل ایتھوپیا میں پھیلا تھا اس کے بعد مصر اور لیبیا کے لوگ اس کا شکار ہوئے تھے۔ پھر یہ ایتھنز کی بندر گاہ پائریئس Pireaus میں پھیلا جہاں مضافاتی دیہاتوں کی تباہی کے بعد ایتھنز کے لوگوں کے لیے خوراک اترتی تھی۔ اس کے بعد یہ وبا جنگل کی آگ کی طرح ایتھنز کے رش زدہ شہروں میں پھیل گئی۔ مورخ تھیوسی ڈیڈیز خود بھی اس مرض کا شکار ہوا تھا۔ اگرچہ وہ خود رو بصحت ہوگیا، مگر اس کے مطابق اس مرض کے شکار لوگ 9 دنوں کے اندر اندر موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔ جو زندہ بچ جاتے وہ اپنے ہاتھوں یا پاؤں کی انگلیاں، انگوٹھے اور اعضاء تولید وتناسل کھو بیٹھتے تھے۔ کچھ بینائی سے محروم ہوجاتے اور کچھ اپنی یادداشت کھو بیٹھتے تھے اور اپنے دوستوں اور قریبی عزیزوں اور خود کو بھی بھول جاتے تھے۔ بہت سی لاشیں شہر کی گلیوں میں دفن ہونے سے رہ جاتی تھیں، مگر پرندے اور دیگر جاندار بھی ان لاشوں کو نہیں کھاتے تھے جو جاندار غلطی سے ایسا کر بیٹھتے وہ خود اس وبا کا شکار ہوکر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔

جو طبیب ان وباء زدہ مریضوں کا علاج کرتے یا جو لوگ ان مریضوں کے لیے تیمارداری کے فرائض انجام دیتے وہ خود جلد ہی اس وباء کا شکار ہوجاتے تھے۔ اسی وجہ سے بہت سے بیمار علاج اور تیمارداری سے محروم رہ جاتے تھے۔ وباء کے پھیلنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ابھی طب نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ اس بیماری کا علاج ہوسکتا یا دوسرے لفظوں میں ابھی کوئی موثر دوا ایجاد یا دریافت نہیں ہوئی تھی جو اس وبائی مرض کی روک تھام کرسکتی۔ جو لوگ جنگی وجوہات کی بناء پر دیہاتوں سے شہروں میں منتقل ہوئے تھے وہ مکھیوں کی طرح مارے گئے۔ چونکہ ان کے رہنے کے لیے جگہ بہت کم تھی اور وہ کھلی فضاء میں سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔ اسی لیے اکثر ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے ہی مرگئے بلکہ اکثر لاشوں پر لاشیں ایک دوسرے پر پڑی ہوئی پائی گئیں۔

مورخین کے مطابق یہ مغرب میں پھیلنے والا پہلا گلٹی والا طاعون تھا۔ اس طاعون سے ایتھنز کی آبادی کا تیسرا حصہ تباہ ہوگیا جس کا مطلب مورخین نے تقریباً 100000 افراد کی موت بتایا ہے۔ جتنے لوگ 30 سالہ جنگ پیلوپونیز میں نہیں مارے گئے تھے۔ اس سے زیادہ اس وباء کا شکار ہوگئے تھے۔

64 عیسوی شہر رومہ کی مشہور آتشزدگی

شہر رومہ میں پہلی صدی عیسوی میں آتشزدگی ایک عام سی بات تھی لیکن 64 عیسوی میں 10 جولائی کی رات کے وقت رومہ میں جو قیامت خیز آگ لگی ۔ایسی تاریخ عالم میں پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی ۔ اس آتشزدگی کا آغاز بڑے دنگل Circus Maximus کے جنوب مشرقی سرے پر واقع دکانوں سے ہوا جن میں آتش گیر سامان بھرا ہوا تھا۔ یہ رومہ کا وہ نشیب یا گلی تھی جس کے ایک طرف کلیوس پہاڑی کے مغربی اور دوسری طرف پلاٹین Platin پہاڑی کے جنوبی کنارے تھے۔ یہاں سے ہوا کے جھونکوں نے آگ کے شعلوں کو دنگل کی چوبی چھت اور لکڑی کے فرنیچر تک پہنچا دیا اور پھر سیل رواں کی طرح آگ پلاٹین ،ولیا اور اسکوی لین Escovylan میں پھیل گئی جہاں سے مسیناس کے باغ تک پہنچ کر اس کا زور ٹوٹا، لیکن دوسری طرف بھی وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس کے شدت اختیار کرنے پر اون ٹین چوک بواری اور ولابرم کی بہت سی عمارتیں جل کر خاکستر بن گئیں۔ یہ بلائے بدسات رات اور چھ دن تک مسلسل بھڑکتی رہی اور اس وقت جب سب یہ سمجھ رہے تھے کہ آگ بجھ چکی ہے وہ پھر مارتیوس چھاؤنی میں بھڑک اٹھی اور امی لیوسی باغ کی عمارتوں کو تاراج کرتی چلی گئی۔ یہ باغ تی جلی نوس نامی رومی امیر کی ملکیت تھا یوں کیپی ٹول Capitol اور کوٹری فال کی پہاڑیوں کے دامن تک پہنچ گئی۔ غرض مورخین کے مطابق اس آتشزدگی میں رومہ شہر کے چودہ محلوں میں سات محلے مکمل طور پر اور چار جزوی طور پر جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے ۔مورخین کے مطابق اس آتشزدگی سے رومہ کو شدید ترین نقصانات پہنچے تھے۔ رومہ کی سرکاری عمارتوں میں سے مندرجہ ذیل عمارتیں نذر آتش ہوگئیں ۔عطارد، الحافظ، Jupiter Stator کا مندر جسے رومیولس نے بنایا تھا۔ شاہ نیوما کی کچہری Regia اور مقدس آتش کدہ ،اون ٹین پر ڈیانہ دیوی کا مندر جس کا شاہ سرویوس نے افتتاح کیا تھا، وہ بڑی قربان گاہ جس کی بنیاد کو افسانوں میں ''اواندر'' سے منسوب کیا جاتا تھا اور یہ سب عمارتیں رومہ کے قدیم بادشاہوں کے عہد کے آثار اور یادگاریں تھیں۔ تاہم کارآمد ہونے کے لحاظ سے زیادہ شدید نقصان ان شاندار عمارتوں کی تباہی سے ہوا جو آگسٹس نے پلاٹین پہاڑی کے اوپر تعمیر کرائیں تھیں یعنی اپولو دیوتا کا مندر اور محل نیز مارتیوس کی چھاؤنی میں فلامینوس کے دنگل یا چکر کی نئی عمارتوں کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ان کے علاوہ یونان کے نامور سنگ تراشوں کی صناعی کے

بہت سے شاہکار کہ دنیا کی کوئی دولت ان کی جگہ نہیں لے سکتی، رومہ کی اس آگ کی نذر ہو گئے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تاریخ رومہ کی بیحساب جنگی اور صنعتی یادگاریں ہمیشہ کے لیے نابودو بے نشان ہو گئیں۔

شہر رومہ پر آنے والی اس آفت کے وقت اس وقت کے رومی شہنشاہ نیرو نے اپنے آپ کو نہایت قابل حکمران ثابت کیا۔ آگ لگنے کے وقت وہ شہر سے باہر تھا اور جب واپس لوٹا تو آگ شاہی محلات کے قریب پہنچ چکی تھی ۔ پھر بھی اس نے آگ بجھانے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ وہ شہر میں اپنے حفاظتی دستے کے بغیر ہر طرف دوڑا دوڑا پھرا اور جہاں زیادہ خطرہ ہوتا وہاں بنفس نفیس پہنچ جاتا اور بالآخر جب یہ آگ بجھی تو اس آفت عظیم سے جو تباہی اور بربادی شہر کے لوگوں کو پیش آئی، بے شمار لوگوں کے گھر بار اور ساز و سامان نذر آتش ہو گئے۔ ان کی بحالی کے لیے ہر ممکن تدبیر بروئے کار لائی گئی۔ تمام سرکاری عمارتیں اور تمام شاہی باغ ان کے رہنے کے لیے کھول دیے گئے۔ مارتیوس کی چھاؤنی میں ایک بڑا سائبان تیار کرایا گیا۔ غلہ نہایت ارزاں قیمت پر ان آفت کے مارے ہوئے لوگوں کو فراہم کیا گیا۔ مصیبت زدگان کی امداد کے لیے کثیر سرمایہ شاہی خزانہ سے فراہم کیا گیا۔

اس سانحہ کے بعد شہر کی از سر نو تعمیر کا کام بڑی سرگرمی سے شروع کیا گیا۔ شہنشاہ نیرو کا عزم تھا کہ جلے ہوئے کھنڈرات پر جو شہر تعمیر کیا جائے وہ نہایت عالی شان ہو۔ پرانے معماروں کی غلطیوں کی نشاندہی کر دی گئی اور ان سے احتراز کیا گیا۔ گلی کوچے زیادہ کشادہ اور مکانوں کی بلندی خصوصی طور پر کم رکھی گئی ۔تمام وکمال نہیں تو جزوی طور پر ضرور نئی عمارات پتھروں سے تعمیر کی گئیں۔ نئی تعمیر ہونے والی عمارات قابل دید تھیں۔

تاہم یہ افواہ آج بھی تاریخ کے صفحات میں گشت کرتی نظر آتی ہے کہ یہ آگ خود شہنشاہ نیرو کے اشارے پر لگائی گئی تھی۔ وہ شہر رومہ کو از سر نو تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ یہ روایت بھی ملتی ہے کہ نیرو اپنے محل میں بیٹھا ہوا اس آگ کا نظارہ کرتا رہا بلکہ اس نے بانسری پر گیت بھی گائے۔ تاہم اس آگ کا الزام عیسائیوں پر لگا دیا گیا تھا اور ان کو سخت اذیت ناک سزائیں دی گئی تھیں۔

79 عیسوی پومپی آئی کی آتش فشانی راکھ میں تدفین

25 اگست 79ء کو علی الصبح آتش فشاں پہاڑ ویسویس Mount Vesuvius سے لاوا نکلا اور 60 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بہتے ہوئے اس لاوے کے سیلاب نے اس وقت کا عالی شان طور پر تعمیر شدہ رومی قصبہ پومپی آئی تباہ و برباد کر دیا۔ اس شہر اور کے مکانوں اور Villas کی کھڑکیوں، روشن دانوں ،دروازوں اور چھتوں سے کھولتا ہوا لاوا، گرم آتش فشانی راکھ اور زہریلی گیسیں گھروں میں داخل ہوگئیں جس کے بعد اس قصبے میں موجود ہر ذی روح موت کا شکار ہوگیا، تاہم یہ سب کچھ چشم زدن میں نہیں ہوا۔ ویسویس کی آتش فشانی شروع ہونے کے بعد پومپیائی کے باشندوں کو محسوس ہوا جیسے وہ آگ نگل رہے ہوں، گرم گیسیں سانس کے ساتھ ساتھ جیسے ہی ان کے پھیپھڑوں میں جاتیں وہ سیال مادے سے بھر جاتے اور اس کیفیت کے شکار انسانوں کو اپنا دم گھٹا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ یہ ایک انتہائی دردناک موت تھی ۔گرم گیس نہ صرف ان کے سانس کی نالیوں کو بند کر دیتی بلکہ ان کے پھیپھڑے بھی کام کرنا چھوڑ دیتے تھے اور وہ دم گھٹنے سے مر جاتے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے پومپیائی کے تمام باشندے ہلاک ہوگئے بلکہ خود یہ زندہ و جاوید قصبہ 20 فٹ موٹی آتش فشاں راکھ میں دفن ہونے کی وجہ سے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس قصبے کی یاد ضرور باقی رہی پھر ایک طویل عرصے کے بعد اتفاقی طور پر یہ قصبہ دریافت ہوا۔

اس قصبے سے ایک ایسے کتے کا مجسمہ بھی ملا ہے جو ایک کتے کی لاش کے گرد گرم آتش فشاں راکھ کے جمع ہونے کی وجہ سے مجسمہ بن گیا تھا۔ یہ کتا اپنے مالک کی لاش کے پہلو میں لیٹا رہا جو سانس گھٹنے کی وجہ سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ تاہم اس بہادر کتے نے آگ کے اس طوفان میں بھی گھر سے بھاگنا پسند نہیں کیا اور اپنے مالک سے وفاداری کی آج بھی پومپیائی میں اس کتے کا مجسمہ دیکھا جاسکتا ہے۔

کوہ ویسویس 4000 فٹ بلند ہے ۔ ایک محقق جے رابرٹ نیش نے اپنی کتاب Darkest Hour میں اس پہاڑ کو دنیا کا سب سے مہلک آتش فشاں قرار دیا تھا۔ یہ پہاڑ آتش فشاں پہاڑوں کے اس سلسلے سے تعلق رکھتا ہے جو اٹلی کے طول و عرض میں شمالی جانب پھیلا ہوا ہے ۔ یہ آتش فشاں افریقی ٹیکٹونک پلیٹ African Tectonic Plate اور یورایشین پلیٹ Eurasian Plate کے مقام اتصال پر

واقع ہے۔ یہ علاقہ اٹلی میں آتش فشاں سرگرمیوں کا مرکز ہے۔کوہ ویسوویس Vesuvius براعظم یورپ کا واحد بیدار آتش فشاں ہے یہ جنوبی اٹلی میں خلیج نیپلز کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ اس پہاڑ کی سب سے بڑی آتش فشانی 79 عیسوی میں واقع ہوئی تھی۔ 25 اگست 79ء کو یہ آتش فشاں ایک زور دار دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا تھا اور آسمان سے پومپائی اور ہرکولینم پر پتھروں اور گرم راکھ کی بارش ہونے لگی۔ گرم لاوے کا دریا بڑی روانی سے ان دونوں قصبوں میں داخل ہوگیا جس کے بعد ان قصبوں میں رہنے والے کسی ذی روح کو امان نہ ملی۔ یہ آتش فشانی اگلے 48 گھنٹے تک جاری رہی اور جب آسمان سے گرم راکھ اور پتھروں کی یہ بارش ختم ہوئی تو تمام شہر 7 میٹر (تقریباً 20 فٹ) موٹی راکھ کی تہہ اور پتھروں میں دفن ہو چکا تھا۔

کوہ ویسویس کی اس قیامت خیز آتش فشانی کا آنکھوں دیکھا حال ہمیں مشہور رومی مفکر پلینی دی ینگر Plini The Younger کے دو خطوط میں ملتا ہے جو اس نے ایک اور رومی مورخ ٹیسی ٹس کو اپنے چچا پلینی دی ایلڈ Plini The Elder کی موت پر استفسار کرنے پر اسے لکھے تھے۔ پلینی دی ایلڈر کی موت اس قدرتی آفت کے خلاف فوجی دستوں کے ساتھ مل کر لوگوں کو بچاتے ہوئے واقع ہوئی تھی۔ اس حادثے کے دوسرے دن جو لوگ پومپیائی اور ہرکولینم میں زندہ بچے وہ یہ دونوں شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ہرکولینم 65 فٹ دبیز راکھ کی تہہ میں دفن ہوگیا تھا جبکہ پومپیائی 20 فٹ کی موٹی راکھ کی تہہ میں گم ہوگیا تھا۔ 1594ء میں ایک اطالوی ماہر تعمیر ڈومینکو فونٹانا Domenoc Fontana کو ایک نہر کی کھدائی کے دوران ان دونوں شہروں کا سراغ ملا تھا۔ تاہم 1709ء سے پہلے ہرکولینم کی اثریاتی کھدائی نہ ہوسکی تھی جبکہ پومپیائی کی کھدائی اس کے بھی بعد 1745ء میں ہوئی تھی۔

پومپیائی ایک بیضوی شکل میں تعمیر شدہ رومی شہر تھا جو پہلی صدی عیسوی میں تقریباً تین کلو میٹر کے دائرے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس شہر کے گرد فصیل بھی تھی جس کے آٹھ دروازے تھے۔

365ء.....سونامی کے ہاتھوں اسکندریہ کی تباہی

لفظ سونامی جاپانی زبان کا لفظ ہے اس کے معنیٰ ''بندرگاہ کی امواج ہے'' یہ زلزلوں اور آتش فشانی کی وجہ سے زیر آب پیدا ہوتی ہیں۔ موسم گرما 365ء عیسوی میں مصر کے مشہور شہر اسکندریہ کی بندرگاہ سے ایک سونامی کی طاقت ور لہریں ٹکرائیں، یہ سونامی بحیرہ روم میں سمندر کی تہہ میں آنے والے ایک زلزلے کے نتیجے میں ترکی کے نزدیک سے اٹھا تھا۔ اس سونامی نے اٹلی اور یونان کے مختلف علاقوں کو تہہ و بالا کیا اور پھر پوری طاقت سے اسکندریہ کی بندرگاہ سے ٹکرا گیا۔ اسکندریہ اس سونامی کی لہروں کے براہ راست راستے میں آ گیا تھا۔ سونامی کی یہ لہریں 500 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے ہوئے اسکندریہ پہنچیں تھیں۔ جیسا کہ عموماً بڑے سونامیوں کے معاملے میں ہوتا ہے کہ اس کی موجیں جب ساحل کے اتھلے پانیوں میں پہنچتیں ہیں تو یہ بڑی بلندی کو چھونے لگتی ہیں۔ پھر یہ کم ہوتی ہوئی واپس سمندر کی طرف لوٹتی ہیں، مگر پھر دوبارہ نئی طاقت پکڑ کر ساحل پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ یعنی پیچھے لوٹ جانے کے بعد دوبارہ حملہ آور ہوتی ہیں۔

اسکندریہ کے باشندے سونامی کی موجوں کی اس خاصیت سے ناواقف تھے جیسے ہی موجیں سمندر کی طرف پیچھے ہٹیں وہ ساحل پر رہ جانے والی مچھلیاں اکٹھی کرنے لگے چونکہ لہروں کے واپس لوٹنے کی وجہ سے بہت سی بحری مخلوق پیچھے رہ گئی تھیں۔ اس دوران اسکندریہ کے لوگ بے تھکان آزادانہ طور پر گھوم پھر کر مچھلیاں جمع کر رہے تھے۔ جیسے ہی سونامی کی لہریں واپس لوٹیں یہ سب ان لہروں میں پھنس گئے۔ اس طرح ساحل پر موجوں کے واپس لوٹنے اور تباہی پھیلانے سے تقریباً 50 ہزار کے لگ بھگ لوگ مارے گئے۔

یہ طوفانی لہریں اتنی طاقت ور تھیں کہ انہوں نے بندرگاہ میں کھڑے ہوئے بحری جہازوں کو سینکڑوں فٹ بلندی پر اٹھا کر ساحلی ریت پر لا پٹکا۔ کچھ کشتیاں تو لوگوں کے ساحلی مکانوں کی چھتوں پر آ گریں۔ سونامی کی لہروں کی طاقت سے پتہ چلتا تھا کہ یہ جس زلزلے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں وہ کتنا شدید تھا۔

رومی مورخ ایمینس مارسیلینس Ammainus Marcellinus نے لکھا ہے کہ 21 جولائی 365ء کے دن ایسا لگتا تھا کہ جسے اسکندریہ کے قریب سمندر خالی ہوگیا ہو اور اس کا تمام پانی خشکی پر چڑھ آیا

ہو۔ یہاں تک کہ سمندر کی تہہ خالی نظر آنے لگی تھی اور زیر آب پہاڑ اور وادیوں میں جو خالق کائنات نے سمندر کے اندر تخلیق کی ہیں ہر قسم کی بحری مخلوق اس میں چلتی پھرتی نظر آنے لگی۔ پھر اچانک سمندر کا پانی پوری طاقت سے واپس لوٹ آیا۔ ناراض سمندر کی شور مچاتی ہوئی موجیں ساحل پر کھڑی ہوئی لاتعداد عمارتوں کو منہدم کر کے واپس لوٹ آئیں تھیں۔ ایسی بڑی قدرتی آفت کا ذکر نہ تو افسانوں میں کہیں ملتا ہے اور نہ ہی تاریخ میں۔ مشہور مسیحی عالم سینٹ جروم نے لکھا ہے کہ ایسا لگتا تھا کہ خدا نے ایک بار پھر طوفان نوح علیہ السلام کو زمین پر بھیج دیا تھا یا شاید قیامت آ گئی تھی۔

اسکندریہ یاد رہے مصر کا وہ شہر ہے جس کی بنیاد اسکندر اعظم نے 320ء میں رکھی تھی۔ بعدازاں شاہان بطلیموس کے عہد میں اس شہر میں عظیم لائبریری کی تعمیر کے بعد یہ تاریخی شہر دنیا کا علمی دارالحکومت بن گیا تھا۔ اس شہر میں مشہور یونانی ریاضی دان اقلیدسEuclid نے جیومیٹری پر اپنا مقالہ لکھا تھا اور اسی شہر میں پہلے پہل کرہ ارض کے محیط کی پیمائش کی گئی تھی۔ اسی شہر میں یونانی نژاد ملکہ قلوپطرہ نے حکومت کی تھی ۔ اسکندریہ کا مینارہ روشنیLight House بھی دنیا کے سات قدیم عجائبات میں سے ایک تھا۔ اسکندریہ کی عظیم لائبریری کو روئے زمین پر اس وقت کی سب سے بڑی لائبریری ہونے کا شہرہ بھی حاصل تھا۔ سلطنت روم میں خود رومہ کے بعد اسکندریہ سب سے اہم شہر تھا۔

رومی مورخ ایمینس کے مطابق بحیرہ روم میں 365ء میں پیدا ہونے والے اس بڑے سونامی نے اسکندریہ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ اس شہر کے کئی ہزار شہری اس بلائے بے درماں کی نذر ہوگئے تھے اور طوفانی موجوں نے بندرگاہ میں لنگر انداز جہازوں کو دو میل پرے تک اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ اس قدرتی آفت میں تاہم اسکندریہ کا مینارہ روشنی اور لائبریری صحیح سلامت رہے تھے اور بعد کے زمانوں یہ تباہ ہوئے تھے۔ اس قدرتی آفت کے نتیجے میں اسکندریہ اور مصر کے دیگر علاقوں میں ہونے والی اموات کی تعداد50000 کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔۔

اس سونامی نے یونان، قبرص، سسلی، لیبیا اور دیگر بحیرہ روم کے خطوں میں بھی شدید تباہی مچائی تھی۔ اس سونامی کی پیدائش کا مرکز جزیرہ کریٹCrete کے نزدیک واقع تھا۔ خود جزیرہ کریٹ کے کئی شہر اس طوفان بلاخیز کی نذر ہوگئے تھے۔ مسیحی روایات کے مطابق یونانی شہر اپی ڈورسEpidaurus کو ایک مسیحی سینٹ ہلیرینHilarian نے قصبے کے باہر ساحل کی ریت پر صلیب کا نشان بنا کر بچالیا تھا۔

447ء اٹیلا ہن کی خونریزیاں

وحشی ونڈال قبیلے کے روم کو تاراج کرنے سے تین سال پہلے رومہ کے شہریوں کو ''خدا کے تازیانہ'' Scourge of God کے مظالم کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ شاید اس ظالم انسان کے ہاتھوں قدرت بھی اپنے گناہگاروں کو سزا دینی چاہتی تھی۔

434ء میں اٹیلا ہن اپنے بھائی کے ساتھ تخت نشین ہوا یہ سلطنت کوہ اپس سے شمالاً بحیرہ بالٹک تک اور مشرقی سمت میں بحیرہ کیسپین Capsian Sea تک پھیلی ہوئی تھی ۔ دونوں بھائیوں کے دلوں میں مشرقی اور مغربی سلطنت رومہ کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی ۔ اسی وجہ سے جب وہ قسطنطنیہ سے آئے ہوئے سفیروں سے ملے تو اپنے گھوڑوں سے ان کے احترام میں نہیں اترے۔ 441ء میں انہوں نے بازنطینی سفیروں کو اپنے دربار میں طلب کر کے شکایت پیش کی کہ مشرقی رومی سلطنت نے اپنے وعدے کے مطابق سالانہ خراج ادا نہیں کیا۔ اسی وجہ سے انہوں نے مشرقی رومی سلطنت کے خلاف عسکری کارروائی کرتے ہوئے اس کے کئی سرحدی شہر بشمول بلغراد تہس نہس کر دیے۔ 443ء میں انہوں نے ایک بار پھر مشرقی سلطنت رومہ کے خلاف عسکری کارروائیاں شروع کر دیں اور سربیا ،صوفیہ اور کئی دوسرے علاقے تاخت وتاراج کر دیے۔ یہ علاقے وہ تھے جہاں قیصر قسطنطین اعظم پیدا ہوا تھا۔ مشرقی سلطنت کو اس جنگ وجدل سے بچنے کے لیے اٹیلا اور اس کے بھائی بلیڈا کو سالانہ خراج سے بھی زیادہ ادائیگی کر کے پرامن کرنا پڑا۔

445ء کے لگ بھگ اٹیلا اپنے بھائی بلیڈا Bleda کو قتل کر کے اکیلا ہی اپنی سلطنت کے سیاہ وسفید کا مالک بن گیا۔ 447ء میں اٹیلا نے ایک بار پھر مشرقی سلطنت پر دھاوا بولا۔ جزیرہ نما بلقان اور سلطنت کے دوسرے بڑے شہروں میں تباہی مچاتے ہوئے وہ جنوبی سمت سے یونان میں داخل ہوا اور ایک مسیحی مورخ کیلی نس Callinicus کے مطابق اس نے 100 سے زائد شہروں پر قبضہ کرلیا۔ ان مفتوح شہروں میں اس نے اتنا قتل عام کیا کہ مقتولوں کی تعداد کا تعین کرنا بھی مشکل ہوگیا، یہاں تک کہ مسیحی خانقاہوں میں راہبات اور راہبوں کو بھی اس قتل عام سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا اور بڑی تعداد میں یہ مذہبی پیشوا بھی قتل کر دیے گئے۔

ایک گوتھک فلسفی اور مورخ پریسی کس Priscus نامی مشرقی شہنشاہ رومہ کے سفیر کے ساتھ اٹیلا سے دربار میں 448ء میں پیش ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ فاتح اعظم اٹیلا ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھا ہوا انتہائی سادگی سے ایک لکڑی کے بنے ہوئے جام سے شراب پی رہا تھا،مگر اس نے اپنے مہمانوں کو چاندی اور سونے کے برتنوں میں کھانا کھلایااور شراب پلوائی ،مگر اس دوران اٹیلا انتہائی سادگی سے بیش قیمت کھانوں کی بجائے اپنی لکڑی کی پلیٹ میں محض گوشت تناول کرتا رہا۔ پریسی کس نے اٹیلا کا حلیہ بھی بیان کیا ہے۔

دو سال بعد رومی شاہی محلات کا ایک سکینڈل اٹیلا کے ہاتھ لگا۔ مغربی رومی شہنشاہ ویلنٹین Valentinain کی بہن ہونریا Honoria اپنے محل کے داروغہ کے ساتھ ایک جنسی اسکینڈل میں ملوث تھی اور سولہویں سال میں اس داروغہ سے حاملہ ہوگئی تھی۔ اس شہزادی نے پہلے قسطنطنیہ بھاگ جانے کی کوشش بھی کی تھی مگر اب اس نے اپنی انگوٹھی اٹیلا کو بھجوادی اور اٹیلا سے درخواست کی کہ وہ اس سے شادی کرلے۔ اگرچہ اٹیلا کی پہلے بھی بہت سی بیویاں تھیں تاہم اس نے اس رومی شہزادی کی درخواست منظور کرلیا،مگر جہیز میں آدھی مغربی رومی سلطنت طلب کی جس کی وجہ سے شہنشاہ نے اپنی بہن کی شادی کسی گمنام سردار سے کرکے اسے کسی گمنام جگہ پر منتقل کردیا،مگر اٹیلا اپنے مطالبے پر جما رہا اور 451ء میں اس نے رومہ پر حملہ کردیا اور اس کے کئی اہم شہروں کو تاراج کیا اور ان شہروں کے باشندوں کو تہہ تیغ کرکے شہروں کو آگ لگادی۔ اسی دوران اٹیلا نے ایک بشپ،سینٹ لوپ سے ملاقات کی۔ جب بشپ نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو اٹیلا نے جواب میں کہا کہ ''خدا کا تازیانہ'' ہے۔ اس بشپ نے اٹیلا کو تلقین کی کہ اگر وہ خدا کا تازیانہ ہے تو اسے خدا کے بھیجے ہوئے احکامات پر عمل کرنا چاہیے۔

453ء میں اٹیلا قسطنطنیہ پر ایک بڑے حملے کی تیاریاں کررہا تھا۔ اس نے ایک جرمن عورت سے شادی کرنا چاہی۔ اپنی عادت کے مطابق شادی کی رات اس نے بہت سی شراب پی۔ جب وہ دلہن کے حجلہ عروسی میں پہنچا تو کثرت شراب نوشی کی وجہ سے اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ یہ نکسیر اتنی دیر تک بہی کہ خون کی کمی کا شکار ہوکر اٹیلا اگلی صبح بستر سے نہ اٹھ سکا اور خود موت کے ہاتھوں مفتوح ہوگیا۔ یوں رومی دنیا خدا کے تازیانے سے نجات مل گئی۔ جس نے اپنے مفتوحین کی لاشوں کے انبار لگا دیے تھے۔

526ء انطاکیہ کا تباہ کن زلزلہ

مشرقی بحیرہ روم کے دیگر ساحلی شہروں کی طرح انطاکیہ Ontioch آج کے ترکی کا وہ شہر ہے جس کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس شہر کو ماضی میں مسلسل زلزلوں سے شدید نقصان پہنچتا رہا تھا۔ اناطولیہ صوبے کی بالائی پرت جو انطاکیہ کی زیریں پرت ہے شمال مغربی سمت میں کھسکتی رہتی ہے۔ اس پرت پر عربی ارضیاتی بالائی پرت کا پریشر ہے۔ پھر یہ دونوں پرتیں افریقی بالائی پرت سے بھی متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ 22 مئی 526ء عیسوی کی شام جب انطاکیہ کے لوگ اپنے گھروں میں موجود تھے۔ زلزلے کے شدید ترین جھٹکے اس شہر میں محسوس کیے گئے جن کے ساتھ شہر کی تمام عمارتیں زمین بوس ہوگئیں۔ ان جھٹکوں کے بعد بھی کئی شدید جھٹکے محسوس کیے گئے جنہوں نے انطاکیہ کے شہریوں کا خوف بڑھا دیا۔ تاہم اس سے کہیں زیادہ تباہی اگلے دن آئی جب زلزلے کے مارے اس شہر کو آگ کے شعلوں نے گھیر لیا۔ اس تباہی میں 5 لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوگئے۔

انطاکیہ مشرق کو مغرب سے ملانے والی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا اور چھٹی صدی عیسوی میں سلطنت روم کا تیسرا بڑا شہر مانا جاتا تھا۔ اس کی گلیوں کو منور رکھنے کے لیے سرکاری طور پر رات کے وقت تیل سے روشن کی جانے والی قندیلیں موجود تھیں۔ سنگ مرمر سے تعمیر کی گئیں عمارات اور خوبصورت موازئیک فرش اس شہر کی زینت تھے۔ یونانی دیومالا کے مطابق یہی وہ مقام تھا جہاں ڈافن Daphne نے تعاقب کرتے ہوئے اپالو سے عزت بچانے کے لیے خود کو ایک درخت میں بدل لیا تھا۔

ماضی میں 115 عیسوی میں آنے والے ایک زلزلے میں اس شہر میں رومی شہنشاہ ٹراجن بمشکل زندہ بچا تھا۔ رومیوں کے نزدیک یہ سب اس لیے رونما ہوا تھا کہ رومی دیوتا انطاکیہ میں مسیحیت کے پھیلنے پر ناراض تھے۔ اسی وجہ سے شہنشاہ ٹراجن اپنی مشرقی عسکری مہم کے دوران انطاکیہ کے بشپ کو زنجیروں میں جکڑ کر گرفتار کر کے اپنے ساتھ روم لے گیا تھا اور اسے بھوکے وحشی درندوں کے آگے ڈالا گیا تھا۔

مگر اس واقعے کے چار سو سال بعد انطاکیہ عیسائیوں کے زیر انتداب تھا۔ 29 مئی 526ء کو اس شہر میں معمول سے زیادہ گہما گہمی تھی کیونکہ اگلے دن یعنی 30 مئی کو اس شہر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الاسماء کا تہوار منانے کے لیے دوسرے شہروں سے بھی بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ایک مسیحی

عالم پروکوپیئس Procopius کے مطابق ایک شدید زلزلہ نے اس شہر کو آلیا اور سارے شہر کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ زلزلہ اتنا اچانک آیا تھا کہ اس شہر کے باسیوں کو ذرا سنبھلنے اور حفاظتی اقدامات کرنے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ ابھی لوگ پہلے شدید جھٹکوں سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ مزید جھٹکے محسوس کیے جانے لگے جن کے بعد اس تباہ شدہ شہر میں آگ بھڑک اٹھی۔ جو لوگ زلزلے سے بچ گئے تھے۔ اب وہ آگ میں جلنے لگے۔ ایک اور تذکرہ نگار جان مالالاس John Malalas نے لکھا ہے کہ زلزلے کے بعد بھڑکنے والی آگ اتنی شدید تھی وہ جہنم کی آگ کو پیچھے چھوڑ رہی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ آگ حکم خداوندی پر ہی بھڑکی ہے۔ اس شہر کی کوئی عمارت نہ کوئی خانقاہ نہ کوئی سرکاری عمارت، نہ کوئی گھر، اس آگ سے کچھ بھی نہیں بچ سکا تھا۔ اس شہر کے بڑے گرجا گھر میں پانچ دن تک شعلے بھڑکتے رہے اور آخر وہ زمین بوس ہوگیا۔

پانچ لاکھ افراد کے جاں بحق ہونے کے بعد وہ لوگ بھی زندہ نہ بچ سکے جو شدید زخمی ہوگئے تھے۔ کچھ لوگ عمارتی ملبے میں دب کر لاپتہ ہوگئے، کچھ کو لٹیروں نے آلیا۔ اس شہر کے کھنڈرات تک کو لوٹ لیا گیا۔ لوٹنے والوں میں خود سرکاری افسر بھی شامل تھے۔

مسیحی روایات کے مطابق اس سانحہ کے بعد اس شہر میں کچھ معجزاتی واقعات بھی رونما ہوئے، زلزلے کے تین دن بعد زندہ بچ جانے والے بہت سے شہریوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زیارت ہوئی۔ وہ حاملہ خواتین جو عمارتی ملبے میں پھنس گئی تھیں وہ سب اپنے نومولود بچوں کے ساتھ بخیریت باہر نکل آئیں۔ اور بہت سے ایسے غیر معمولی واقعات بھی پیش آئے جنہیں انسانی زبان بیان کرنے سے قاصر ہے، مگر ان سب کے باوجود ایک سچائی یہ بھی تھی کہ انطاکیہ زمین بوس ہو چکا تھا۔

مورخ مالالاس کے مطابق اس وقت کے بازنطینی شہنشاہ جسٹن نے جیسے ہی انطاکیہ کی تباہی و بربادی کی خبر سنی۔ اپنے سر سے شاہی تاج اور اپنا شاہی لبادہ اتار پھینکا اور رو پڑا۔ اگرچہ شہنشاہ نے فوری طور پر اس شہر کی بحالی اور تعمیر نو کے احکامات جاری کر دیے تھے، مگر اس کے باوجود اس شہر کی بحالی اور تعمیر نو کا کام ایک سال بعد شروع ہو سکا۔

نومبر 528ء میں ابھی بحالی کا کام جاری تھا کہ ایک اور شدید زلزلہ آ گیا جس سے مزید 5000 افراد ہلاک ہوگئے اور وہ سب عمارات بھی زمین بوس ہوگئیں جو ایک سال میں دوبارہ تعمیر کی گئی تھیں۔

542ء قسطنطنیہ میں طاعون یا ''سیاہ موت''

542ء عیسوی میں بزنطینی شہنشاہ جسٹینین Justinain تیزی سے اپنی سلطنت کی تعمیر نو میں مصروف تھا۔قسطنطنیہ یا مشرقی روم اس دور کا خوشحال ترین شہر تھا،مگر اسی کامیابیوں کے شاندار دور کے عین دوران ہی قسطنطنیہ میں سیاہ موت یا گلٹی والا طاعون نمودار ہوا اور اس نے اس دور کے سب سے عظیم شہر کو تاراج کر کے رکھ دیا اور بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائی۔ اس وباء سے صبح وشام اتنے لوگ مرتے تھے کہ فصیل کے اندر واقع قبرستانوں میں دفن کے لیے جگہ باقی نہیں بچی تھی۔ لاشیں اب گاڑیوں میں بھر بھر کر شہر سے باہر لے جائی جاتیں اور خندقوں میں پھینک دی جاتیں اور ان کو مٹی سے ڈھانپ دیا جاتا تھا۔ جب یہ خندقیں بھی بھر گئیں تو آخر لاشیں کشتیوں میں رکھ کر غلطہ پہنچائی جانے لگیں۔اندازہ کیا گیا ہے کہ سات لاکھ آبادی میں سے کم از کم تین لاکھ انسان یا افراد طاعون کا شکار ہوگئے تھے۔خود شہنشاہ جسٹینین بھی اس وباء کا شکار ہوا مگر خوش قسمتی سے بچ گیا۔ اسی وجہ سے یہ وباء پلیگ آف جسٹینین Plague of Justinain بھی کہلاتی ہے۔

ہم عصر مورخ پروکوپیئس Procopius کے مطابق اس وباء کا آغاز مصر سے ہوا تھا۔مصر کے بعد یہ بیماری فلسطین کے شہروں میں پہنچی اور پھر وہاں سے یہ اس وقت کی معلوم پوری دنیا میں پھیل گئی۔شاید ہی اس وباء سے اس زمانے میں دنیا کا کوئی گوشہ محفوظ رہا ہو۔ یہ بیماری ہر جزیرے اور ہر اس پہاڑی غار تک بھی پھیل گئی جہاں انسان آباد تھے۔ اس دور میں کارواں اور قافلے تجارتی اور دیگر مقاصد کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کیا کرتے تھے۔ انہیں کے ذریعے یہ وبائی مرض بہت سے ممالک میں پھیلا تھا۔قسطنطنیہ دیگر ممالک سے بہت سی اشیاء برآمد کرتا تھا۔ اس کے لیے غلہ خصوصی طور پر مصر سے آتا تھا۔ مصر ہی اس وبائی مرض کے پھیلنے کا مرکز تھا۔مصر سے غلہ لانے والے بحری جہازوں میں چوہے اور ان کے پسو اس بیماری کو موسم بہار 542ء میں قسطنطنیہ تک لے آئے۔ ان دنوں مورخ پروکوپیئس قسطنطنیہ میں قیام پذیر تھا۔

اس مورخ کے مطابق یہ بیماری قسطنطنیہ میں انسانوں کے بھیس میں بھوتوں کے ذریعے پہنچی تھی۔ یہ بھوت پریت جس انسان سے ملتے اسے یہ بیماری لاحق ہوجاتی تھی مگر جدید طب کے مطابق یہ بیماری

ایک مخصوص وائرس کے ذریعے پھیلتی ہے جسے شاید پروکوپیس نے انسانی لبادے میں بھوت قرار دیا تھا۔ پروکوپیئس کے مطابق جو مسیحی عابدوزاہد عیسائی عبادت گزار اور وظائف پڑھتے تھے انہیں بھی ان بھوتوں سے امان نہیں ملی تھی۔ بعض لوگ اس بیماری سے بچنے کے لیے اپنے اپنے گھروں میں محصور ہو کر بیٹھ گئے اور دروازوں پر دستک دینے والے اپنے عزیز کو بھی اس بیماری کا حامل بھوت سمجھتے ہوئے دروازہ نہیں کھولا۔ تاہم ان میں سے بعض کو ایسے خواب نظر آئے جن میں انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کا نام بھی اس وبائی مرض سے مرنے والوں میں لکھا جاچکا ہے۔

اس بیماری کا شکار ہونے والوں کو پہلے پہل شدید تیز بخار ہوجاتا تھا لیکن یہ بخار اتنا معمولی ہوتا کہ طبیب اس کے ہونے کی اصل وجہ جاننے سے قاصر رہتے تھے تاہم ایک یا دو دن بعد اس مریض کے جسم پر طاعونی گلٹیاں نمودار ہونا شروع ہوجاتی تھیں جو بغلوں اور چڈوں یا جانگھوں میں ہوتی تھیں۔ اس کے بعد مریض پر غشی طاری ہوجاتی۔ اگر کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا ہوتا تو وہ ہوش میں آئے بغیر ہی کھانا کھا لیتے اور اگر کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا تو مریض فاقہ کشی سے جلد چل بستا۔ اس دوران مریض کو بالکل ہوش نہ رہتا۔ مریض اپنے گھروں میں چیخیں مارتے سنائی دیتے اور انہیں محسوس ہوتا کہ کوئی انہیں قتل کرنے کے لیے ان کے گھر میں داخل ہورہا ہے۔ پھر گلٹیوں میں تکلیف بڑھنے سے مریض کی موت جلد واقع ہوجاتی۔

اس زمانے تک سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ گلٹی دار طاعون کے پھیلنے کی صحیح وجہ کا سراغ لگ سکتا۔ جدید زمانے میں ہونے والی تحقیق کے مطابق یہ بیماری سیاہ چوہوں کی کھال سے چمٹے ہوئے پسوؤں کی وجہ سے پھیلتی تھی جو غلے کے ساتھ جہازوں میں لدکر ایک ملک سے دوسرے ملک چلے جاتے تھے اور بندرگاہوں سے نکل کر شہروں میں گھس جاتے تھے۔

اس وباء کی شدت کے دوران قسطنطنیہ میں ہر ہفتے دس ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہوتے تھے۔ لاشوں کی اجتماعی تدفین عام تھی۔ اس کے باوجود شہر میں گھر اور گلیاں گلی سڑی لاشوں سے بھری پڑی رہتیں تھیں۔ جلد ہی شرح اموات اس سے بھی بڑھ گئی اور گورکن اتنی لاشوں کو دفنانے سے قاصر رہ گئے۔ لاشوں کو گاڑیوں میں بھر کر ساحل پر ڈھیر کیا جانے لگا جہاں وہ پڑی ہوئی گلتی سڑتی رہتی تھیں۔ گلیاں اور شاہراہیں لاشوں سے اٹ جانے کی وجہ سے شہر میں تعفن پھیل گیا اور پورے شہر میں گوشت کی سڑاند پھیلی رہنے لگی تھی۔ اس بیماری سے قسطنطنیہ میں تین لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوئے تھے۔

856ء عیسوی کارنتھ، یونان میں آنے والا زلزلہ

یونان قدیم کا شہر کارنیتھ Corinth ایک ایسا شہر ہے ۔جو ماضی میں ایک زلزلہ آشنا شہر تھا۔ یہ شہر ارضیاتی طور پر نقص رکھنے والے علاقے میں واقع تھا اور اکثر زلزلوں کا شکار ہوتا رہتا تھا۔ یہ شہر یونان قدیم کی ایک مصروف بندرگاہ تھا اور بعد ازاں بازنطینی سلطنت کے زیر انتداب رہا تھا۔ یہ شہر جن تین ارضیاتی پرتوں کے اوپر واقع تھا وہ اکثر متحرک رہتی تھیں۔ یہ پرتیں سالانہ ایک انچ کے تیسرے حصے تک حرکت پذیر رہتی تھیں۔ ارضیاتی اصطلاح میں اس سالانہ حرکت پذیری کو بہت تیز قرار دیا جاتا ہے ۔ یہی زلزلوں کی بار بار آمد کا سبب تھا۔

856ء عیسوی میں کارنیتھ اپنی تاریخ کے سب سے خوفناک زلزلے سے دوچار ہوا تھا ۔ یہ زلزلہ ریکٹر سکیل پر 8 سے زائد طاقت کا تھا۔ اس زلزلے سے یہ شہر مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا اور اس کے 45000 شہری اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

یونانی شہر کارنیتھ کی بنیاد 3000 سال پہلے رکھی گئی تھی۔ یہ یونان قدیم کی ایک امیر ترین بندرگاہ اور ایک بڑا شہر تھا۔ اس شہر کی عسکری اہمیت بھی اسے یونان کے دیگر شہروں سے ممتاز کرتی تھی۔ یہ خاکنائے کارنیتھ کے ایک سرے پر ایتھنز سے پچاس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔قدیم زمانے سے خاکنائے کارنیتھ میں ایک نہر کھود کر اسے ایتھنز سے ملانے کا منصوبہ بنایا جاتا رہا تھا۔تاہم 1893ء سے پہلے یہاں کوئی نہر نہیں کھودی جاسکی تھی۔

آج کل جو کارنیتھ شہر آباد ہے اس کی تعمیر 1858ء میں آنے والے ایک اور زلزلے کے ہاتھوں قدیم کارنیتھ کی تباہی کے بعد رکھی گئی تھی ۔1928ء میں آنے والے ایک زلزلے نے جدید کارنیتھ کو بھی شدید نقصان پہنچایا تھا جس کے بعد اس کی بھی تعمیر نو کی گئی تھی۔

856ء دامغان، ایران کا تباہ کن زلزلہ

دامغان، آج کے شمالی ایران کا ایک قدیم شہر ہے۔ یہ شہر اپنے کاغذی باداموں کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ 856ء میں یہ قدیم شہر ایک تباہ کن زلزلے کا شکار ہوگیا تھا۔ اس شہر کے ارد گرد تقریباً دو سو میل کا علاقہ بھی اس زلزلے نے تباہ و برباد کردیا تھا۔ اس علاقے کا ہر گاؤں زمین بوس ہوگیا۔ دامغان سے پچاس میل کے فاصلے پر واقع قصبہ بستم بھی تین چوتھائی صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ اس زلزلے کے مرکز کے قریب واقع پہاڑی علاقے میں کئی جگہ سے سطح زمین میں دراڑیں پڑ گئیں۔ اس قدرتی آفت سے تقریباً دو لاکھ افراد مارے گئے یا لاپتہ ہوگئے۔ اس سانحہ کی یادیں اس علاقے کے باشندے دو پشتوں تک نہ بھول سکے تھے۔ دو پشتوں بعد جب اس حادثے کے واقعات قلم بند کیے گئے تو ان کی تفصیلات جوں کی توں تھیں۔ ایران کو مورخین نے زلزلوں کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ یہ ملک ایک ایسے خطے میں واقع ہے جہاں ارضیاتی طور پر زمین کی زیریں پرتوں میں مسلسل تصادم ہوتا رہتا ہے جو کہ اکثر زلزلوں کا باعث بنتا رہا ہے۔ تاہم ہمیں ایران میں آنے والے قدیم زمانے کے زلزلوں کے بارے میں کوئی تفصیلات نہیں ملتیں۔

عہد اسلام کے آغاز کے بعد 622ء سے 922ء تک آنے والے زلزلوں کا احوال ضرور ملتا ہے۔ ان 300 سالوں میں 40 سے زائد بڑے زلزلوں کا احوال تاریخ میں درج ہے جو ریکٹر اسکیل پر 5 سے 7 درجے تک شدید تھے۔ تاہم اس زمانے کے مسلم مورخین نے ان زلزلوں کی وجوہات ارسطو کے فلسفے کے مطابق توہماتی ہی بتائیں ہیں اور زلزلوں کی آمد کے متعلق کوئی سائنسی تحقیق نہیں کی گئی تھی۔

یہاں تک جدید زمانے میں بھی زلزلوں کو مذہبی طور پر خدا کی طرف سے بھیجا جانے والا عذاب ہی قرار دیا جاتا رہا۔ سیاسی اور مذہبی مفکرین کا ایک گروہ زلزلوں کو سیاسی اتار چڑھاؤ کا شگون قرار دیتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے چین کی حکومت نے 1976ء میں چین میں آنے والے ایک شدید زلزلے کی تفصیلات دنیا کی نظروں سے تین سال تک اوجھل رکھیں تھیں۔ اسی طرح 16 جنوری 1979ء کو ایران میں بھی ایک شدید زلزلہ آیا تھا۔ یاد رہے یہ وہ دن تھا جس دن ایران سے پہلوی خاندان کی بادشاہت اور خود بادشاہ نے سامان رخصت باندھا اور ملکی حکومت اسلامی انقلاب کے داعیوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ ایران کے

بہت سے لوگوں کے خیال کے مطابق اس دن آنے والا یہ زلزلہ اسی سیاسی تبدیلی کا شگون تھا۔ مگر ارضیاتی ماہرین کے مطابق ایران میں آنے والے اکثر زلزلے یوریشیائی اور عربین ارضیاتی پرتوں کے باہم تصادم کی بناء پر آتے رہے ہیں جو تقریباً ہر سال آدھ انچ بڑھ جاتیں ہیں۔

2003ء میں ایران میں آنے والے ایک شدید زلزلے میں ایران کا ایک قدیم شہر بم صفحہ ہستی سے مٹ گیا تھا۔B.B.C کے رپورٹروں کے مطابق اس شہر کی تباہی اور شہریوں کی اموات کی بڑی وجہ اس شہر کے خستہ حال مکانات تھے جبکہ دوسری بڑی وجہ اس زلزلے کی آمد کا وقت تھا۔ جب زیادہ تر شہری محو استراحت تھے اور سنبھل نہ سکے۔ دو لاکھ کی آبادی میں سے تین چوتھائی افراد یا تو ہلاک ہوگئے یا پھر شدید طور پر زخمی ۔ اس شہر کی اکثر عمارات جن میں دو بڑے رپورٹروں نے اس حوالے سے بڑے دردناک سین بیان کیے تھے۔جن لوگوں کے لواحقین کی لاشیں عمارتی ملبے میں دبی ہوئی تھیں یا جن کی لاشیں کمبلوں میں ڈھکی ہوئی تھیں۔ وہ زاروزار کھڑے ہوئے رو رہے تھے۔ کچھ یہی مناظر شاید 856ء میں بھی دیکھنے میں بالضرور آئے ہوں گے۔ شاید ایسے ہی مناظر 1780ء میں تبریز میں دیکھنے میں آئے تھے جب200000انسان ہلاک ہوگئے تھے۔

ایران کے دیہاتی علاقوں سے ہزاروں سال سے مکانات گارے اور کچی اینٹوں سے تعمیر کیے جاتے ہیں جو زلزلوں کا آسانی سے شکار ہوجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایران میں آنے والے زلزلوں میں جانی نقصان بہت زیادہ ہوتا رہا ہے ۔ تاہم ایرانی خانہ بدوشوں کے خیمےYurtاس سے مستثنیٰ رہے ہیں۔ یہ خیمے ماضی کے زلزلہ پروف مکانات تھے۔زلزلہ پروف عمارتوں کی تعمیر کا خیال تاہم حالیہ زمانے ہی میں انسان کو آیا ہے۔

1138ء حلب، شام میں آنے والا تباہ کن زلزلہ

1138ء میں ایک خوفناک زلزلے نے شام کے شہر حلب Aleppo اور اس کے مضافات کو اس حد تک تاراج کردیا کہ اس علاقے سے زندگی کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ کل 23000 افراد اس خوفناک زلزلے کا شکار ہوگئے۔ یہ شہر قدیم زمانے سے زلزلوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ اس شہر کے باشندے روز مرہ زندگی کے دیگر لوازمات کی طرح ہی زلزلوں اور ان کی تباہیوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ مورخین کے مطابق اس زلزلے کی آمد سے پانسو سال پہلے بھی ریکٹر اسکیل کے مطابق ایک 7 درجے کے زلزلے نے حلب اور اس کے ساحلی علاقوں کو تاراج کیا تھا۔ اس زلزلے کے اثرات پورے مشرقی بحیرہ روم کے علاقوں پر مرتب ہوئے تھے اور ان علاقوں میں اس زلزلے کی وجہ سے ایک سونامی بھی آیا تھا۔ 1138ء میں آنے والے زلزلے نے بھی ایک وسیع علاقے کو تباہ وبرباد کردیا تھا اور حلب سے دوسو میل دور کے قصبوں اور شہروں تک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ دنیا میں آنے والا پانچواں بڑا زلزلہ تھا۔

حلب Aleppo شمال مغربی شام کا شہر اس بڑی شاہراہ پر واقع تھا جو شام سے بغداد جاتی تھی۔ 1000 ق م سے بیشتر یہ حتی سلطنت کا مرکز تھا۔ بازنطینی عہد میں بھی یہ مشرق وسطی کا ایک خوشحال شہر رہا ہے۔ ساتویں صدی میں عربوں نے اور گیارہویں صدی میں اسے سلجوق ترکوں نے فتح کیا تھا۔ 1138ء میں آنے والی شدید زلزلے سے صرف 14 سال پہلے 1124ء میں صلیبیوں نے اس کا محاصرہ کرلیا تھا۔ یہ شہر ترکوں کی عثمانیہ سلطنت میں 1923ء تک شامل رہا ہے۔

حلب ایک ایسے محل وقوع پر آباد ہے جہاں کی آب وہوا شدید گرم ہے تاہم سطح سمندر سے 1000 فٹ بلند ہونے کی وجہ سے یہاں سالہا سال تیز ہوائیں چلتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے موسم گرما کی شدت 110 دگری فارن ہیٹ سے کم رہتی ہے۔ اس شہر کا جدید نام حلب عربی زبان کے ایک قدیم لفظ پر مبنی ہے جس کے معنی دودھ کے ہیں۔ روایات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ہجرت کے دوران یہاں قیام کیا تھا۔ قدیم زمانے سے یہاں عیسائی بھی اس شہر کی آبادی کا حصہ رہے ہیں اور یہودیوں کی ایک بڑی تعداد بھی اس شہر میں آباد رہی ہے۔ اس شہر میں سب سے پہلا کلیسا قسطنطین اعظم کی والدہ سینٹ ہیلنا نے چوتھی صدی عیسوی میں تعمیر کرایا تھا۔

1213ء کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرنے والا فاتح

فاتحین عالم میں ایک نام تاتاری فاتح چنگیز خاں کا ہے۔چنگیز خان نے اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر اپنے مفتوحین کے سروں کے مینار تعمیر کرائے تھے۔

چنگیز خان جھیل بیکال کے نزدیک منگولیا میں تیموجن کے نام سے پلا بڑھا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ جب پیدا ہوا تھا تو اس کی ایک ہتھیلی میں وہ خون کی پھٹکی لے کر پیدا ہوا تھا۔ جب تیموجن کی عمر ابھی 9 سال تھی تو اس کا باپ زہر خورانی سے ہلاک کردیا گیا تھا جس کی بناء پر چنگیز خان کو بچپن میں فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ امراء کے بچوں کی طرح گھوڑی کے دودھ اور بکرے کے گوشت کی بجائے پودوں کی جڑیں اور مچھلی کھا کر پلا بڑھا۔ جن دشمنوں نے اس کے باپ کو قتل کروایا تھا بعد ازاں انہوں نے تیموجن کو لکڑی کا پٹہ پہنا کر اس کی آزادی سلب کرلی تھی۔ پھر ایک رات جب وہ لوگ ایک ضیافت میں مصروف تھے، چنگیز خاں ان کے ایک پہرے دار کو قتل کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اس کو سکون کے لمحات بہت کم میسر آئے۔ ایک موقع پر دشمنوں نے اس کی بیوی سے زنا بالجبر کیا جس کے بعد چنگیز خان نے اپنے باپ کے ایک دوست سے ایک چھوٹی سی فوج حاصل کر کے اپنے ان دشمنوں کا صفایا کردیا۔ایک اور دشمن قبیلے نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی جائیداد پر قبضہ کرلیا تھا۔چنگیز خان نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے اس کے قبیلے پر قابو پا کر اسے اپنا غلام بنا لیا۔ اگلے مرحلے پر اس نے تاتاری قبیلوں کو بروز شمشیر اپنا مطیع بنایا اور اپنے مخالفوں میں سے ہر اس شخص کو قتل کردیا جس کا قد اس کی بیل گاڑیوں کے دھروں سے نکلتا ہوا تھا۔ یوں جلد ہی وہ تمام تاتاری قبائل کا بلا شرکت غیرے سردار بن جانے میں کامیاب ہوگیا۔ 1206ء تک وہ تمام تاتاری قبائل کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے تیموجن کی بجائے چنگیز خان کا لقب اختیار کرلیا جس کا مطلب تاتاری زبان میں ''کائناتی رہنما'' بنتا ہے۔ جلد ہی اس وقت کی دنیا کا بڑا حصہ اس کے نام کو سن کر کانپنے لگا۔

وحشی تاتاریوں کو ایک منضبط قوم میں تبدیل کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلے چین کا رخ کیا۔1213ء میں وہ منگولیا سے دیوار چین کو عبور کر کے شمالی چین پر لشکر کشی کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے بیجنگ سمیت چین کے 28 بڑے شہروں پر قبضہ کرلیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ 1300ء تک چین

کے بڑے بڑے شہروں ان فاتح تاتاریوں نے ہلاک کر دیے تھے۔ اس کے بعد خدا کے اس قہر نے خوارزم کی سلطنت کو تباہ و تاراج کر کے رکھ دیا۔ سلطنت خوارزم ان دنوں وسطی ایشیاء سے ایران تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنگیز خاں کے بھیجے ہوئے تاجروں کے قافلے کو ایک خوارزمی گورنر غیر خان نے اپنے دارالحکومت میں قتل کروا دیا تھا۔ شاید وہ اپنے نام کے ساتھ غیر ہونے کے باوجود غیر کا خواہاں نہ تھا۔ چنگیز خان نے اپنے سفیر خوارزم شاہ کے دربار میں بھیجے اور اس ظالم گورنر کو سزائے موت دینے کا مطالبہ کیا۔ خوارزم شاہ نے اپنے گورنر کو سزا دینے کی بجائے چنگیز خاں کے سفیروں کو بلا وجہ قتل کروا دیا اور کچھ کی داڑھیاں منڈوا کر انہیں واپس چنگیز خاں کے دربار میں بھیج دیا۔ اس غیر متوقع جواب نے چنگیز خاں کی آتش غضب کو بھڑکا دیا۔ اس نے سلطنت خوارزم پر حملہ کر دیا۔ پانچ ماہ کے محاصرے کے بعد چنگیز خانی افواج نے اس کے صوبائی دارالحکومت کو فتح کر لیا اور اس خوارزمی گورنر کو قرار واقع سزا دی اور اس شہر کے تمام شہریوں کو قتل کروا دیا اور اپنی فتح کی یادگار کے طور پر ان کے بریدہ سروں کے مینار تعمیر کروائے۔ چنگیز خاں کا سلطنت خوارزم میں اگلا نشانہ مشہور شہر بخارا تھا۔ اس شہر میں داخل ہونے کے بعد شہر کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس نے اس شہر کے باشندوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں خدا کا قہر ہوں جو اس شہر کے لوگوں پر نازل ہوا ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنے لشکریوں کو اشارہ دیا کہ گھاس کٹ چکی اپنے اپنے گھوڑوں کو چارہ دو۔ یہ اشارہ پاتے ہی چنگیزی افواج شہریوں پر ٹوٹ پڑیں اور ان کا مال اسباب لوٹ کر انہیں موت سے زیادہ سخت سزائیں دیں اور آخر میں پورے شہر کو زمین بوس کر دیا۔ سمرقند اور بلخ کے لوگوں نے جب بخارا کا یہ حال دیکھا تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور چنگیز خاں سے امان چاہی مگر ان کا حال بھی بخارا کے لوگوں سے مختلف نہیں ہوا۔ اس کے بعد چنگیز خاں نے اپنے ایک بیٹے تولے خاں کو 70 ہزار فوج کے ساتھ خراسان پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تولے خان نے نیشا پور کو فتح کر کے شاہ خوارزم کو گرفتار کر لیا جو اس شہر میں پناہ گزیں تھا۔ اس شاندار فتح کی خوشی میں نیشا پور کے لوگوں کے سروں کے مینار تعمیر کیے گئے۔ خراسان کا شہر مروان دنوں ایک عظیم الشان شہر تھا۔ اس کی آبادی خوارزم سے آنے والے پناہ گزینوں کی وجہ سے دوگنی ہو چکی تھی۔ مورخ جوینی نے لکھا ہے کہ تاتاریوں نے یہ شہر فتح کر کے تمام شہریوں کو تہہ تیغ کر دیا اور صرف ہنرمند لوگوں کو قتل نہ کیا۔ ہر منگول سپاہی کے حصے میں 300 آدمی برائے قتل آئے۔ اس طرح 20 لاکھ سے زائد افراد قتل کر دیے گئے۔ چنگیز خاں نے خود 18 اگست 1227ء کو وفات پائی مگر تاتاری افواج سیلاب کی مانند پورے مشرق وسطی کو مصر تک تاراج کرتی چلی گئی۔

1383ء امیر تیمور کی ترکتازیاں یا مظالم کے افسانے

مشہور فاتح عالم امیر تیمور کو ''تیمور لنگڑا'' Timur The Lam کا خطاب اس کے ایرانی مخالفوں نے دیا تھا۔ اسی سے انگریزی نام Tamburlain نکلا ہے۔ اس عظیم ایشیائی فاتح عالم نے دمشق سے دہلی تک معلوم دنیا کے تمام عظیم الشان شہروں کو تاخت وتاراج کر دیا تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ امیر تیمور نے اپنی زندگی میں کل 35 عسکری مہمات کی قیادت کی اور 27 سے زائد شاہان عالم کے تاج وتخت روند ڈالے تھے۔

امیر تیمور 1336ء میں مشہور وسطی ایشائی شہر سمرقند کے مضافات میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک تاتاری قبیلے کے سردار کا بڑا بیٹا تھا۔ یہ تاتاری قبیلہ آج کے ازبکستان اور اس وقت کے ماوراالنہر میں آباد ہوگیا تھا اور چنگیز خاں کی عسکری مہمات کے وقت منگولیا سے آیا تھا۔

تیمور کو جنگ لڑنے کا تجربہ صرف 12 سال کی عمر میں ہوا تھا جب ایک دشمن قبیلے نے حملہ کر کے اسے صرف 60 سواروں کے ساتھ صحرا میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ امیر تیمور اور اس کے ساٹھ بھگوڑے ساتھیوں کے تعاقب میں ایک ہزار سے زائد دشمن کے گھڑ سوار نکلے تاہم اس کے ساتھیوں نے انتہائی بہادری سے لڑتے ہوئے دشمنوں کو پیچھے دھکیل دیا مگر اس جوابی کارروائی میں اس کے بہت سے ساتھی میدان جنگ میں کام آ گئے اور اس کے پاس صرف سات آدمی اور چار گھوڑے باقی بچے جس کی وجہ دشمن اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئے ،مگر اس کی قسمت میں بے موت مارے جانا نہیں لکھا تھا بلکہ وہ آئندہ ایک فاتح عالم بن کر خود لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والا تھا۔ اس نے دریا آمو میں چھلانگ لگا کر خود کو آزاد کرالیا اور آخر کار اپنے دشمنوں کو شکست دی۔

25 سال کی عمر میں وہ ماوراء النہر کے گورنر الیاس خواجہ کا وزیر بن گیا اور پھر صرف تین سال کے بعد اپنے ایک سسرالی عزیز امیر حسین کی مدد سے اس نے گورنر الیاس خواجہ کو ٹھکانے لگا کر اس کی سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ اس کا اگلا شکار خود امیر حسین بنا جس نے اس کی مدد کی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ: راہ طلب میں کون کسی کا؟ اپنے بھی بیگانے ہیں۔ امیر حسین کو قتل کرنے کے بعد اس نے تاتاری سلطنت کو بحال کرنے والے کا لقب اختیار کیا اور لتھوانیا اور روس کی فوجوں سے لڑ کر وہ ماسکو شہر تک پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ 1383ء میں اس نے ایران کو فتح کرنے کے لیے عسکری مہم کا آغاز کیا۔ اگلے

گیارہ سال تک اس کی افواج ایران آرمینا ،عراق، آذربائیجان اور جارجیا میں پیش قدمی کرتی چلی گئیں۔ اپنے دشمنوں کو آگاہ کرنے کے لیے وہ میدان جنگ میں ایک سرخ خیمے میں رہتا تھا۔

جن شہروں کو وہ فتح کرتا اگر وہ اس کے خلاف بغاوت کر دیتے تو بڑی بے رحمی سے ان کی بغاوت کو کچل دیتا۔ ان شہروں میں قتل عام کر کے ان کے شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا اور شہر کو زمین بوس کر کے امیر تیمور اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرواتا تھا۔

1398ء میں جب امیر تیمور کی عمر 60 سال سے تجاوز کر چکی تھی تو اس نے ہندوستان کی فتح کے لیے اپنی بدنام زمانہ عسکری مہم کا آغاز کیا تھا۔ اس نے ہندوستان پر حملہ محض اس الزام پر کیا کہ دہلی کے مسلم حکمران اپنی ہندو رعایا کے ساتھ انتہائی نرمی برتتے تھے اور گھل مل گئے تھے۔ 24 ستمبر کو دریائے سندھ کو وہ عبور کر کے دہلی کی طرف بڑھا اور سلطان دہلی نصیر الدین محمود کو شکست دی کر دہلی پر قابض ہو گیا۔ فتح کے بعد اس کی فوجوں نے ایک لاکھ سے زائد جنگی قیدیوں (سلطان کے سپاہیوں) کو موت کے گھاٹ اتار دیا کہ وہ کافر تھے۔

امیر تیمور خان کے اپنے الفاظ میں اسلام کے ان دشمنوں کو کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ دہلی کو اتنا تاراج کیا گیا کہ یہ عظیم الشان شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔ دہلی اس حالت سے اگلے ایک سو سال نہیں نکل سکا۔

ابھی وہ ہندوستان میں تھا کہ اسے خبریں موصول ہوئیں کہ عثمانی سلطان بایزید اور مصر کے مملوک سلطان نے اس کے ایک باج گزار حکمران سے اس کا علاقہ چھین لیا ہے۔ اس خبر سے مشتعل ہو کر امیر تیمور نے اناطولیہ کے سرحدی شہر سیواس کو زمین بوس کر دیا اور 4000 آرمینائی سپاہیوں کو زندہ درگور کر دیا۔

1399ء میں اس نے حلب پر قبضہ کر لیا۔ مشہور مورخ گبن لکھتا ہے کہ امیر تیمور کی فتح کے بعد اس شہر کی گلیاں انسانی خون سے بھر گئیں اور ہر طرف انسانی چیخ وپکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ امیر تیمور نے اپنے فوج کے ہر سپاہی کو حکم دیا کہ انسانی سروں کا مینار تعمیر کرنے کے لے ہر فوجی سپاہی کم از کم دو انسانی سر فراہم کرے۔ 1401ء میں اس نے مشہور تاریخی شہر دمشق ایک معاہدے کے تحت فتح کیا مگر شہر میں داخل ہونے کے بعد اس معاہدے کی دھجیاں بکھیر دیں اور شہر کو جلا کر راکھ مین تبدیل کر دیا اور ہنرمند لوگوں کے سوا اس شہر کے تمام باشندوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد بغداد فتح کیا گیا اور اس کے 90000 شہریوں کے سروں سے مینارہ تعمیر کیا گیا۔ 1402ء میں سلطان بایزید کو اس نے انقرہ کے مقام پر شکست دی اور یورپ میں بڑھتی ہوئی اسلامی فتوحات کا راستہ مسدود کر دیا۔ 1405ء کے آغاز میں تیمور 70 سال کی عمر میں چین کے خلاف عسکری مہم لے کر جانا چاہتا تھا کہ اسے پیغام اجل آ گیا اور اسے ایک آبنوسی تابوت میں سمرقند میں دفن کیا گیا۔

1202ء.....مشرقی بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں کا سب سے بڑا زلزلہ

مشرقی بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں میں آنے والا سب سے بڑا اور تباہ کن زلزلہ جولائی 1202ء میں آیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس زلزلے میں تقریباً 22 لاکھ افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ یہ زلزلہ بالائی مصر، شام، عراق، فلسطین، آرمینیا، قبرص، دمشق، صور Tyre اور نابلوس Nablus جیسے ایشیائی علاقوں اور شہروں میں آیا تھا اور اس نے ان علاقوں میں شدید جانی و مالی نقصانات پہنچائے تھے۔ صرف نابلوس میں اس زلزلے سے 30 ہزار افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ فلسطین کے شہروں میں عکہ اور لیبیائی شہر طرابلس اس زلزلے سے شدید طور پر متاثر ہوئے تھے اور ان شہروں کی فصلیں منہدم ہوگئیں تھیں جبکہ لبنان کے شہر بعلبیک Ballbek میں رومی عہد کے قدیم کھنڈرات کو بھی شدید نقصان پہنچا تھا۔

ارض فلسطین میں موجود صلیبی جنگجو اس زلزلے کو قیامت کی نشانی سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے بہت سے صلیبی جنگجوؤں نے یورپ واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ارض فلسطین میں اس زلزلے سے یروشلم کو استثنیٰ حاصل رہا تھا جبکہ اس زلزلے کے بعد مصر ایک شدید قحط کا شکار ہوگیا تھا۔ بحیرہ روم Mediterranean دنیا کے خشکی میں گھرے ہوئے سمندروں میں سب سے بڑا ہے۔ اس کے شمال میں براعظم یورپ، مشرق میں براعظم ایشیاء، اور مغرب میں براعظم افریقہ واقع ہیں۔ اس سمندر کا کل رقبہ 1145000 مربع میل ہے۔ اس کا انتہائی طول 2300 میل اور عرض تقریباً 1200 میل ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ گہرائی میٹا پان کے مقام پر 14435 فٹ ہے۔ یہ سمندر بحرہ اوقیانوس سے بذریعہ آبنائے جبل الطارق سے بحر اسود سے بذریعہ دردانیال و ماموہ آبنائے باسفورس اور بحیرہ قلزم سے بذریعہ نہر سویز ملا ہوا ہے۔ اس کے مشرقی ساحلوں پر اسکندریہ صور اور بیروت جیسے عظیم الشان شہر تعمیر کیے گئے ہیں۔

1202ء کا تباہ کن زلزلہ اس سمندر کے مشرقی ساحلوں پر تباہی کا باعث بنا تھا اور زیادہ تر ایشیائی ساحلی مقامات اس زلزلے سے متاثر ہوئے تھے۔

1347ء..... یورپ ''سیاہ موت'' کی زد میں

چودھویں صدی عیسوی میں پھیلنے والی طاعون کی وباء پوری انسانی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ ہے۔ اس وباء سے سات کروڑ سے زائد انسان جاں بحق ہوگئے تھے۔ بہت سے انسان جو اس بیماری میں مبتلا ہوئے تھے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ شاید وہ نوع انسانی کا المناک اختتام دیکھنے والے آخری انسان ہیں۔ مورخین نے اس بیماری کا خوفناک ترین نام ''سیاہ موت'' لکھا ہے۔ یہ خوفناک نام اس بیماری کو مریض کے جسم پر پڑنے والے سیاہ دھبوں کی وجہ سے دیا گیا تھا جو مریض کی کھال کے نیچے ہونے والے جریان خونHaemorrhages کی وجہ سے پڑتے تھے۔جدید زمانے کے ماہرین امراض انسانی نے اس بیماری کو گلٹی دار نمونیائی اور سمیت خونSepticaemicوالے طاعون کا ملغوبہ قرار دیا ہے جبکہ کچھ ماہرین امراض کا خیال ہے کہ یہ ایک بالکل مختلف بیماری تھی جو قدیم زمانے سے وائرس کے ذریعے دنیا میں پھیلتی رہی تھی۔طاعون کی وباء جو براعظم یورپ میں بازنطینی شہنشاہ جیسٹینین کے زمانے سے پھیلنا شروع ہوئی تھی اور جس نے نوع انسانی کے بڑے حصے کو اس براعظم میں تاراج کیا تھا۔اٹھارھویں صدی تک تباہی مچاتی رہی تھی۔ چودھویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیاں اس براعظم کے لیے بڑی بھاری ثابت ہوئی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اس براعظم میں نوع انسانی کی خوشحالی کا اختتام ہے۔ 1315-19ء تک یہ براعظم شدید قحط سالی کا شکار رہا۔ پھر بھی خشک سالی سے نہ سنبھل پایا تھا کہ 1345ء میں ہونے والی چھ ماہ کی مسلسل بارشوں نے کسانوں کو اناج اُگانے سے بے بس کردیا۔نتیجتاً بھوک اور بڑھ گئی اور بہت سے انسان جو قحط سالی سے بچ گئے تھے اب مارے گئے۔(دیکھئے 1345ء)جو اب بھی بچ رہے وہ انتہائی لاغر اور کمزور ہوگئے جو معمولی بیماری بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔جو لوگ نوع انسانی کے مسائل کو سمجھتے تھے وہ ان حالات کو کسی بڑے سانحے کا پیش خیمہ بتا رہے تھے۔اس پر آسمان سے ٹوٹ کر گرنے والے ستارے اور ایوی نانAvignon فرانس میں پاپائے اعظم کے محل میں لگنے والی آگ اور شدید زلزلے جن کی وجہ سے وینس اور روم کے چوکوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں سب اس بات کی علامت تھیں کہ نوع انسانی پر کوئی بڑی قیامت ٹوٹنے والی ہے اور پھر یہ قیامت ''سیاہ موت'' کی صورت میں ٹوٹ پڑی۔

مورخین نے لکھا ہے کہ اسی زمانے میں وسطی ایشیاء میں جھیلIssyk kul کے علاقے میں گلہری نما

چوہے اپنے بلوں سے نکل پڑے تھے۔ انہیں چوہوں کی کھالوں سے وہ پسو چمٹے ہوئے تھے جو طاعون کے جراثیم لیے ہوئے تھے۔ یہ چوہے جب سیاہ چوہوں سے ملے جلے تو طاعون کی بیماری کے جراثیم Bacillus رکھنے والے یہ پسو ان سے سیاہ چوہوں پر منتقل ہو گئے۔ یہ چوہے اناج کی تلاش میں بحری جہازوں پر سوار ہو جاتے تھے اور طویل سفر کرتے تھے۔ بحری جہازوں سے یہ چوہے ایک بار پھر انسانی آبادیوں میں منتقل ہو جاتے اور انسانوں کے ساتھ ان کے گھروں میں رہنے لگتے تھے۔ چوہوں کی اسی منتقلی کے عمل سے 1330ء کی دہائی میں طاعون پھوٹنے کے واقعات سامنے آنے لگے تھے۔

1334ء میں چین میں طاعون کی وباء پھوٹ نکلی اور اس سے تقریباً ایک کروڑ افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ چین سے تجارتی شاہراہوں پر سفر کرتی ہوئی یہ وباء ہندوستان، میسوپوٹیمیا، منگولیا، شام اور آرمینا او مصر سے ہوتی ہوئی بالآخر براعظم یورپ تک پہنچ گئی۔ 1346ء سے طاعون کی وباء ترکی کے صوبے ا طولیہ میں پھیلی اور اس سے جزیرہ نما کریمیاCrimea میں 85000 تاتاری النسل لوگ ہلاک ہو گئے۔ تاتاری اس بیماری کا ترنوالہ ثابت ہوئے تھے۔ پھر بحیرہ اسود کی بندرگاہوں سے یہ بیماری اطالوری جنیوا کے تاجروں کے ذریعے ان کے تجارتی مرکزوں تک پھیلی۔ یہ تاجر ان دنوں مشرق و مغرب کو تجارت کے ذریعے ملائے ہوئے تھے۔ انہیں تاجروں کے ذریعے یہ بیماری اٹلی کے ساحلوں تک پہنچ گئی۔ روایتی طور پر جنیوا کے انہیں تاجروں کو طاعون یورپ میں منتقل کرنے والے انسانی ذرائع قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم یہ بیماری دیگر ذرائع سے بھی براعظم یورپ منتقل ہوئی تھی۔

اکتوبر 1347ء میں ایک درجن سے زائد بحری جہاز سسلی کے شہر میسینا Messina کی بندرگاہ میں داخل ہوئے۔ یہ جنیوا کے تاجروں کے جہاز تھے اور ریشم اور گرم مصالحہ جات لے کر مشرق کی بندرگاہوں سے یہاں پہنچے تھے۔ اس جہاز پر سوار ملاحوں میں طاعون پہلے ہی سے پھیلا ہوا تھا۔ تاہم ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان جہازوں پر یہ بیماری بحیرہ اسود کی بندرگاہوں سے منتقل ہوئی تھی یا چین کی بندرگاہوں سے۔ ان جہازیوں کے شہریوں سے رابطے کے بعد یہ وبا شہر میں پھوٹ پڑی اور میسینا کے شہری اس مرض میں مبتلا ہو کر مرنے لگے۔ اسی وجہ سے طاعون پھیلانے والے ان جہازوں کو میسینا کی بندرگاہ سے نکال دیا گیا مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی اور یہ وباء اس شہر کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ میسینا کے شہریوں نے اپنے ہمسایوں Catanians سے ان حالات میں سینٹ اگاتھا St.Agatha کی متبرک باقیات کچھ دن کے لیے مانگیں تا کہ اس شہر سے طاعون کی وباء دور ہو جائے۔ Catanian آرچ بشپ یہ متبرک باقیات میسینا والوں کو دینے کے لیے تیار تھا مگر Catania کے شہریوں نے یہ کہہ کر باقیات دینے سے انکار کر دیا کہ ایسا ان کی لاشوں پر سے گزر کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

ایک تذکرہ نگار کے مطابق جنوری 1348ء میں مشرق سے آنے والی تین بحری جہاز جنیوا کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئے۔ ان جہازوں پر طاعون پھیلا ہوا تھا۔ اس لیے جنیوا Genoa کے منتظمین نے ان جہازوں کو بندرگاہ سے نکال دیا۔ یہ جہاز جنیوا کی بندرگاہ سے نکل کر سپین اور فرانس کی بندرگاہوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ ادھر اٹلی موسم بہار 1348ء تک پوری طرح اس ہولناک وباء کی لپیٹ میں آچکا تھا۔

فلورنس کے مشہور ادیب بوکیشیو Boccaccio نے اپنی تصانیف میں فلورنس میں اس وباء کے پھیلنے کا احوال درج کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح جو لوگ اس وباء سے متاثر ہوئے ان کی بغلوں اور چڑوں میں گلٹیاں نمودار ہوتیں اور انڈے یا سیب کے سائز کی ہوجاتی تھیں، پھر اس مریض کے پورے جسم پر سیاہ رنگ کے دھبے پڑنے شروع ہوجاتے۔ بوکیشیو نے لکھا ہے کہ جس مریض کے جسم پر یہ دھبے نمودار ہوجاتے وہ پھر مشکل ہی سے بچتا تھا اور یہ دھبے اس کے لیے پیغام اجل ثابت ہوتے تھے۔ ایسے مریض کو اپنی موت کا کچھ زیادہ عرصے تک انتظار نہ کرنا پڑتا اور مرض کے آغاز سے صرف تین دن بعد اس کی موت واقع ہوجاتی تھی۔ اس مرض کے متعدی ہونے کا ایسا خوف فلورنس کے شہریوں کے دلوں میں بیٹھا کہ باپ نے بیٹے اور بھائیوں اور بہنوں نے اپنے بھائی بہن چھوڑ دیے۔ یہاں تک کہ اکثر بیوی اور شوہر بھی ایک دوسرے کو چھوڑ گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مائیں بھی اپنے بیمار بچوں کو چھوڑ گئیں اور مریضوں کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ خوف کی وجہ سے اس وباء سے مرنے والوں کا کوئی جنازہ اٹھانے والا نہ رہا اور مریضوں کی لاشوں سے شہر کا کونہ کونہ اٹ گیا۔ لاشوں کی تجہیز وتکفین کرنے اور قبریں کھودنے والا کوئی نہ رہا۔ ایک مردہ انسان اور ایک مردہ بکری میں کوئی فرق نہ رہا۔ بہت سے لوگ کسی اطلاع کے بغیر ہی اپنے گھروں میں مر جاتے اور ان کے مرنے کا اس وقت پتہ چلتا جب ان کے گھروں میں لاش سڑنے سی تعفن پھیل جاتا تھا اور مجبوراً ان کے ہمسائے ان کی لاشوں کو ان کے گھروں سے باہر پھینکنے پر مجبور ہوجاتے۔

قبرستانوں اور گرجا گھروں کے صحن بھر جانے کے بعد انسانی لاشوں کی تدفین کے لیے بڑی بڑی خندقیں کھودی جانے لگیں جن میں اجتماعی طور پر ہزاروں لاشوں کو دفن کردیا جاتا تھا۔

اٹلی میں ان دنوں پورے یورپ کے تین بڑے شہر واقع تھے، جنیوا، وینس اور فلورنس، یہ وباء ان شہروں میں چار ماہ تک پھیلی رہی اور کم از کم 65000 شہری اس وباء سے ہلاک ہوگئے۔ پوری پوری بستیاں اور محلے اس وباء نے تاراج کردیے۔ ان شہروں کی آدھی سے زیادہ آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی۔ بوکیشیو کے مطابق اس بیماری سے بچنے کے لیے لوگوں نے انسانی آبادیوں سے الگ تھلگ رہنا

شروع کر دیا۔ امراء، تعیش پسند انہ انداز زندگی چھوڑ کر سادہ زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ وینس میں الگ تھلگ رہنے والوں نے ہمیں ایک نیا لفظ Quarantine قرنطینہ دیا جس کا مطلب الگ تھلگ رکھنا یا رہنا ہے۔

انگلستان میں اس وباء کو پھیلانے والا ایک جرمن ملاح کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ بیمار جرمن ملاح برسٹل کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا تھا۔ جس سے برسٹل میں یہ وباء پھوٹ پڑی تھی اور 10000 کی آبادی میں سے 4000 سے زائد افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ اس وباء سے لندن کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ہلاک ہو گیا تھا۔ انگلستان کا علاقہ ایسٹ انگالیہ East Anglia اس وباء سے سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔ اس علاقے کی آدھی سے زیادہ آبادی تلف ہو گئی تھی۔ ناروچ Norwich کی آبادی پورے ساڑھے تین سو سال بعد 1700ء میں اس درجے کو پہنچی تھی جتنی اس وباء کے پھیلنے سے پہلے تھی۔ انگلستان میں اس وباء کے پھیلنے کے بعد ایسے دردناک مناظر دیکھنے میں آئے کہ مائیں اپنے بچوں کی لاشوں کو خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر گرجا گھروں میں کھدے ہوئے گڑھوں میں پھینکنے پر مجبور ہو گئیں تھیں۔ انگلستان کی آبادی وباء سے پہلے 80 لاکھ تھی اس آبادی میں سے 30 لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہو گئے تھے۔

یورپ میں ''سیاہ موت'' کی وباء ماسکو جیسے دور دراز کے شہروں تک پھیل گئی تھی۔ ناروے کے ساحلوں پر اُون سے لدے ہوئے بحری جہاز اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ یورپ کے بعض علاقے اس وباء کے پھیلنے سے محفوظ بھی رہے تھے۔ ان میں سے ایک پولینڈ تھا جس نے اپنی سرحدوں پر قرنطینہ کا نظام اس وباء سے بچاؤ کے لیے نافذ کر دیا تھا۔ امرائے یورپ نے بھی اپنے بچاؤ کے لیے ایسا ہی انتظام کر رکھا تھا۔ یورپی بادشاہوں میں سے جو اس زمانے میں برسر اقتدار تھے صرف سپین کا بادشاہ الفانسوا اس وباء سے گڈفرائیڈے 1350ء کو جاں بحق ہو گیا تھا۔ الفانسو نے ان دنوں جبرالٹر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ شاہ انگلستان ایڈورڈ سوم کی ایک بیٹی شہزادی جون، شاہ آرگان کی بیوی، شہنشاہ زنطیم کا ایک بیٹا، شاہ فرانس کی ایک بیوی اور بیٹی اور شاہ سویڈن کے بھائی اس وباء کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے تھے۔

انگریز ہم عصر شاعر، ولیم لینگلینڈ نے اپنی ایک نظم Piers Plowman میں اس طاعون کو انسانوں کے بڑھتے ہوئے گناہوں کی سزا قرار دیا ہے۔ اسی طرح اس وقت کے مانچسٹر کے بشپ نے اس وباء کو انسانوں کے گناہوں کے بڑھ جانے کی روک تھام کے لیے بھیجا گیا عذاب خداوندی قرار دیا تھا۔ شاہ سویڈن نے اس عذاب خداوندی سے بچنے کے لیے اپنی عوام کو حکم دیا تھا کہ وہ گرجا گھروں میں عبادات کی ادائیگی کے لیے ننگے پیر جائیں اور جمعہ کے دن صرف پانی کے ساتھ روٹی کھائیں۔ پوپ سمیت کئی بڑے مسیحی راہنماؤں نے اسی قسم کے کئی اور احکامات بھی اس وباء سے بچنے کے لیے نافذ کیے تھے۔ جرمنی

میں Flagellants نامی فرقے نے اپنے آپ سخت ایذائیں دیں اور خود کو کوڑے لگوائے تا کہ ان گناہوں کا کفارہ ادا ہو سکے جن کی وجہ سے یہ وباء نازل کی گئی تھی۔ مگر حکام اس فرقے کے رہنماؤں کے باغی ہو جانے سے خوفزدہ ہو گئے اور پوپ کو اس فرقے کی تعذیب کے احکامات جاری کرنے پڑے۔

دوسرے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ Flagellants کے ان اعمال کی وجہ سے جرمنی بڑی حد تک اس وباء کے پھیلنے سے دوسرے یورپی ممالک سے مقابلے میں محفوظ رہا، مگر واقعہ یہ ہے کہ جرمنی میں یہ بیماری دوسرے یورپی ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہلاکت خیز رہی۔ اسی مسیحی فرقے نے یہودیوں کا قتل عام کر کے بھی طاعون کی وباء کا روک تھام کرنے کی کوشش کی جو ظلم کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ پوپ نے یہودیوں کے اس قتل عام کی مذمت کی اور اس فرقے کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ اسی طرح جب یہ وباء قبرص میں پھیلی تو وہاں کے عیسائیوں نے اپنے عرب غلاموں (مسلمانوں) کو قتل کر کے اس وباء کی روک تھام کی تھی۔

اس وباء کو پھیلانے میں پسوؤں نے جو کردار ادا کیا تھا وہ اس زمانے میں کسی کے دماغ میں نہ آیا اور 1700 سال پہلے ایتھنز میں پھیلنے والے طاعون کی طرح اس کا سبب زہریلے بخارات Miasma کو قرار دیا گیا۔ ایک اور نظریہ جو اس بیماری کے پھیلاؤ کے لیے پیش کیا گیا وہ کسی بدروح کا مریض کو نظر آنا تھا۔ اسی نظریے کے تحت آسٹریا کے دارالحکومت ویانا میں طاعون کی وباء فضا میں نیلے شعلوں کی شکل میں اڑتی ہوئی نظر آئی جبکہ لیتھوانیا میں یہ وباء ایک پراسرار کنواری دوشیزہ کے اپنا سرخ سکارف لہرانے کی وجہ سے نظر آئی۔ شاہ فرانس فلپ ششم نے یونیورسٹی آف پیرس کی ایک میڈیکل فیکلٹی کو اس وباء کے ضمن میں جواب دہی کے لیے اپنے دربار میں طلب کر لیا تھا۔ تعلیم یافتہ طبقے نے اس وباء کے پھیلنے کی وجہ اجرام فلکی خصوصاً زحل، مریخ اور مشتری کی گردش کو قرار دیا۔

اس عہد میں یورپ میں جہالت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے اطباء نے مریضوں کو اس بیماری سے بچنے کے لیے بڑے عجیب وغریب مشورے دیے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ زہریلے بخارات کو دور کرنے کے لیے خوشبو دار لکڑیاں، صندل وغیرہ کو گھروں میں جلایا جائے یا فرش پر عرق گلاب یا سرکے کا چھڑکاؤ کیا جائے۔ گرم پانی سے غسل کرنے سے اجتناب برتنے کا مشورہ دیا گیا کہ اس سے مسام کھلنے سے انفیکشن کا خطرہ تھا۔ اگر گھر سے باہر جائیں تو بہتر ہے کہ کالی مرچ، کافور صندل اور گلاب کا آمیزہ ساتھ رکھا جائے۔

تاہم ان تمام احتیاطی اقدامات کے باوجود 1351ء تک یہ وباء یورپ میں نہیں دب سکی تھی اور اس وقت تک یہ براعظم یورپ کی آبادی کا تیسرا حصہ تلف کر چکی تھی۔ مشہور اطالوی شاعر

پیٹرارچPetrarch نے لکھا ہے کہ ہرطرف ویرانی پھیل گئی تھی۔ ایک آئرش ادیب نے اپنے مرنے کا جواحوال قلم بند کیا وہ انسان کولرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ اس نے لکھا تھا شاید ہی بنی آدم کی نوع سے کوئی ذی روح اس وباء سے زندہ بچ سکے گا۔ فلورنس کے ایک تذکرہ نگار نے لکھا تھا کہ اسے یقین ہے کہ نوع انسانی معدوم ہوجائے گی۔ گیوانی بوکیشیو نے لکھا کہ لوگوں کی حالت اتنی خراب ہوچکی ہے کہ ان کی طرف دیکھا نہیں جاسکتا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں بیمار ہورہے تھے اور دوا اور علاج کچھ میسر نہیں تھا۔ اس لیے وہ بغیر علاج موت کے منہ میں جارہے تھے۔ بہت سے لوگ گھروں سے باہر ہی شاہراہوں پر مر گئے اور بہت سے گھروں کے اندر۔ جب ان کی سڑی ہوئی لاشوں کا تعفن پھیلا تو ان کی موت کا پتہ چلا۔

1520ء.....نئی دنیا میں چیچک کی وباء

سولہویں صدی کی اولین دہائیوں میں ''نئی دنیا'' امریکہ کے علاقے نیو میکسیکو میں پھیلنے والی چیچک کی وباء پرانی دنیاؤں میں پھیلنے والی طاعون کی وباء سے زیادہ مہلک تھی۔ اس کے بارے میں ازطیک ریڈانڈینوں کے نوشتوں میں تحریر ہے کہ انہیں سولہویں صدی کی دوسری دہائی میں عجیب سے شگون دکھائی دیتے تھے، جیسے کسی پراسرار آگ سے پورا آسمان روشن ہوگیا۔ ایک مقدس درگاہ شعلوں میں گھر گئی، آسمان پر دم دار ستارے چلتے ہوئے دکھائی دیے۔ ٹیکسو کو Texoco جھیل جس میں ایک جزیرے پر ازطیک دارالحکومت ٹینوخ ٹیٹلاں Tenochtitlan واقع تھا وہاں بدشگونی کے طور پر اس کا پانی ابلتا ہوا دکھائی دیا۔

یاد رہے کہ بعد ازاں اس قدیم ازطیک شہر کی جگہ آج کا جدید میکسیکو شہر تعمیر کیا گیا تھا۔ ان بدشگونیوں کے دکھائی دینے کے بعد اس زمانے کا توہم پرست ازطیک شہنشاہ ماؤنٹی زوما Montezuma لرز کر رہ گیا تھا۔ انہیں دنوں اسے ہمسایہ مایا کے لوگوں کے ملک سے ایک پراسرار سفید قوم کے سمندر پار سے امریکہ آنے کی خبریں موصول ہوئی تھیں۔ یہ قوم اپنے بڑے بڑے جہازوں پر آویزاں سفید پروں کے ذریعے سمندر کو عبور کر کے نئی دنیا کے ساحلوں تک پہنچی تھی۔ اس قوم کے افراد کے پاس آگ اگلنے والے نئی قسم کے ہتھیار تھے جو چشم زدن میں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ ان خبروں کے موصول ہونے کے بعد سے شہنشاہ مونٹی زوما سخت خوفزدہ تھا۔

اُسے تحریر شدہ اس پیشن گوئی پر بھی یقین تھا کہ اژدھے کی کلغی کے تاج والا دیوتا کوئٹزری کوتل ایک دن ضرور ایک پیغمبر بادشاہ کے روپ میں واپس لوٹے گا۔ اس کی چمڑی سفید ہوگی اور اس نے داڑھی بھی رکھی ہوئی ہوگی۔ مگر جس بات کی خبر شہنشاہ مونٹی زوما کو نہیں ہوسکی تھی وہ یہ تھی کہ یہ سفید فام لوگ اپنے ساتھ اپنے آتشیں ہتھیاروں سے بھی زیادہ مہلک اور نہ دکھائی دینے والی موت کی وباء چیچک بھی ساتھ لائیں گے۔ 1507ء میں سفید فام لوگوں کی آمد کے بعد سے جزیرہ ہسپانیولا (جزیرہ ہیٹی Hatti) پر لاکھوں ریڈ انڈین لوگوں کی موت کا باعث بننے والی یہ وباء پھیل چکی تھی۔ 1519ء میں یہی وبائی مرض پورٹو ریکو، جمیکا اور کیوبا تک پھیل چکا تھا۔

تقریباً انہیں دنوں ہسپانوی طالع آزما ہرنان کو ریٹز نیو میکسیکو کے ساحل پر ویرا کروز Vera

Cruz کے نزدیک لنگر انداز ہوا۔ اس کے ساتھ 550 سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی فوج بھی تھی۔ چیچک کی وباء سے ازطیک لوگوں کی ہسپانوی طالع آزما ہرنان کوریٹز کی اس چھوٹی سی فوج کے ہاتھوں شکست سے پتہ چلتا ہے کہ ایک وباء پوری دنیا کو کس آسانی سے بدل سکتی ہے۔

1519ء میں ہرنان کوریٹز چیچک کے جرثومے پورٹو ریکو جنوبی امریکہ سے شمالی امریکہ بالخصوص میکسیکو میں لایا تھا۔ اس وباء کے میکسیکو میں پھیلنے کی وجہ سے 30 سے 40 لاکھ ریڈ اینڈین انطیک لوگ انتہائی بے بسی کی موت مرگئے تھے۔ یہ تاریخ عالم کی سب سے مہلک وباء تھی جو اتنے انسانوں کی موت کا باعث بنی تھی۔ یہ حیرت انگیز امر ہے کہ کویٹز کی فوج میں چیچک کا صرف ایک مریض یونیفا ٹلو ڈی ناروئز 1519ء میں میکسیکو پہنچا تھا اور اس کے ساتھ چیچک کا وائرس بھی شمالی امریکہ پہنچ گیا اور 40 لاکھ لوگوں کی موت کا باعث بنا تھا۔

8 نومبر 1519ء کو ازطیک شہنشاہ مونٹی زوما نے اپنے دارالحکومت ٹینوچ ٹیٹلاں کے باہر کورٹیز کا استقبال ایک ایسے دیوتا کے طور پر کیا جس کی واپسی کی منتظر ازطیک قوم صدیوں سے تھی مگر یہی دیوتا اس قوم کے لیے موت کا فرشتہ ثابت ہوا۔

چیچک کی وباء کا شکار ازطیک لوگ جب اپنی کھردری دریوں پر لیٹتے تو ان کے چیچک کے چھالے پھوٹ جاتے اور ان چھالوں سے بہنے والا چیچک کا مواد ان دریوں کو ان کے جسموں سے چمٹانے کا باعث بنتا۔ اس حالت میں جب وہ کروٹ بدلتے تو ان کے جسم کے ایک پہلو کی کھال جسم سے اتر جاتی اور زخم سے خون بہنے لگتا۔ خون بہتے ہوئے جسموں والے ان چیچک زدہ مریضوں کو دیکھنے سے ہول آتا تھا۔ جب ان کی یہ حالت ہوجاتی تو وہ معمولی سردی لگنے یا کسی دوسری وجہ سے فوراً مرجاتے تھے۔ اس طرح ازطیک لوگوں کی تقریباً تین چوتھائی آبادی تہس نہس ہوگئی۔ جتنے لوگ کوریٹز کی فوج کی گولیوں کے لگنے سے نہیں مرے تھے۔ اس سے کہیں زیادہ چیچک کے وائرس کا شکار ہوگئے تھے۔ اس طرح صرف 500 افراد کی چھوٹی سی ایک فوج کے ساتھ کوریٹز نے لاکھوں ازطیک لوگوں پر فتح پالی، مگر یہ چیچک کے وبائی مرض کی فتح تھی کوریٹز کی نہیں۔ اس بات کو آج بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

شمالی امریکہ میں 1620ء بوسٹن میں چیچک کی وباء پھوٹی تھی۔ اس وبا نے وہی کام کیا تھا جو 1520ء کی وبا نے میکسیکو میں کیا تھا یعنی اس علاقے کے بے شمار مقامی باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اس طرح امریکہ کے نو آبادکار مقامی لوگوں کی نسل کشی میں کامیاب ہوگئے۔ آج ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ریڈ انڈین لوگوں کو چڑیا گھر نما بستیوں میں صرف دکھاوے کے لیے رکھا جاتا ہے۔

1556ء.....صوبہ شانسی کا زلزلہ

چین کے صوبے شانکسی میں 1556ء میں آنے والا زلزلہ اب تک تاریخ عالم کا سب سے ہولناک زلزلہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس زلزلے میں آٹھ لاکھ تیس ہزار سے زائد افراد لاپتہ ہوگئے تھے اور چین کے دور دراز کے علاقوں میں بھی اس زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے تھے۔ ماہرین اس زلزلے کو ریکٹر اسکیل پر 8 درجے سے زائد یا 8.3 درجے کا قرار دیتے ہیں۔ اس زلزلے کے جھٹکے اگلے چھ ماہ تک محسوس کیے جاتے رہے۔ اس زلزلے کے مرکز سے 250 میل دور تک کا علاقہ وسیع پیمانے پر تباہ و برباد ہوگیا تھا۔

اس زمانے میں شانکسی کی آبادی کا بڑا حصہ غاروں میں رہتا تھا وہ لوگ اس زلزلے میں بڑی تعداد میں زندہ درگور ہوگئے تھے۔ ہزاروں ٹن وزنی غاروں کی چھتیں سوئے ہوئے بے خبر چینیوں پر گر گئیں تھیں۔ اس کے علاوہ کچی آبادیوں کے مکین ہزارہا افراد بھی ہلاک ہوگئے تھے۔ اس زلزلے سے تقریباً 5 سو میل وسیع علاقہ تاراج ہو کر رہ گیا تھا۔

1989ء میں سائنس پریس بیجنگ نے یونیسکو کی مدد سے چین میں آنے والے زلزلوں پر تجزیے کی ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں 1556ء میں شانکسی میں آنے والے زلزلے کی تفصیلات میں بتایا گیا کہ اس زلزلے کی وجہ سے اس صوبے میں بہنے والے دریاؤں نے اپنے رخ تبدیل کر لیے تھے اور پہاڑوں تک نے اپنی جگہ بدل لی تھی اور اس صوبے کی شاہراہیں مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھیں۔ کئی مقامات پر زمین نے اس شدت سے کروٹ بدلی تھی کہ کئی نئی چٹانیں وجود میں آ گئی تھیں۔ جبکہ انہیں مقامات میں کئی جگہ پر زمین کے نیچے بیٹھ جانے کی وجہ سے نئی وادیاں وجود میں آ گئی تھیں۔

زلزلوں کی کثرت سے آمد کی وجہ سے چین کو بحرالکاہل کے حلقہ آتش فشاں میں واقع مقام کہا جاتا ہے اگرچہ چین میں دنیا کے سب سے زیادہ آتش فشاں واقع نہیں مگر چین میں آنے والا اولین زلزلہ جس کا ریکارڈ تاریخ میں باقاعدہ طور پر ملتا ہے۔ 1831ء قبل از مسیح میں آیا تھا۔ چین کی تاریخ میں بہت سے زلزلے انتہائی شدید کہلاتے ہیں مگر سب سے مہلک زلزلہ 1556ء میں شانکسی میں آنے والے زلزلے کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس زلزلے کے سب سے زیادہ ہلاکت خیز زلزلہ ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ اس صوبے کے گنجان آباد ترین علاقے میں آیا تھا۔ جیسے کہ پہلے ذکر آیا ہے کہ اس علاقے میں بہت سے

لوگ نرم چٹانوں میں بنے ہوئے غاروں میں رہتے تھے ۔یہی لوگ اس زلزلے میں ہلاک ہونے والے 60 فیصد لوگ تھے،مگر صرف غاروں میں رہنے والے ہی نہیں بلکہ شہروں میں رہنے والے لوگ بھی اس زلزلے کا شکار ہوئے تھے۔ ہوا گریان Huaxian نامی شہر کی تقریباً ہر عمارت منہدم ہوجانے سے اس شہر کی آبادی کا نصف حصہ ہلاک ہوگیا تھا۔بہت سے لوگ ان 60 فٹ تک گہری دراڑوں میں گر کر ہلاک ہوگئے جو زلزلے کی وجہ سے زمین میں پڑ گئی تھیں جب کہ لوگ تو دوں کے نیچے دب کر ہلاک ہوگئے۔ ایک چینی مورخ نے لکھا ہے کہ زلزلے کی شدت سے زمین کی سطح اتنی ابھری کہ نئی چٹانیں وجود میں آ گئیں۔ مکانات ،جھونپڑیاں،مندر اور محل بلا امتیاز زمین بوس ہوگئے۔ ایک چینی عالم نے جس کا نام چن کیدا Qin Kedal تھا اس زلزلے کی تباہیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وہ اس زلزلے سے زندہ بچنے والے لوگوں میں سے ایک تھا اس نے لکھا کہ جن لوگوں نے اس زلزلے سے بھاگ کر بچنے کی کوشش کی وہ ان کی بے وقوفی تھی کیونکہ اگر گھونسلہ گر جائے تو پھر بھی کچھ انڈے صحیح وسالم بچ جاتے ہیں۔ زلزلے کے بعد اگلے دن اکثر انسانی آبادیوں کو آگ نے آ گھیرا اور یہ آگ کئی دن تک تباہی مچاتی رہی ۔زلزلے اور آگ کے نتیجے میں بہت سے لوگ کھلے آسمان کے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئے جس کے بعد ڈاکہ زنی اور چوری کی وارداتیں شروع ہوگئیں۔

16 دسمبر 1920ء کو چین کے صوبے گانسو Gansu میں آنے والا زلزلہ 1556ء کے زلزلے سے شدت میں زیادہ تھا یہ ریکٹر اسکیل پر 8.6 تھا جبکہ 1556ء کے زلزلے کو 8.3 بتایا گیا ہے مگر 1920ء کے زلزلے کے بعد کھلے آسمان کے نیچے پناہ لینے والے 20 ہزار افراد مزید ہلاک ہوگئے تھے۔ایک آفت زدہ شخص کے مطابق شاید آسمان سے زمین پر یہ آفت ٹوٹ پڑی تھی۔1556ء کے زلزلے میں بہت سی یادگار عمارتیں بھی تباہ ہوگئی تھیں۔ انہیں میں سے ایک چھوٹا ہنس پیگوڈا تھا جو اگرچہ مکمل طور پر تو تباہ نہیں ہوا تھا مگر اس کی اوپر والی منزل چھ فٹ تک گر گئی تھی۔

چین میں آنے والے مشہور زلزلے مندرجہ ذیل میں دیے گئے ہیں۔

1833 Yunnan 1668 Taucheng 1556 Shanxi 1303 Shanxi

1879 Gansu 1654 Gnsu 1679 Hebei 1604 Fujian

1976 Hebie 1739 Yinchuan 1920 Gansu 1695 Shanxi

1600ء پیرو میں کو ایریکوپا کی آتش فشانی

9فروری1600ء کو براعظم جنوبی امریکہ میں اس وقت تک کی پوری تاریخ عالم کی سب سے بڑی آتش فشانی ہوئی۔ یہ آتش فشانی جنوبی پیرو کے ایک شہر ایریکوپاArequipa کے قریب واقع ایک آتش فشاں کے پھٹنے سے ہوئی تھی۔ اس آتش فشانی کا درجہ6VEI تھا۔ یہ اسی درجہ کی آتش فشانی تھی جتنی شمالی نصف کرہ میں کراکاٹو نامی آتش فشانی کے 1883ء میں پھٹنے سے جاوا انڈونیشیا میں ہوئی تھی۔ایسی آتش فشانی کو سائنسی اصطلاح میںPlinian کہتے ہیں۔ اس آتش فشانی اصطلاح سے مراد ایسی آتش فشانی ہے جس میں راکھ ،پتھر اور دھواں پوری طاقت سے آتش فشاں کے دہانے سے نکل کر زمین کی فضاء میں بکھریں اور کم از کم 25 میل کی بلندی تک پہنچیں۔

کوہ ایریکوپا کے اردگرد15 میل میں واقع ہر چیز اسی آتش فشاں طاقت کی وجہ سے تباہ ہوگئی تھی۔ پیرو کے ہمسایہ ممالک چلی اور بولیویا کی فضاؤں میں راکھ کے بادل چھاگئے تھے اور ایسا ہی کچھ پیرو کے دارالحکومت لیماLimaمیں ہوا تھا۔ آتش فشاں کے دہانے سے ابلنے والے لاوے کے دریا اور پتھروں سے بہت سے انسانی آبادیاں79ء میں پومپیائی کی طرح تباہ وبرباد ہوگئیں۔

یاد رہے کہ ایسی آتش فشانی کو پلینینPlinian کی اصطلاح بھی پومپیائی کی تباہی کے دوران ہلاک ہوجانے والے رومی مورخ پلینی کلانPliny The Elder کے اعزاز میں ہی دی گئی ہے۔1600ء میں پیرو میں ہونے والی اس آتش فشانی سے اس ملک کے تمام ندی نالے اور جھیلیں بھی متاثر ہوئی تھیں کیونکہ ایک بڑی مقدار میں لاوا اور پتھر ان میں آگرے تھے۔ تجارتی ذرائع اور ملکی پیداوار کو بھی شدید نقصان پہنچا تھا جس کی وجہ سے 1600ء میں پیرو میں نوع انسانی کا زندہ رہنا دشوار ہوگیا تھا۔ کیونکہ نوع انسانی کی بقا کا انحصار زیادہ سے زیادہ زمین کے سینے سے نکلنے والی اشیاء پر تھا،تاہم اس صورت حال پر بڑی سرعت سے قابو پالیا گیا تھا۔ ایریکوپا کو بھی بہت جلد دوبارہ تعمیر کرلیا گیا تھا۔ زرعی سرگرمیاں بھی بہت جلد اس آفت کی آمد سے پہلے معیار کو پہنچ گئیں جس سے اس علاقے میں قحط پڑنے کا خطرہ دور ہوگیا تھا۔پیرو کی اس آتش فشانی سے پورے کرہ ارض کی آب وہوا متاثر ہوئی تھی ۔کچھ سائنسدانوں کے بمطابق گزشتہ پانسو سال میں 1601ء میں موسم گرما کا درجہ حرارت سب سے کم رہا تھا اور یہ کرہ ارض پر سرد ترین موسم

گرما تھا۔

آتش فشانی کے بعد اس علاقہ کو زلزلے کے جھٹکوں نے گھیر لیا۔زلزلے اس علاقہ میں آتش فشانی سے 5دن پہلے آنے شروع ہوگئے تھے ۔15فروری1600ء میں باقاعدہ طور پر زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے جانے لگے تھے۔18فروری کو رات کو ان کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ 19فروری یعنی آتش فشانی کے دن سب سے پہلے ایک دھماکہ سنائی دیا گیا جو کسی توپ کے گولے کے پھٹنے کی طرح کا تھا پھر آتش فشاں کا دہانہ آگ اگلنے لگا جس سے اس علاقے کا ہر ذی روح خوفزدہ ہوگیا۔ دھماکے کی آواز سنائی دینے کے ایک گھنٹہ بعد یہ پورا علاقہ آسمان پر راکھ کے بادل چھا جانے کی وجہ سے تاریکی میں ڈوب گیا اور زمین پر آتش فشاں سے پتھروں اور لاوے کی بارش ہونے لگی۔20اپریل 1600ء تک یہ کیفیت جاری رہی اور آتش فشانی کے بند ہوجانے تک قیامت کا سماں رہا۔ آتش فشاں سے ابلنے والا لاوا انتہائی رفتار کے ساتھ بہنے لگا اور دریا کی شکل اختیار کرگیا جس کے راستے میں آنے والے ڈیم اور دوسری تمام اشیاء خس وخاشاک کی طرح بہہ گئیں۔ جب لاوے کا یہ دریا پہاڑی ڈھلوانوں پر سے وادیوں میں گرا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی اور سطح زمین پر کچھ باقی نہیں بچا۔ آسماں سے برسنے والے پتھر اس سے بھی زیادہ خطرناک تھے جس ذی روح پر گرتے وہ وہیں ڈھیر ہوجاتا۔ اس قصبے کے ایک ہزار باشندوں کا حال یہی ہوا اور وہ بے چارے اس قدرتی آفت سے بچ کر کہیں نہ جاسکے۔

1600ء میں سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ ارضیاتی طور پر آتش فشانی کی وجوہات کا سراغ لگا یا جاسکتا۔ اس علاقے میں رہنے والے ریڈ انڈین اس قدرتی آفت سے بچنے کے لیے جاہلانہ رسموں اورمنتروں کا سہارا لے رہے تھے۔ ان کے نزدیک کلیسا اور اہل کلیسا اہل زمین کو اس قدرتی آفت سے بچانے میں ناکام ہوگئے تھے ۔کچھ ریڈ انڈین اپنے دیوتاؤں کے دربار میں جھکے ہوئے چلا رہے تھے کہ انہیں اس آفت سے بچایا جائے مگر ان کے انسانی قربانیاں پیش کرنے کے باوجود یہ آفت نہ ٹل سکی۔ پیرو کے ساحلوں کے قریب سفر کرنے والے بحری جہازوں کی رپورٹ کے مطابق آتش فشاں راکھ کم از کم ایک ہزار میل کی دوری تک آسمان سے گرتی ہوئی نظر آئی۔ بولیوا اور چلی کی سرحدیں ایریکویپا کے نزدیک واقع تھیں لہٰذا ان دونوں ملکوں کے سرحدی علاقے پیرو کے بعد سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔1600ء کے بعد اسی علاقے میں ایک بڑا زلزلہ 1748ء میں آیا تھا جس میں اس قصبے کی تمام عمارتیں منہدم ہوگئیں تھیں۔

1665ء.....لندن میں ''سیاہ موت'' کی واپسی

کوئی نہیں جان سکا کہ 1300ء کی دہائیوں میں مشرقی سائبریا میں گلٹی دار طاعون کی وباء کیوں اور کیسے پھیلی تھی ؟ اور کیوں کر وہاں سے مغربی یورپ تک پہنچ گئی تھی ۔بعد کے زمانے میں ہونے والی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ وباء چوہوں کی جلد سے چمٹے ہوئے پسوؤں کی وجہ سے پھیلی تھی۔ اس بیماری کے جراثیم زدہ پسوؤں والے چوہے پھیلاتے جب مرجاتے تو یہ وائرس ان پسوؤں کے ذریعے سے انسانوں تک پہنچ جاتے اور انسان اس بیماری کا شکار ہوجاتے تھے۔1347ء میں ایک بحری جہاز جو بحرہ اسود کی ایک بندر گاہ سے روانہ ہوا تھا ۔ایسی حالت میں میسینا،اٹلی پہنچا کہ اس پر سوار ہر ذی روح مرچکا تھا۔تاہم یہ ظاہر تھا کہ اس جہاز کے عملے میں سے کچھ نہ کچھ لوگ زندہ تھے جو اس جہاز کو میسیانا کی بندر گاہ تک لے آئے تھے مگر جہاز کے بندر گاہ میں پہنچتے پہنچتے وہ دم توڑ گئے تھے۔بندر گاہ کے منتظمین نے جب اس جہاز کا معائنہ کیا اور جہاز کی حالت کا پتہ چلا تو انہوں نے اس جہاز کو بندر گاہ سے نکال دیا مگر اس وقت دیر ہوچکی تھی اور میسینا کے کافی شہریوں کو جہاز کے ساتھ آئی وباء متاثر کرچکی تھے ۔اٹلی کے اسی شہر سے طاعون کی وباء پورے براعظم یورپ اور رود بار انگلستان عبور کرکے ایک سال بعد لندن تک پہنچ گئی تھی اور1348ء میں اس وبا نے لندن کی آدھی آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کے بعد اگلی صدیوں میں بھی کئی بار یہ وباء انگلستان کے شہروں میں پھوٹ نکلی مگر 1665ء میں لندن میں جو ''سیاہ موت'' واپس آئی اس کے سامنے 1348ء اور بعد کے تمام صدیوں میں پھیلنے والی وبائیں ہیچ تھیں۔

1663ء میں یہ وباء ہالینڈ میں نمو دار ہوئی تو لندن کے حکام نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح یہ وباء لندن کی گلیوں تک نہ پہنچے مگر ناکام رہے اور آخر کار 7جون1665ء کے گرم دن ایک مورخ پیپی Pepys کے مطابق اس نے لندن میں کچھ ایسے گھر دیکھے جن کی دروازوں پر وباء زدہ ہونے کا سرخ نشان لگا ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ دعائیہ کلمات بھی تحریر کیے گئے تھے ''خدا ان پر رحم کرے'' وباء کے شدت اختیار کرنے کے بعد شاہ انگلستان چارلس دوم اور اس کا دربار لندن سے باہر کسی دوسری جگہ منتقل کردیا گیا مگر لندن کے لارڈ میئر نے شہر میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تاہم اس نے احتیاطاً ایک شیشے کا کمرہ بنوایا تا کہ شہر کے انتظامی امور کی نگہداشت کرسکے اور شیشے کے پیچھے سے ہی لوگوں سے ملاقات کرسکے۔ تاہم

پپی نے بھی شہر چھوڑنے کا فیصلہ نہ کیا اور اپنی جائیداد اور دیگر اشیاء کا انتظام کر کے اس نے اپنے بیوی اور بچوں کو لندن سے باہر بھجوادیا۔

جولائی 1665ء کے آغاز تک لندن کی گلیوں میں لاشیں اٹھانے والی گاریاں بار بار گھومنے لگیں۔ ایک موقع پر لندن کی انتظامیہ گندے پانی کی نکاسی کی تمام ہودیوں کے منہ کھول دیے کہ شاید ان سے پھیلنے والی بد بو ہی وباء میں کمی کردے مگر اگست میں وباء نے اور زور پکڑ لیا اور لندن ایک آسیب زدہ قصبہ بن گیا۔ وباء کے ان دنوں کی روئیداد لکھنے والا ایک اور مصنف جان ایولین John Evelyn درد بھرے الفاظ میں لکھتا ہے کہ ان دنوں لندن کی گلیوں پر موت کی خاموشی طاری تھی جبکہ دوسرا مورخ پپی لکھتا ہے کہ لندن کی گلیاں انسانوں سے خالی ہوچکی تھیں اور شہر کی ہر تیسری دکان بند ہوچکی تھی ۔ ایک راہب تھامس ونسنٹ لکھتا ہے کہ لندن کے شہریوں کی حالت کمزوری میں خزاں کے پتوں جیسی لرزیدہ ہوچکی تھی ۔شہر میں پیدائش کا عمل تقریباً بند ہوچکا تھا جبکہ موت کا عمل جاری وساری تھا۔ اس راہب نے اپنے کمزور گھوڑے پر سوار ہوکر لندن کے تقریباً ہر گھر کا جائزہ لینے کے بعد یہ تجزیہ کیا تھا۔

ستمبر 1665ء لندن کی تاریخ کا سب سے تاریک مہینہ تھا اور وباء کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ مورخ پپی کے مطابق اب شہر کی گلیوں میں غربا گھومتے نظر آتے تھے ۔شہر کی سب سے بارونق شاہرہ لمبارڈ سٹریٹ Lombard Street جہاں ہمہ وقت رونق رہتی تھی اور یہ لندن کی مصروف ترین شاہرہ تھی ۔اب پپی کو اس شاہرہ پر صرف 20 آدمی ملے تھے ۔لندن کی گلیوں میں ویرانی کا راج ہوچکا تھا اور جابجا گھاس اگی ہوئی تھی ۔ ہر طرف سے صرف یہ آوازیں سنائی دیتی تھیں کہ ''وہ آدمی مرچکا ہے اور یہ آدمی بیمار ہے'' کتنے ہی اس محلے میں بیمار پڑے ہوئے ہیں اور کتنے ہی اس محلے میں۔ جب شہر کے تابوت ساز تابوتوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا نہ کرسکے تو لاشیں صرف کفن میں دفنائی جانے لگیں اور پھر جب شہر میں کفنوں کے لیے بھی کپڑا باقی نہیں بچا تو لاشیں بے گوروکفن ڈھیر کی جانے لگیں۔ تیمارداری کرنے والے مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کی بجائے انہیں لوٹنے لگے ۔عطاروں اور طبیبوں پر الزام تھا کہ وہ دوا دینے کی بجائے مریضوں کے گھروں کا صفایا کرنے کے لیے مریضوں کا گلا گھونٹ کر مار دیتے تھے۔

پپی کے مطابق طاعون نے لوگوں کو کتوں کی طرح ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا۔ موت ہر طرف پھیلنے سے گرجا گھروں سے گھنٹیوں کی آوازیں آنا بند ہوچکی تھیں۔ لاشیں اٹھانے والی گاریاں شہر کی گلیوں میں آوازیں دیتی پھرتی تھیں کہ ''اپنے مردے اٹھالاؤ'' ان حالات میں بعض افراد کو نیم مردہ حالت میں ان کی قیمتی اشیاء چھین کر ان گاڑیوں میں پھینک دیا جاتا تھا۔ بعض شیطان صفت افراد اس نیم مردہ حالت میں بھی خواتین کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا دیتے تھے۔

نومبر تک آخر کار یہ وباء کا طوفان تھمنے لگا۔ 24 نومبر کو پیپی لکھتا ہے کہ اس نے ایک گھونگے فروخت کرنے والی دکان سے خرید وفروخت کی اور اس دکاندار کو اس وباء میں مبتلا ہو کر زندہ بچا پایا۔ ایک رونیداد لکھنے والے نے اس سال کرسمس کے دن کافی عرصے کے بعد لندن میں شادی کی تقریب رونما ہوتے دیکھی تو وہ اسے زندگی کی علامت کی بحالی سمجھ کر بہت مسرور ہوا۔ جنوری کے آغاز میں حالات بہت بہتر ہوگئے تو پیپی کے بیوی بچے واپس آ گئے مگر لندن کی پانچ لاکھ کی آبادی میں سے تقریباً ایک لاکھ افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ تاہم لندن میں شدید طور پر پھیلنے والی یہ مہلک وباء دیہاتوں میں اس شدت سے نہیں پھیلی تھی مگر بعض علاقوں میں اس نے نصف آبادی اور بعض علاقوں کی ایک تہائی آبادی کو تہس نہس کر دیا۔ اسی طرح لندن میں پھیلنے والی یہ مہلک وباء مغربی یورپ میں بھی شدت سے نہیں پھیلی۔

1720ء میں ایک بحری جہاز شام سے مارسلیز پہنچا تو اس میں کئی طاعون کے مریض بھی سوار تھے۔ اس جہاز پر ریشم اور کپاس لدی ہوئی تھی جو اس زمانے میں یورپ یں مہنگی ترین اشیاء میں شامل تھیں۔ اس جہاز کے مالک تاجروں نے اپنے اثر رسوخ سے کام لے کر تجارتی جہازوں پر لگی ہوئی قرنطیہ کی پابندیاں ختم کرادیں جس کے بعد جلد ہی اس شہر کو طاعون کی وباء نے تاراج کر دیا اور تقریباً پچاس ہزار افراد جاں بحق ہوگئے جو اس شہر کی آبادی کا نصف تھے۔ جبکہ مزید پچاس ہزار اس شہر کے ارد گرد کی آبادیوں میں مارے گئے۔ جب اس وباء نے شدت اختیار کی تو یہ ماسکو تک پہنچ گئی اور 1771ء میں ماسکو میں تقریباً دو لاکھ افراد اس کی نذر ہوگئے۔

انیسویں صدی میں 1855ء چین کے صوبے میں مورخین کے مطابق تیسری مرتبہ یہ مہلک وباء پھیلی۔ ابتداء میں اس نے شدت اختیار نہیں کی البتہ 1894ء میں جب یہ چین کے شہر کینٹن Canton پہنچی تو اس نے صرف چند ہفتوں میں 60 ہزار سے زائد افراد ہلاک کر دیے۔ پھر ہانگ کانگ میں اس وباء سے ایک لاکھ سے زائد چینی النسل افراد ہلاک ہوگئے۔ طب نے انیسویں صدی کے آخر تک اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ اس وباء پر قابو پایا جا سکے۔ کہیں جا کر 1898ء میں ایک فرانسیسی طبیب نے اپنی تحقیق سے پتہ چلایا کہ یہ بیماری کالے چوہوں کی جلد سے چمٹے ہوئے پسوؤں سے پھیلتی ہے۔ ہندوستان میں یہ بیماری 1896ء میں پھیلی تھی۔ 1903ء تک اس بیماری سے لاکھوں افراد ہلاک ہوگئے تھے۔

1618ء..... یورپ میں تیس سالہ جنگ کی مصیبتیں

23 مئی 1618ء کو پروٹسٹنٹ فرقے کے عیسائیوں کا ایک بڑا ہجوم بوہیمیا Bohemia کے دارالحکومت پراگ کے شاہی قلعے میں داخل ہوگیا اور اس نے شاہ بوہیمیا کے تین مصاحبوں کو پکڑ کر دریچے سے نیچے گرا دیا۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی بھس میں گرنے کی وجہ سے زخمی نہ ہوا مگر کھڑکی سے پھینکنے کا پراگ کا یہ واقع یورپ میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک افواج کی تیس سالہ جنگ اور اموات اور تباہی کا باعث بنا۔ اس واقعہ کی تہہ میں مذہبی جذبات کا رفرما تھے۔ جرمن ریاست بوہیمیا کی آبادی کا بڑا حصہ اگرچہ پروٹسٹنٹ تھا مگر اس ریاست پر ایک کیتھولک ہیپسبرگ بادشاہ کی حکومت تھی۔ ہیپسبرگ شاہی خاندان اگرچہ تاریخی طور پر پروٹسٹنٹ رعایا کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتا تھا تاہم اس خاندان کے ایک نئے بادشاہ فرڈیننڈ نے پروٹسٹنٹ فرقے کے خلاف کارروائیاں شروع کردیں تھیں۔ اب کھڑکی سے پھینک دینے والے اس واقعے کے بعد بوہیمیا کے پروٹسٹنٹ کیتھولک ہمسائے ''آسٹریا'' کو تاراج کرنے پر تل گئے۔ خود پراگ بھی جلد ہی مصیبت میں مبتلا ہوگیا اور شاہ فرڈیننڈ کو معزول کرکے تاج ایک پروٹسٹنٹ بادشاہ فریڈرک کے سر پر رکھ دیا گیا۔ مگر 1620ء میں کیتھولک افواج نے پراگ پر حملہ کردیا اور پورے ایک ہفتے تک اس کو لوٹتی رہیں۔

تیس سالہ جنگ یورپ کے ایک وسیع علاقے میں لڑی گئی جس میں آج کا جرمنی آسٹریا، جمہوریہ چیکوسلواکیہ، سوئٹزرلینڈ، لکسمبرگ، نیدرلینڈ، فرانس اور پولینڈ کے کچھ حصے بھی شامل تھے۔ اس زمانے میں یہ ہالی رومن ایمپائر کہلاتے تھے۔ فرانس کے مشہور فلسفی اور مصنف والٹیر کے الفاظ میں نہ یہ سلطنت ہالی Holy تھی نہ ہی اسے رومن کہا جاسکتا تھا بلکہ یہ تو سرے سے سلطنت ہی نہ تھی۔ اس کا شہنشاہ منتخب کیا جاتا تھا اور یہ سینکڑوں ایک دوسرے کے ہمسر شہروں اور ریاستوں میں منقسم تھی۔ ایک صدی پہلے جو شہر اس سلطنت کے وفادار تھے ان میں بھی اور جو شہر اس سے منحرف ہوچکے ان میں بھی تحریک اصلاح کلیسیا سے مذہبی چشمک ابھری تھی۔

تیس سالہ جنگ لڑنے والے سپاہی زیادہ تر کرائے کے گوریلے تھے جو ان کے کمانڈروں نے کرائے پر حاصل کیے ہوئے تھے۔ ان کمانڈروں میں سے ایک ارنسٹ وان مینسفیلڈ تھا۔ اس کے نام کا بڑا شہرہ تھا، کہ جہاں مینسفیلڈ آجائے وہاں کے لوگوں کا خدا حافظ۔ 1620ء کے موسم سرما میں اس کمانڈر

کی فوج فریڈرک آف بوہیمیا کی اتحادی فوج تصور کی جاتی تھی ۔ یہ السا س لورین کے علاقوں تک پیش قدمی کرتی چلی گئی تھی اور اپنے ساتھ طاعون اور ٹائیفس بخار کے جراثیم پھیلاتی چلی تھی۔ اس فوج کا ایک اصول یہ تھا کہ جو چیز یہ لوٹ نہ سکتے تھے اسے جلا کر خاکستر کردیتے تھے۔ شہر ہیگی ناؤhagenau کے ارد گرد 15 میل کے علاقے میں اس فوج نے تقریباً ہر گھر کو آگ لگا دی تھی صرف تین ہفتے کی عسکری کارروائی میں انہوں نے تیس سے زائد گاؤں تاراج کردیے تھے ۔ ایک انگریز کرائے کے گوریلے نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ جب ایک گاؤں کے لوگوں نے ہمیں رہنے کے لیے جگہ نہ دی تو ہم نے ان کے گھروں میں گھس کر ہر مرد وزن کو قتل کردیا یہ قتل عام دو گھنٹے تک جاری رہا جبکہ اس گاؤں میں لوٹ مار دو دن تک جاری رہی۔

اس مذہبی جنگ میں جہاں پروٹسٹنٹ فوجوں نے ظلم و بربریت کا بازار گرم کیا وہیں کیتھولک فوجیں بھی پیچھے نہ رہیں۔ 1624ء میں کیتھولک لیگ کی فوجوں نے ہلڈشیم Hildesheim کے قصبے کو بری طرح تاراج کیا ۔ یہاں تک کہ مال و دولت کے ساتھ خواتین کو بھی ہتھیا لیا گیا ۔ جو مویشی وہ ہانک کر نہ لے جاسکے انہیں وہیں ذبح کرکے کھالیا گیا۔ پروٹسٹنٹ گرجا گھروں کو تباہ کردیا گیا ۔قبرستان تک کو کھود ڈالا گیا۔ دہقانوں کو محض اس بنا پر گولی مار دی گئی کہ انہوں نے اپنا مال ومتاع کہیں جنگل میں چھپا دیا تھا۔ غرض کیتھولک چنگیز خاں کے مظالم کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ۔ جب کوئی دہقان یا پادری کسی بات پر احتجاج کرتا تو اس کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے اور اس کو قربان گاہ پر تڑپتا چھوڑ دیا جاتا۔ انتہا کرتے ہوئے کیتھولک افواج نے ایسی خانقاہ ہیں تک لوٹ لیں جن میں راہبات رہتیں تھیں۔ اس لوٹ مار اور عسکری تاراجی کے بعد ان علاقوں میں فصلیں نہ ہوسکیں اور یہ قحط ووباء زدہ علاقے قرار پائے۔

تیس سالہ جنگ میں سب سے زیادہ قیامت مگڈبرگ پر ٹوٹی یہ شہر ''کنوارہ شہر'' Virgean City کہلاتا تھا۔ اس شہر کے دروازے پر ایک کنواری دوشیزہ کا مجسمہ نصب تھا۔ اس شہر کی تمام تر آبادی پروٹسٹنٹ تھی۔ 1631ء میں اس شہر نے کیتھولک فوج کے کمانڈر وان ٹلی Von Tilly کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کیتھولک فوج نے چھ ماہ سے اس شہر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اس کیتھولک فوج نے امان دینے کے بعد اس شہر میں اتنا قتل عام کیا کہ بچوں اور بوڑھوں تک کو نہ چھوڑا گیا۔ بیویوں کی ان کے خاندوں کے سامنے اور بیٹیوں کی ان کے والدین کے قدموں میں آبرو ریزی کی گئی۔ کم از کم 30 ہزار انسان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ آج انسانی اقدار کے علمبردار مغربی یورپی مسیحی ممالک کا ظلم و بربریت سے لبریز یہ ماضی ہے۔ جبکہ ماضی کے یہ دہشت گرد آج مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام لگاتے ہیں۔

1640ء.....چین میں مانچو خاندان کی خونریز فتح

یورپ میں جن دنوں تیس سالہ جنگ شہروں کو تاراج کررہی تھی ۔ ایسا ہی ہی تباہ کن واقعہ چین میں بھی پیش آیا۔ سترھویں صدی کی دوسری دہائی میں منگ سلطنت شمال مشرقی چین کے بڑے حصے پر کنٹرول کھوچکی تھی۔ ایک مانچو سردار جس کا نام نرہاچیNurhaci تھا۔ ایک علیحدہ سلطنت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کررہا تھا۔ آخر اس نے منگ خاندان کی جگہ چنگ Qing خاندان کی حکومت قائم کردی تھی۔ نرہاچی نے جب چین کے قصبے سنگ ہاؤTsing ho پر قبضہ کیا تو اس نے تقریباً20ہزار افراد کا قتل عام کیا۔ اسی طرح اس کے بیٹے نے ینگ ژو شہر کو فتح کرنے کے بعد اپنی افواج کو قتل وغارت کی کھلی اجازت دے دی۔ صرف پانچ دن میں اس کی فوجوں نے تقریباً80ہزارافراد کو قتل کردیا جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔

مانچو فاتحین کے مظالم کا اتنا شہرہ تھا کہ مفتوح شہروں میں بہت سے لوگ صرف ان کا نام سن کر خود کشی کرلیتے تھے۔ جب ایک منگ شاہی افسر کی بیوی نے سنا کہ اس کے خاوند کو مانچو فوج نے گرفتار کرلیا ہے تو وہ اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ اس نے اپنے عزیزوں کے ساتھ خودکشی کرلی۔ادھر اس منگ شاہی افسر نے اپنی وفاداری تبدیل کرکے اپنی زندگی بچالی۔

ان ہی دنوں لی ذی چنگLi-Zeching نامی ایک شخص چین میں منظر عام پر آیا۔ اس نے ڈاکہ زنی سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ بعد ازاں اس کے 10لاکھ سے زائد افراد ساتھی بن گئے اور وہ ایک فاتح بن کر ابھرا۔1640ء میں اس نے ہونانHonan کو فتح کیا اور اس شہر کے شہریوں کو اپنے غیظ وغضب کا شکار بنایا۔ اس کے دو سال بعد جب وہ کیفنگKaifing شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس شہر کا قلعہ چین بھر میں مضبوط ترین قلعہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس شہر کے گورنر نے دریائے زرد کے پشتے توڑ دیے جس کے بعد اس دریا کا پانی لی ذی چنگ کے فوجی کیمپ میں گھس گیا ۔ جس سے اس کے بہت سے سپاہی ڈوب کر مر گئے۔ مگر پھر اچانک دریا کے پانی کا رخ اس شہر کی فصیلوں کی طرف ہوگیا اور فصیلیں بہہ جانے کے بعد اس شہر کے بے شمار شہری اس دریا کے پانیوں میں بہہ گئے۔ جن شہریوں نے بچ نکلنے کی کوشش کی وہ باغیوں نے تہہ تیغ کردیے۔ جو باقی بچے وہ قحط وبھوک اور وبائی امراض کے پھیلنے سے

ہلاک ہوگئے۔ اس طرح 300000 سے زائد افراد جو اس شہر کی آدھی کے قریب آبادی تھے ہلاک ہوگئے۔ جس کے بعد کیفنگ دوبارہ کبھی اپنے اس عروج کو نہ پہنچ سکا۔

اب یہ سابقہ ڈکیٹ چین کے بڑے حصے کے سیاہ وسفید کا مالک بن گیا تو اس سے شہنشاہ یونگ چینگ کا لقب اختیار کرلیا۔ پھر جب 1644ء میں اس نے بیجنگ کا محاصرہ کیا تو منگ خاندان کے آخری شہنشاہ نے گلے میں پھندہ ڈال کر خودکشی کرلی اور لی نے بیجنگ فتح کرلیا۔ مگر اس کی یہ فتح بہت کم عرصہ کیونکہ منگ خاندان کی باقی ماندہ فوجوں اور اس کے مخالف مانچو سرداروں نے اتحاد کرکے اسے شکست دے کر قتل کردیا۔

چین میں اس کے بعد ہر طرف انارکی Anarchy پھیل گئی۔ نیا مانچو شہنشاہ اپنی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کرنے میں مصروف تھا۔ مگر ہر طرف بغاوت کا راج تھا۔ Szchuan نامی شہر میں ایک باغی نے خود کو شاہ مغرب کا لقب دے کر اپنی حکومت کا اعلان کردیا۔ خود کو آرٹ وفنون کا سرپرست قرار دے کر اس نے اس زمانے میں 30000 سے زائد چینی ماہرین فنون کو اپنے دارالحکومت میں آنے کی دعوت دی۔ تاکہ اس کے لیے کام کرسکیں۔ مگر ان کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک کرتے ہوئے انہیں قتل کروادیا۔ اس کے غصہ کا یہ عالم تھا کہ جب اس کے ایک درباری نے ایک غلط لقب اختیار کیا تو اس نے غصے میں آکر 3000 افراد قتل کروادیے۔ اس کے عہد کا سب سے مغضوب واقعہ چینٹو کا قتل عام Massacre of Chentu ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قتل عام میں اس نے 6 لاکھ انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کروادیا تھا۔ جب اس باغی شہنشاہ کو پتہ چلا کہ ایک مانچو فوج اس کے تعاقب میں ہے تو اس نے اپنے کیمپ کی 4 لاکھ خواتین کو قتل کروادیا۔ پھر جب مانچو فوج نے سی وانگ، شاہ مغرب کی فوج پر حملہ کیا تو ایک تیر خود سی وانگ کو لگا اور وہ مارا گیا۔ مانچو افواج نے جلد ہی Szchuan پر قبضہ کرلیا اور کینٹن کو تاراج کرکے رکھ دیا۔ اس فتح کے بعد مانچو خاندان اپنی سلطنت کو قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا مگر اس سارے جنگ وجدل میں چینی مورخین کے مطابق تقریباً ایک کروڑ یا اس سے زائد افراد مارے گئے جو چین کی اس وقت کی کل آبادی کا چھٹا حصہ تھے۔

1666ء.....لندن میں رونما ہونے والی تاریخی آتشزدگی

اتوار 2 ستمبر 1666ء کو تقریباً رات دو بجے شاہی باورچی کا ایک نائب جو شاہی باورچی کے ساتھ ہی شاہی مطبخ کے بالاخانے پر رہتا تھا۔ اچانک دم گھٹنے سے بیدار ہوا اور اس نے اپنا وہ چھوٹا سا کمرہ دھویں سے بھرا پایا۔ اس نے شاہی باورچی کے اہل خانہ کو بیدار کر کے نیچے کی منزل میں آگ لگنے سے خبردار کیا اور فوراً اس مکان کو چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ اگلے چند لمحوں میں سیڑھیوں سے آگ کے شعلے بالائی منزل کی طرف لپکنے لگے اور یوں بالاخانے سے نیچے اترنے کا راستہ مسدود ہوگیا۔ وہ سب نیچے جانے کی بجائے بالاخانے کی چھت پر چڑھ کر ساتھ والے مکان کی چھت پر اتر گئے اور یوں بحفاظت زمین پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ مگر جیسے ہی یہ آگ ایک گھر سے دوسرے گھر تک پھیلی بہت سے بدقسمت افراد کو اس سے بحفاظت بچ نکلنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ دن کے اختتام تک آگ اتنی پھیل چکی تھی کہ اس پر قابو پانا مشکل ہو چکا تھا۔ان حالات میں سرکاری عملے کی پوری توجہ لوگوں کو آگ سے بچا کر محفوظ مقامات پر منتقل کرنے کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

ازمنہ وسطیٰ کے لندن میں آتشزدگی ایک عام سی بات تھی اور یہ اتنا معمول کے مطابق تھا کہ اس زمانے کے لوگ آگ لگنے کی رپورٹوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے 1666ء کی آتش زدگی پر بھی بڑی دیر کے بعد توجہ دی گئی۔ اسی اثناء میں اگر بروقت امدادی کارروائیاں شروع کر دی جاتیں تو بہت سے لوگوں کی جان بچ سکتی تھی۔ لندن والوں کی آگ لگنے کے اندازوں سے لاپرواہی اس زمانے تک روایتی تھی۔ چونکہ لندن میں ابتدائی دنوں سے متواتر آتش زدگی کے واقعات پیش آ رہے تھے اس لیے لندن والوں کے لیے یہ روزمرہ زندگی کا ایک حصہ تھے۔ لندن میں آتش زدگی کی تاریخ پہلی صدی عیسوی میں رومیوں کے لندن پر قبضے کے وقت سے شروع ہوئی تھی۔ لندن ،سوانعمری .london, Biography میں مشہور سوانح نگار پیٹر اکرائیڈ Peter Ackroyd نے لندن میں آتش زدگی کی ایک سالانہ تقویم مرتب کی ہے جو کچھ یوں ہے کہ 60ء، 125ء 764ء 798ء 852ء 893ء 961ء 982ء 1077ء 1087ء 1132ء 1136ء1203ء1212ء1220ء1227ء اس کے علاوہ1666ء تک کے چار سو سالوں میں بھی متعدد آتش زدگی کے واقعات پیش آئے مگر ان کا صحیح طور پر ریکارڈ نہیں رکھا جاسکا

تھا۔ لندن کے شہریوں کا 1666ء کی آگ سے غفلت برتنا اس وجہ سے بھی تھا کہ ان کے نزدیک
معمول کے مطابق لگنے والی ایک معمولی آگ تھی جس پر جلد ہی قابو پالیا جانا تھا۔ جیسا کہ لندن کے
میئر کو جب خواب خرگوش سے جگا کر اس آگ کی اطلاع دی گئی تو وہ بہت برافروختہ ہوا اور اس نے
کہ اتنی معمولی سی آگ تو کوئی عورت اپنے پیشاب سے بجھا سکتی ہے۔ اس کے بعد وہ اطمینان سے دوبارہ
سوگیا مگر اس آگ کو معمولی سمجھنا لندن والوں کے لیے مہنگا پڑا۔ اور جلد ہی ہوانے اس آگ کو دوسری
جگہوں تک پھیلا دیا۔ لندن کی چوبی فریم والی عمارات نے جلد ہی آگ پکڑ لی اور یوں تیز ہوا سے آگ
تیزی سے پھیل گئی اور آخر پورا شہر اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ شہر کے گوداموں میں شراب، تیل، برانڈی اور
تیزی سے آگ پکڑنے والی کیمیائی اشیاء کے بیرل پھٹنے سے آگ نے مزید شدت اختیار کرلی۔

لوگ آگ سے بچنے کے لیے دریائے ٹیمز کی طرف بھاگنے لگے تا کہ دریا عبور کرکے شعلوں کی
لپیٹ سے محفوظ ہوسکیں۔ دریا ٹیمز کے کشتی رانوں نے اس موقع سے خصوصی فائدہ اٹھایا اور دریا کے اس
پار لے جانے کے معاوضے میں بڑی بڑی رقمیں طلب کیں۔

ایک انگریز مورخ اور سرکاری ملازم، سیموئل پیپس نے لندن میں پھیلنے والی طاعون کی وباء کے احوال
کی طرح 1666ء کی اس آگ کا احوال بھی قلم بند کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ:

''لیفٹیننٹ آف ٹاور آف لندن کے مطابق یہ آگ 2 ستمبر کی صبح پڈنگ لین میں رہنے والے شاہی
باورچیوں کے گھر میں لگی تھی۔ پھر اس آگ نے بڑھ کر سینٹ میگیز کے گرجا گھر اور فش سٹریٹ کے بیشتر
حصے کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کردیا.....لندن کے غرباء اس وقت تک اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے رہے
جب تک یہ آگ ان کے گھروں تک نہیں پہنچ گئی پھر وہ دریائے ٹیمز کی طرف دوڑے۔ لندن کے بیشتر
کبوتر بھی اپنے گھونسلوں کو سر چھپائے بیٹھے رہے یہاں تک کہ آگ نے ان کے گھونسلوں کو جلا دیا جس
سے بہت سے کبوتر بھی گھونسلوں میں جل کر مر گئے۔

لندن میں ان دنوں تک سرکاری طور پر آگ بجھانے کا کوئی شعبہ نہیں تھا۔ تاہم آگ بجھانے کی
بہت سی کوششیں کی گئیں۔ آگ کو پھیلنے سے روکنے کے لیے اس کے راستے میں آنے والے مکانات کو گرا
دیا گیا۔ لوگوں نے رضاکارانہ طور پر اپنے برتنوں سے پانی ڈال کر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کی۔
برطانوی بحریہ نے بھی آگ بجھانے میں حصہ لیا مگر اس کے باوجود اس آگ نے لندن کے
13200 مکانات جلا کر راکھ کردیے۔ لندن کے گرجا گھروں میں سے 109 گرجے بھی اس آگ کی نذر
ہوگئے۔ 400 گلیاں اور شاہراہیں جل کر خاکستر ہوگئیں جس کی وجہ سے ایک لاکھ سے زائد افراد بے گھر
ہوگئے اور لندن کا 1396 ایکڑ گنجان آباد رقبہ تباہ و برباد ہوگیا تاہم اس آگ سے صرف آٹھ افراد ہلاک

ہوئے۔ مگر لندن کا 75 فی صد حصہ تباہ ہوگیا۔

آگ بجھنے کے بعد لندن کی تعمیر نو کا کام شروع ہوا تو سب سے پہلے دنیا کا اولین فائر میونسپل ڈیپارٹمنٹ وجود میں آیا۔ آتش زدگی سے پہنچنے والے مالی نقصانات کے ازالے کے لیے یہ دنیا کی پہلی آگ بیمہ کمپنی قائم کی گئی۔

لندن کے معماروں نے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ایک نیا شہر جس میں خوبصورت پارک شاہراہیں اور دوسری ضروری عمارات موجود تھیں۔ تعمیر کیا مگر باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ لوگوں نے عجلت اور بے صبری سے کام لیتے ہوئے اپنے گھروں کو پرانے لندن کے نقشے پر بغیر کسی منصوبہ بندی کے تعمیر کرلیا۔ جس کی وجہ سے آج کا لندن تعمیری طور پر اتنا ہی غیر منظم ہے جتنا کہ آگ سے پہلے کا پرانا لندن تھا۔

1692ء..... پورٹ رائل جمیکا کا زلزلہ اور سونامی

7 جون 1692ء کو پورٹ رائل، جمیکا میں ایک شدید زلزلہ آیا جس کے بعد آنے والے ایک سونامی نے اسے سمندر میں ڈبو دیا۔ زلزلے کے دوران اس شہر کی تمام بڑی عمارات فوراً ہی زمین بوس ہوگئیں جبکہ چھوٹی عمارات کی بنیادوں میں پانی بھرنے کی وجہ سے وہ ہوا کے زور سے بندرگاہ میں جا گریں۔ سونامی کے شدت اختیار کرنے کے بعد اس دن کے اختتام تک پورے کا پورا شہر سمندر کی موجوں کی نذر ہو کر زیر آب آ گیا جو عمارتیں زلزلے سے بچ گئیں تھے انہیں سونامی کی موجوں نے گھسیٹ کر سمندر میں پہنچا دیا۔ دو ہزار افراد چشم زدن میں لقمہ اجل بن گئے جبکہ مزید دو ہزار افراد زخمی و بیمار ہو کر چل بسے۔ زلزلہ کے دوران شہر کے قبرستان میں پناہ لینے والوں کا حال اس وقت انتہائی خستہ ہوگیا جب سونامی کی آمد کے بعد قبروں سے نکلے تابوت اور انسانی باقیات ان لوگوں کی لاشوں کے ساتھ پانی پر تیرنے لگیں۔ جو اس قبرستان میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اس حالت میں بھی چوروں نے ان کا مال ومتاع چرانے سے گریز نہ کیا اور ان کی امداد کو آنے والوں کو چوروں سے باقاعدہ جنگ لڑنا پڑی۔

آج کے پورٹ رائل کو دیکھ کر بہت کم لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ یہ چھوٹا سا ماہی گیروں کا گاؤں جو ریت کے ایک گڑھے میں مشہور بندرگاہ کنگسٹن قریب واقع ہے ماضی میں بحیرہ کیریبین کی سیاست اور انگلستان پر اتنا اثر رکھتا تھا۔ مگر اس بات کے تمام ثبوت آج کنگسٹن کی بندرگاہ کے پانیوں کے نیچے واقع ہیں اور پورٹ رائل مغربی نصف کرہ کا اولین شہر ہے جو آج زیر آب موجود ہے۔

1655ء میں ایک برطانوی فوج نے حملہ کر کے اسے ہسپانوی قابضین سے چھین لیا تھا جس کے بعد پورٹ رائل کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس شہر نے بہت جلد ترقی کی تھی اور یہ بہت کم مدت میں مغربی نصف کرّے کا امیر ترین شہر بن گیا تھا مگر جتنی جلدی اسے عروج آیا اتنی ہی سرعت سے یہ تباہ و برباد ہوگیا۔ اس زمانے میں یہ زلزلے کی آمد سے پہلے نئی دنیا کا سب سے بڑا برطانوی شہر قرار پایا تھا۔ اس شہر کا ہر سیاح اس کی تعمیرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ اس وقت کے دوسرے اہم برطانوی امریکی شہر بوسٹن کا رقیبے اور اقتصادی امور میں ایک بڑا ہمسر تھا۔

بحیرہ کیریبین کے وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کی تجارتی اہمیت بہت زیادہ تھی اسی وجہ سے

انگریزوں نے اس کو ایک اہم عسکری چھاؤنی اور بحری اڈے کی حیثیت دے دی تھی۔ مگر تجارت کے ساتھ ساتھ انگریز بحری قزاقوں کی لوٹ مار کی دولت نے اس شہر کو بام عروج پر پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

مگر شدید زلزلے کے بعد آنے والے 40 فٹ بلند سونامی نے اس عظیم شہر کو اگلے دو سو سال کے لیے سمندر میں غرق کر دیا۔ اس غرقابی نے آج کے ماہرین اثریات کو اس شہر کی ترقیوں کا پتہ دیا ہے۔ کانسی کی بنی ہوئی ایک گھڑی جو اس شہر کے کھنڈرات سے ماہرین اثریات کو ملی ہے اس کی سوئیاں 11.43 منٹ پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ ماہرین اثریات حیران ہیں کہ پورٹ رائل میں 7 جون 1692ء کو آنے والے زلزلے کا وقت بھی یہی تھا۔ اس زلزلے کو آئے ہوئے دو سو سے زائد سال کا عرصہ گزر چکا ہے یہ گھڑی عین زلزلے کی آمد کے وقت کیونکر ٹھہر گئی تھی؟

ایسی قدرتی آفات و حادثات کے دوران عظیم ترین انسانی جرات اور حوصلہ مندی بھی اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ پورٹ رائل کی بندرگاہ میں کھڑے ایک جہاز سے اس کا مالک عرشے سے سونامی کی تند لہروں میں گر گیا قریب تھا کہ یہ لہریں اس کھینچ کر سمندر برد کر دیتیں کہ اس کے ایک غلام نے انتہائی جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جہاز کے عرشے سے چھلانگ لگا کر اسے بچا لیا مگر وہ اس جدوجہد سے اتنا تھک گیا کہ خود اپنی جان نہ بچا سکا۔ 1692ء تک غلام ایک جائیداد کی حیثیت رکھتے تھے تاہم زلزلے کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال سے غلاموں کے مالک سخت خوفزدہ تھے کہ کہیں ان کے غلام ان کے خلاف بغاوت کر کے ہتھیار نہ اٹھا لیں مگر ان حالات میں بھی وفاداری کی مثالیں سامنے آئیں۔

پورٹ رائل کی دوبارہ تعمیر اس وجہ سے نہ ہو سکی کہ سمندر اور ریت کے گڑھے کے درمیان بہت کم زمین بچی تھی جبکہ کنگسٹن کی آب و ہوا بھی پورٹ رائل کی آب و ہوا جیسی نہیں تھی اور وہاں شرح اموات بہت زیادہ تھی اور نہ ہی بہتر طور پر اس کا دفاع کیا جا سکتا تھا۔ سترھویں صدی میں صرف بادبانی جہاز ایک اہم مواصلاتی ذریعہ تھے اور اکثر ہوائیں کنگسٹن کی موافقت میں نہیں چلتی تھیں۔ اس لیے اس شہر کو دوبارہ آباد نہ کیا جا سکتا۔

1907ء میں ایک بار پھر زیر آب لینڈ سلائیڈز عین اسی مقام پر ایک بار پر وقوع پذیر ہوئیں جس مقام پر 1692ء میں ہوئی تھیں۔ ایک بار پھر سونامی نے اس جزیرہ نما کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس بار ایک ہزار افراد لقمہ اجل بن گئے اور مزید ایک ہزار زخمی اور 90000 افراد بے گھر ہو گئے تھے۔

1700ء.....کیسکیڈیا کا زلزلہ

20 جنوری 1700ء کو ریکٹر اسکیل پر درجہ 9 کا زلزلہ مشہور امریکہ شہر سیٹل Seatle کے قریب سمندر کی تہہ میں آیا۔ اس زلزلے کا محل وقوع ساحل سمندر سے ایک میل دور گہرے سمندر میں تھا جہاں Juan De Fucatu Tonic Plate شمالی امریکہ کی پلیٹ سے ملتی تھی۔

اس زلزلے کے فوراً بعد ایک سونامی سیٹل کی طرف بڑھا یہ شہر زلزلے کے مرکز سے قریب ترین شہر تھا۔ پانی کی ایک بلند دیوار سیٹل کے ساحلی علاقوں کی طرف بڑھی اور اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو خس وخاشاک کی مانند بہا کر لے گئی اور ہر چیز کو تباہ کر گئی۔ 1700ء میں اس علاقہ میں کوئی یورپی آباد کار ابھی آباد نہیں ہوا تھا صرف مقامی ریڈ انڈین یہاں رہتے تھے۔ وہ تاریخ نہیں لکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس قدرتی آفت کا کوئی تحریری ریکارڈ نہیں چھوڑا۔ اس قدرتی آفت کے متعلق ہمیں علم اس وقت ہوا جب 1980ء کی دہائی میں سیٹل کے جنوب میں ایک ایٹمی پاور پلانٹ نصب کیا جا رہا تھا۔ اس پلانٹ کی تنصیب کے مقام پر ایٹمی پاور پلانٹ نصب کرنے والے حکام نے ارضیاتی سروے کرایا جس سے پتہ چل سکے کہ یہ جگہ کہیں زلزلوں کی آماجگاہ تو نہیں رہی۔ جس کا جواب ماہرین ارضیات نے پہلے تو نفی میں دیا کیونکہ اس علاقے پر ریکٹر اسکیل پر 8 یا 9 درجے کا زلزلہ آنے کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔

اس علاقے میں بحر الکاہل اور شمالی امریکہ کی ارضیاتی پرتیں باہم ملتی ہیں مگر یہ علاقہ اس کے باوجود زلزلوں سے محفوظ نظر آتا تھا۔ تاہم جوآن ڈی فو کا نامی ارضیاتی پرت کی حرکت سے 1964ء میں الاسکا میں ایک شدید زلزلہ آیا تھا۔ یہی ارضیاتی پرت سیٹل کے قریب سمندر کی تہہ میں شمالی امریکہ کی ارضیاتی پرت کے نیچے موجود تھیں مگر اس کے اس اتصال کے باوجود اس علاقے میں بڑے زلزلے کیوں نہیں آتے تھے؟ مزید ارضیاتی تحقیق سے پتہ چلا کہ اس علاقے میں 1700ء میں دنیا کا شدید ترین زلزلہ آیا تھا۔ پھر اس بات کے ارضیاتی ثبوت مل گئے کہ اس علاقے میں گزشتہ 6 ہزار سال پہلے 13 بڑے زلزلے آئے تھے جن میں آخری 1700ء کا زلزلہ تھا۔

1703ء.....جزائر برطانیہ میں طوفانِ عظیم

کوئی بھی قلم اسے بیان کرنے سے قاصر ہے ،نا ہی کوئی زبان بھی اس کا اظہار کرسکتی، نا ہی تخیل کی پرواز سے اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ جس نے اس سانحہ کی سختیوں کو خود جھیلا ہو وہی اس کے دکھ کا فہم وادراک رکھ سکتا ہے۔1703ء کے طوفان عظیم کے بارے میں یہ انگریز مصنف ،مورخ ڈینئل ڈیفو کے تاثرات ہیں جو اس عظیم طوفان کے بارے میں لکھے تھے جو1703ء جزائر برطانیہ میں آیا تھا۔ کئی ہفتوں تک انگلینڈ اور ویلز میں زور دار آندھیاں چلتی رہیں اور پھر جمعہ 26 نومبر کی رات کو اتنی شدید اور طوفانی ہوا چلی کہ کارن وال کے ایک پادری کے مطابق لوگ یہ سمجھے کہ شاید قیامت آ گئی ہے۔

پلائی ماؤتھ سے 14 میل دور ناہموار اور ناقابل اعتبار خطرناک ایڈی سٹون راکس Eddy Stone Rocksواقع ہیں۔ پانچ سال پہلے ایک جہاز ران ہنری وسٹینلے نے جس کے دو بحری جہاز ان چٹانوں سے ٹکرا کر ڈوب چکے تھے ۔ ایک مینارہ روشنی جو 120 فٹ بلند تھا۔ ان سے بچنے کے لیے یہاں تعمیر کروادیا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ یہ غیر فانی ہے۔ اس کو یہ امید بھی تھی کہ ایک دن وہ کسی بڑے طوفان کے دوران خود اس مقام پر ہوگا۔ اس کی یہ خواہش بالآخر 26 نومبر کو پوری ہوگئی۔ وہ اس مینارے کی تعمیر کے کام کی دیکھ بھال کررہا تھا کہ 60 فٹ بلند سمندری موجوں نے اس روشنی کے مینارے کو زمین بوس کردیا اور اس کے دوران وسٹینلے اور اس کے پانچ ساتھی ہلاک ہوگئے ۔ اسی دوران لندن میں ڈینئل ڈیفو نے اپنے ہواپیا کو جب دیکھا تو اسے اس کا درجہ اتنا کم محسوس ہوا کہ اس نے سوچا بچوں نے ضرور اس سے چھیڑ خانی کی ہے۔

اس کے ساتھ ہی 70 میل فی گھنٹہ سے چلنے والی طوفانی ہواؤں نے جنوبی ویلز کو ملفورڈ ہیون Milford Heavenسے سیورن اسچورے Severn Esturay تک کے علاقے کو تاراج کردیا۔ اس علاقے میں بہت سے گھروں کی چھتیں اڑ گئیں اور کارڈف Carfiffشہر کی فصیل میں ایک بڑا شگاف پڑ گیا۔ دریا کے دہانے میں پانی دس فٹ اوپر تک چڑھ آیا وہ سیلابی درجے سے بھی بلند تھا۔ ان تیز ہواؤں نے ان علاقوں میں بہت سی عمارات کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کردیا اور بہت سے افراد جاں بحق ہوگئے۔ ایک پادری کے گھر کی چھت پر چمنی کے گرنے سے ویلز کے علاقے میں وہ پادری اور اس کی

بیوی ہلاک ہوگئے۔ وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ ساحلی قصبے جن میں پورٹ ماؤتھ بھی شامل تھا۔ ایسے لگنے لگے تھے جیسے کسی دشمن فوج نے انہیں تاخت وتاراج کیا ہو۔ شورہم Shoreham کی قصبے میں مارکیٹ ہاؤس کی پرانی عمارت زمین بوس ہوگئی اور تمام قصبہ بکھر کر رہ گیا۔ برائیٹن Brighton لگتا تھا جیسے کسی فضائی بمباری کا شکار ہوگیا ہو۔ جبکہ کینٹ Kent کے علاقے میں 1000 سے زائد عمارات زمین بوس ہوگئیں۔

مزید شمال میں اوکسفورڈ شائر کے علاقے میں پانی کے سیلابی ریلوں نے درختوں اور گھاس کے گٹھوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ نارتھامپٹن میں آل سینٹ کے گرجا اور دیگر عمارتوں کو شدید نقصان پہنچا۔ ایک معزز پادری جو ایک سیڑھی پر چڑھ کر اپنے مویشی کے باڑے کی مرمت کر رہا تھا تیز ہوا نے اسے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ وہ ایک کھیت میں جا گرا اور جاں بحق ہوگیا۔ ان علاقوں میں جب ہواؤں نے 120 میل فی گھنٹہ سے زائد کی رفتار اختیار کی تو ہر چیز بشمول غلہ کے گودام اور دیگر شیڈ وغیرہ انسانوں کے ساتھ ساتھ ہوا میں اڑ گئے اور ہر طرف ملبہ بکھر گیا۔

لندن بھی شدید طور پر اس طوفان کے ہاتھوں نقصان زدہ ہوا۔ ایک اخبار Postman کے مطابق لندن کا کوئی گھر یا عمارت ایسی نہ تھی جسے نقصان نہ پہنچا ہو۔ ویسٹ منسٹر کی چھت یوں اڑ گئی جیسی کوئی کپڑے کا ٹکڑا تھا۔ لوگ انتہائی خوفزدہ حالت میں تھے۔ اور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ گھروں کے اندر ٹھہریں یا باہر نکلیں۔ گھروں کے اندر ٹھہرنے سے گھر گرنے کی صورت میں ہلاکت نظر آتی تھی جبکہ شہر کی گلیوں میں عمارات کی چھتوں سے اکھڑنے والی ٹائلیں اور دوسرا عماراتی کچرا 4 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا تھا جس کے لگنے سے انسان کی ہلاکت لازمی تھی۔ ایک بڑھئی اور اس کی بیوی نے گھر کے اندر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ بیوی نے خاوند کو کہا کہ وہ مقدس بائبل کے کسی باب کی قرأت کرے مگر خاوند نے انکار کر دیا۔ اسی اثناء میں مکان کی چمنی گری اور وہ بے چارہ بڑھئی جاں بحق ہوگیا مگر اس کی بیوی معجزاتی طور پر زخمی تک نہ ہوئی۔ سینٹ جیمز کے محل کے کئی حصے گر پڑے اور ملبے میں دب کر ایک عورت ہلاک ہوگئی۔ برطانیہ کی اس وقت کی ملکہ این کو اس طوفان عظیم سے بچنے کے لیے ایک کوٹھڑی میں پناہ لینا پڑی۔ تیز ہواؤں نے مشہور زمانہ لندن برج کی محرابوں کو کچرے سے اٹ کر رکھ دیا۔ دریا ٹیمز میں کھڑی ہوئی کشتیاں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئیں۔ ڈیفو نے لکھا ہے کہ اس نے تقریباً 700 بحری جہازوں کو دریائے ٹیمز میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے دیکھا جبکہ 20 جہازی اس طوفان کے دوران ڈوب کر ہلاک ہوگئے۔ ڈیفو خود بھی ہلاک ہونے والے لوگوں کی فہرست میں شامل ہونے سے اس وقت بال بال بچا جب اس کے قریب ایک مکان کی چمنی آ گری تھی۔ یوں زندہ بچ کر اسے اس طوفان عظیم کے تذکرہ نگار اور چشم دید گواہ

کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

صرف ڈیفو ہی اس طوفان سے معجزاتی طور پر بچنے والوں میں نہیں تھا۔ ایک اور گھر کی چمنی گرنے سے اس گھر میں نوکرانی اور ایک بچوں کی آیا ایک بچے سمیت تین منزل نیچے آ گری۔ نوکرانی اور آیا کو تو معمولی خراشیں آئیں جبکہ وہ بچہ ایک پردے میں الجھ جانے کی وجہ سے بالکل محفوظ رہا۔ ہائی برج کے علاقے میں پانی چڑھ آنے کی وجہ سے ایک میاں اور بیوی اپنے ہی گھر میں ڈوب گئے تاہم انکا بچہ اپنے گہوارے سمیت پانی کی سطح پر تیرنے کی وجہ سے بچ گیا۔ خشکی پر ایک طوفان سے 25 افراد ہلاک ہوئے جبکہ سمندر میں ہونے والے مالی وجانی نقصانات بڑے شدید تھے۔

کئی بندرگاہیں اس شدید موسم سے پناہ لینے والے جہازوں سے بھری ہوئی تھیں جبکہ بہت سے بحری جہاز بندرگاہوں سے باہر ہی لنگرانداز ہونے پر مجبور تھے۔ ان میں وہ جہاز بھی شامل تھے جو فرانسیسی بحریہ کے خلاف موسم گرما کی عسکری مہمات سے تازہ تازہ لوٹے تھے۔ اگرچہ برطانوی شہری بحری جہازوں سے خوب آشنا تھے مگر کئی شہریوں کے مطابق انہوں نے اپنی زندگی میں اتنے بحری جہاز کبھی اکٹھے نہیں دیکھے تھے۔ بہت سے بحری جہاز اس طوفان کے دوران گم بھی ہوگئے اور پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔

ڈیفو نے اس طوفان کی کہانیاں ہی بیان نہیں کیں بلکہ اس نے اس طوفان سے پہنچنے والے نقصانات کا بھی گوشوارہ مرتب کیا تھا۔ کینٹ کے علاقے کا سفر کرکے اس نے ان درختوں کی تعداد معلوم کی جو اس طوفان کا شکار ہوگئے تھے۔ ان کی تعداد نے 1700 بتائی ہے۔ خشکی پر 25 میل کے اندر جو کھیت کھڑے تھے وہ سمندر کے طوفانی پانی سے خراب ہوگئے اور ان میں کھڑی فصل کو جانداروں نے بھی کھانے سے انکار کردیا۔

ملکہ این نے اپنے عوام کو دو اہم نکات بتانے پر زور دیا، اول یہ کہ یہ طوفان لوگوں کے گناہوں کا نتیجہ تھا، دوم یہ کہ برطانیہ کے لوگ خوش قسمت ہیں ورنہ بصورت دیگر اس سے بھی شدید طوفان ان پر مسلط کیا جاسکتا تھا۔ ملکہ این نے اعلان کیا کہ 19 جنوری 1704ء کو برطانیہ کے لوگ روزہ رکھیں۔ اس شکرانے کے طور پر کہ خدا نے انہیں اتنے شدید طوفان سے نجات دی۔

1775ء.....لزبن میں یورپ کا
سب سے بڑا تباہ کن زلزلہ اور سونامی

یکم نومبر 1775ء کو جب پرتگال کے دارالحکومت لزبن میں تمام ولیون کا دن All saints Day منایا جارہا تھا۔ ایک شدید زلزلے نے اس شہر کی بہت سی عمارات کو ہلا کر رکھ دیا۔ بہت سے گرجا گھر، دوکانیں، زمین بوس ہوگئے۔ ایک چشم دید گواہ پادری چارلس ڈیوی لکھتا ہے۔ اس دن لزبن پر سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ صبح کے دس بجنے میں ابھی دس منٹ تھے وہ ایک خط لکھ رہا تھا کہ اس کی میز لرزنے لگی۔ وہ حیران ہو کر ہوا کہ ہوا بالکل بند تھی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ کہ پورا گھر ہلنے لگا اور اس کی بنیادیں تک لرزنے لگیں۔ پہلے پہل اس کو خیال آیا کہ شاید گلی میں گزرنے والی گاڑیوں کی وجہ سے ایسا محسوس ہورہا ہے۔ پھر اچانک زمین کے نیچے سے عجیب شور اٹھتا ہوا محسوس ہوا جیسے کہیں دور بجلیاں کڑک رہی ہوں۔ اب پادری صاحب کو پتہ چلا کہ لزبن میں شدید زلزلہ آ گیا ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ وہ میڈیریا میں تھا کہ ایسا ہی زلزلہ آیا تھا مگر اس زلزلے سے بہت کم مالی وجانی نقصان پہنچا تھا۔

ڈیوی اب سوچ رہا تھا کہ اسے گھر کے اندر ٹھہرنا چاہئے کہ باہر نکلنا چاہئے؟ اچانک اسے شہر کی تمام عمارتیں گرتیں ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ خود اس کے مکان کی اوپر کی منزل گرنے لگی۔ اب خود اس کے فلور کے گرجانے سے دب کر ہلاک ہونے کا خطرہ محسوس ہوا۔ جب اس کے کمرے کی دیواریں خوفناک طریقے سے ہلنے لگیں۔ پھر اس کے کمرے کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں اور اوپر کی منزلوں سے پتھر گرنے لگے۔ ملبہ گرنے سے اس کے کمرے میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور ڈیوی اس اندھیرے میں گم ہوگیا۔

آل سینٹ ڈے کی تقریب میں شرکت کے لیے بے شمار لوگ لزبن کے گرجا گھروں میں موجود تھے۔ ابھی یہ تقریب جاری تھی کہ لوگوں کے پاؤں کے نیچے کی زمین ہلنے لگی اور گرجا گھروں کی چھتوں سے لٹکے ہوئے فانوس خوفناک انداز میں جھولنے لگے۔ گرجا گھروں میں نصب مجسمے اکھڑنے لگے۔ ایک کیتھڈرل میں قربان گاہ پر نصب ایک بڑا مجسمہ اکھڑ کر قریب کھڑے ہوئے ایک پادری کے اوپر گرا جس

سے پادری کی فوراً موت واقع ہوگئی۔ پھر گرجا گھروں کی اونچی چھتیں گرنے لگیں اور سنگ مرمر کے ستون بھی لڑکھڑا گئے جس کے بعد سینکڑوں افراد جو آل سینٹ ڈے کی تقریب میں شریک تھے وزنی پتھروں اور ملبے کے تلے دب کر ہلاک ہوگئے۔

ان حالات میں ڈیوی لکھتا ہے کہ اس نے دریائے ٹیکس کا رخ کیا۔ دریائے کے کنارے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جس میں خواتین وحضرات دونوں شامل تھے۔ اس بھیڑ میں ہر قسم اور ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔کلیسا کے بڑے بڑے عہدیدار اپنے ارغوانی لبادوں میں ملبوس موجود تھے،راہب اپنی قباؤں میں گرجاؤں کی قربان گاہیں چھوڑ کر یہاں پہنچ گئے تھے۔ انہیں کے درمیان فیشن ایبل پرتگالی خواتین بھی اپنی نیم لباسی میں کھڑی تھی۔ کئی لوگوں کو جوتے تک پہننے کا ہوش نہ رہا تھا اور وہ ننگے پاؤں کھڑے تھے۔ موت کا خوف ان لوگوں کے چہروں پر چھایا ہوا تھا اور یہ سب زانوؤں پر جھکے عبادتوں میں مصروف تھے۔ ان میں سے کچھ سینہ کوبی کرتے ہوئے پرتگالی زبان میں الم ناک آوازیں بلند کررہے تھے۔ جیسے ہی وہ عبادت کے لیے جھکے زلزلے کے جھٹکے دوبارہ شروع ہوگئے۔اس مرتبہ یہ جھٹکے زیادہ شدید نہیں تھے۔ تاہم پہلے شدید جھٹکوں کی وجہ سے جو عمارات اپنی بنیادوں سے ہل گئیں تھیں وہ زمین بوس ہوگئیں۔

انہیں عمارات میں لزبن کا مشہور ترین کلیسا ،سینٹ انتھونی کا کلیسا بھی شامل تھا۔ اس گرجا گھر کے گرنے سے بہت سی لوگ اس کے ملبے میں زندہ دفن ہوگئے۔شہر کے وسطی علاقوں میں پندرہ فٹ کشادہ گڑھے نمودار ہونے لگے۔ جن کے ساتھ انسانی چیخ وپکار بھی سنائی دی۔ ایک اور چشم دید پر تگیز گواہ کے مطابق شہر کی زمین اس طرح کانپ رہی تھی جس طرح طوفان کے دوران بید کے درخت کانپتے ہیں۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوفناک تھا۔

ڈیوی نے لکھا ہے کہ اس نے کسی کی چیخ سنی ''سمندر شہر میں درآیا ہے اور اب ہم سب تباہ ہوجائیں گے'' یہ چیخ سن کر جب ڈیوی نے دریائے ٹیکس کی طرف دیکھا تو اسے دریا کا پانی غیر معمولی انداز میں چڑھتا ہوا نظر آیا۔ مگر کوئی طوفان نہیں آیا تھا اور نہ ہی یہ تلاطم خیز ہوا کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ پھر چند ہی لمحوں میں دریا کا پانی کسی پہاڑی طرح بلند ہوکر دھاڑتا ہوا اس تیزی سے کنارے کی طرف بڑھا کہ ہم سب جان بچانے کے لیے بھاگ اٹھے۔ بہت سے لوگ اس تلاطم میں بہہ گئے۔ڈیوی بڑی مشکل سے ایک شہتیر سے لپٹ کر بچا جو زمین پر پڑا ہوا تھا۔ پھر اسی تیزی سے پانی کی یہ موج واپس دریا کی طرف پلٹی اور بہت سوں کو اپنے ساتھ لے گئی۔ ڈیوی واپس اس علاقے کی طرف دوڑا جہاں سے وہ دریا کی طرف آیا تھا۔ یہ ایک بڑا سونامی تھا جو زلزلے کے فوراً بعد لزبن پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کی موجیں پچاس فٹ بلند تھیں جو دریا کے گھاٹ کو اپنے ساتھ بہا کر لی گئیں۔

جب ڈیوی سینٹ پال کے کلیسا کے علاقے میں واپس آیا تو اس نے اس کلیسا کو کھنڈر میں تبدیل ہوئے دیکھا۔ اسی اثناء میں زلزلے کے جھٹکے تیسری بار آنے شروع ہوگئے ۔ اگرچہ یہ جھٹکے آنے والے دونوں جھٹکوں سے شدت میں کم تھے مگر ان کی وجہ سے سمندر میں ایک بار پھر تلاطم پیدا ہوگیا اور سمندری لہریں ایک بار پھر شہر میں درآئیں مگر اس مرتبہ ڈیوی ایک اونچے مقام پر تھا۔ اس لیے پانی اس کے ٹخنوں تک آیا مگر یہ بھی گرداب بنا رہا تھا۔ اس لیے ڈیوی نے یہاں سے بھی نکلنے کی کوشش کی۔ ایک برطانوی تاجر براڈ کاک نے بھی لزبن میں آنے والے اس سونامی کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ لزبن کی گلیوں میں لوگ پانی سے بچنے کے لیے بھاگتے پھر رہے تھے اور اس بھاگ دوڑ میں اکثر کی ٹانگیں تک ٹوٹ گئیں تھیں۔

شام ہونے تک لزبن کو ایک اور مصیبت نے آ گھیرا۔ لوگوں کے گھروں میں چولہے الٹنے اور گرجا گھروں میں روشن موم بتیوں کے گرنے کی وجہ سے شہر میں ایک سو سے زائد مقام پر آگ بھڑک اٹھی تھی اور اس کے شعلے شہر کی ہر اس چیز کو نگل رہے تھے جو زلزلے اور سونامی سے بچ گئی تھیں۔ یہ آگ اگلے چھ دن تک بھڑکتی رہی اور اس نے شہر کا 85 فیصد حصہ تباہ کردیا۔ اس میں زلزلے سے اور سونامی سے بچ جانے والے گرجا گھر، محل ،انکوزیشن ہیڈ کوارٹرز، خانقاہیں اور دیگر عمارات شامل تھیں۔ مگر شہر کا قحبہ خانوں والا علاقہ بالکل محفوظ رہا ۔تاہم شہر کا ایک نو تعمیر شدہ اوپیراہاؤس زمین بوس ہوگیا۔ شاہی محل رائل ریبرا پیلس Royal Ribeira Palace تباہ ہوگیا۔ اس محل میں 70 ہزار جلدوں پر مشتمل ایک لائبریری بھی تباہ ہوگئی ۔ اس محل میں یورپ کے نشاط ثانیہ کے مصوروں کے فن پارے محفوظ تھے جن میں مصور ٹائشن Titian اور روبنیز کے فن پارے بھی شامل تھے جو جل کر خاکستر ہوگئے۔ شاہی میوزیم جس میں واسکوڈے گاما اور دوسرے پرتگیز جہاز رانوں کے نقشہ جات اور تحریریں بھی شامل تھیں ، تباہ ہوگیا۔ لزبن کا بڑا ہسپتال بھی زلزلے اور آتش زدگی کی نذر ہوگیا۔ ساتھ ہی سینکڑوں مریض جو اس ہسپتال میں بستروں پر موجود تھے جل کر مر گئے۔ شہر کی تقریباً 17000 عمارات تباہ ہوگئیں اور 90000 سے زائد افراد جاں بحق ہوگئے۔

لزبن میں آل سینٹ ڈے کو آنے والا یہ زلزلہ یورپ میں آنے والا ایک بڑا زلزلہ تھا۔ لزبن میں ان دنوں 20 ہزار عمارات موجود تھیں جن میں سے صرف 3 ہزار باقی بچی تھیں۔

براعظم یورپ ان دنوں نشاط ثانیہ کی ترقیوں کے باوجود ایک توہمات پرست براعظم تھا۔ بعض توہم پرستوں نے اس زلزلے کی آمد کا سبب لزبن میں گناہگاروں کی موجودگی قرار دیا، کلیسا نے اور بادشاہ نے مزید تباہی سے بچنے کے لیے مشکوک گناہگاروں کو سزائے موت دینے کا فیصلہ کیا ۔ ادھر یونیورسٹی آف کوئمبرا نے ملک کو زلزلوں سے بچانے کے لیے زندہ انسانوں کو آگ میں جلا کر بھینٹ دینے کی سفارش کی۔

1770ء..... بنگال میں قحط

مورخین نے اندازہ لگایا ہے کہ گیارہویں سے سولہویں صدی تک ہندوستان 14 بڑے قحطوں میں مبتلا ہوا تھا۔ اس کے بعد 1630ء میں ہونے والی خشک سالی سے اگلے نو سال تک قحط وبھوک پھیلی جس سے تقریباً 80 لاکھ انسان جاں بحق ہوگئے تھے۔ 1770ء میں ایک خوفناک قحط ہندوستان کے صوبے بنگال میں پھوٹ پڑا تھا۔ یاد رہے بنگال ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتداب تھا۔ 1768ء اور 1769ء میں فصلیں بہت کم ہوئی تھیں۔

برطانوی فیلڈ آفیسروں نے اس کی اطلاع ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظامی بورڈ کو دی مگر ان کی اس اطلاع کو مبالغہ آرائی سمجھا گیا جو انہوں نے اپنی قابلیت جتانے کے لیے کی تھی۔ 1769ء کو موسم بہار میں اگرچہ بارش بھی ہوئی مگر جلد ہی اس قحط سالی نے خوفناک صورت اختیار کرلی۔ مغربی بنگال کے قصبے بشن پور میں ایک مقامی سپرنٹنڈنٹ کے مطابق چاول کے کھیت اس طرح خشک ہوگئے جیسے بھس کے گودام ہوتے ہیں۔ تاہم کلکتہ میں غیر ملکی حکومت کسی طرح بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ صورت حال کتنی خراب ہوچکی ہے۔ وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ شاید ہندوستانی سالانہ لگان کی ادائیگی کرنا نہیں چاہتے۔

حقیقت یہ تھی کہ 1770ء کے دم گھوٹنے والے موسم گرما میں بہت سے لوگ قحط سالی سے بھوکے مرنے لگے۔ بھوک اتنی بڑھ گئی تھی کہ لوگ خوراک خریدنے کے لیے اپنے مویشی اور اوزار تک بیچنے پر مجبور ہوگئے تھے جبکہ کسان اپنے غلہ اگانے کے لیے محفوظ کیے ہوئے بیج تک کھانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ پھر نوبت یہاں تک آ گئی کہ ماں باپ اپنے بچوں کو بیچنے لگے، ایک مورخ کے مطابق جس نے تقریباً 100 سال بعد اپنی تاریخ لکھی تھی کہ بچوں کو خریدنے والا کوئی نہ رہا تو لوگ درختوں کے پتے اور گھاس کھانے پر مجبور ہوگئے۔ پھر آدم خوری کی خبریں موصول ہونے لگیں۔ جیسے جیسے لوگ کھانے کی تلاش میں اپنے علاقوں سے دوسرے علاقوں میں منتقل ہوئے مختلف وبائیں پھیلنے لگیں۔ مرشد آباد میں چیچک کی وبا پھوٹ نکلی۔ یہ وباء اتنی بڑھی کہ محلوں میں شہزادے مرنے لگے اور گلیوں اور سڑکوں پر انسانی لاشے کتے بلیاں کھانے لگیں۔

1771ء میں بارشیں ہوئیں اور فصل بھی خوب ہوئی مگر چونکہ یہ وقت پر نہ ہوئی۔ اس لیے فصل کٹنے

سے پہلے لاکھوں افراد بھوکے مر گئے۔ صرف فصل کٹنے سے چند ہفتے پہلے بے شمار اموات واقع ہوئیں۔ کرسمس کے آغاز پر کلکتہ سے لندن رپورٹ بھیجی گئی کہ قحط سالی ختم ہوگئی اور فصل اتنی اچھی ہوئی کہ اگلے سال کے لیے لوگوں نے بہت کم نرخوں پر اناج خرید لیا۔ مگر اس قحط سالی میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق کم از کم صوبہ بنگال میں ایک کروڑ افراد ہلاک ہوگئے تھے جو اس صوبے کی آبادی کا ایک تہائی حصہ تھا۔

انیسویں صدی کے دوران بنگال پھر کئی مرتبہ قحط سالی کا شکار ہوا جو کئی مورخین کے نزدیک برطانوی حکمت عملیوں کے خلاف ردعمل کا نتیجہ تھا۔ جیسے برطانوی حکام نے مقامی کسانوں سے چھین کر زمین غیر ملکی زمینداروں کی ملکیت میں دینا شروع کر دی تھی اور افغانستان میں جنگ لڑنے کے لیے بنگالی کسانوں پر بڑے بڑے ٹیکس نافذ کر دیے تھے۔ 66-1865ء میں ہندوستان کے مشرقی ساحل پر واقع صوبہ اڑیسہ میں شدید خشک سالی واقع ہوئی تھی جس کے نتیجے میں برطانوی حکومت کو ایک خصوصی حکمت عملی مرتب کرنا پڑی تھی۔ اگر کسی علاقے میں اناج کی پیداوار کم ہونے کی وجہ سے وہاں اناج کی قیمت زیادہ ہو جاتی تو دوسرے علاقوں سے اناج کی سپلائی خود بخود وہاں پہنچ جاتی تھی تا کہ اناج کی قیمت پر کنٹرول کیا جا سکے مگر حکومت کا مارکیٹ کو یوں کنٹرول کرنا الٹا غلط نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ جس کی وجہ سے کٹک کے کمشنر کو مقامی مارکیٹ میں یہ مداخلت بند کرنے کا حکم دینا پڑا۔ مگر اس کی وجہ سے اڑیسہ میں 20 لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوگئے اور سیکرٹری برائے ہندوستان لارڈ سالبسری کو (جو تین مرتبہ برطانیہ کے وزیر اعظم بنے تھے) بڑی حیرانی ہوئی کہ حکومت کی مداخلت کے باوجود اتنی انسانی جانیں ضائع ہوگئیں۔

اس کے ایک دہائی بعد 76-1875ء میں جنوبی ہندوستان میں بارشیں نہ ہوئیں۔ جس کی وجہ سے لاکھوں ایکڑ زمین پر کاشت نہ ہو سکی اور اناج کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں جس کے بعد غرباء بھوکوں مرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس مرتبہ بھی حکومت نے مارکیٹ میں مداخلت کرنے سے اجتناب برتا اور حکومت کی امدادی کارروائیاں بہت دیر سے شروع ہوئیں۔ جس کے بعد قحط سے ہونے والے جانی نقصان کی علامتیں سامنے آنے لگیں۔ بارش سے بچنے کے لیے ایک کافی اگانے والے کسان نے جب ایک جھونپڑے میں پناہ لی تو اسے کئی اشخاص کی لاشیں بھوک کی وجہ سے مرنے سے نظر آئیں۔ یہ خبر ''مدراس ٹائمز'' میں شائع ہوئی۔ مدراس کے گلی کوچوں میں مائیں اکثر اپنے بچے فروخت کرتے ہوئے نظر آنے لگیں۔ موسم خزاں تک یہ قحط شمالی ہندوستان میں بھی پھیل چکا تھا۔ 1876ء کے آخر تک حکومت کو لوگوں کو بھوکوں مرنے سے بچانے کے لیے 20 لاکھ سے زائد لوگوں کو سرکاری ملازمتیں دینا پڑیں۔ مخیر حضرات نے قحط زدگان کی مدد بھی کی مگر اس کے باوجود ''دی ٹائمز'' کے نمائندے کے مطابق شہروں کی گلیاں فاقہ زدگان سی بھری ہوئی تھیں۔ ایک گھر کے سامنے اس اخباری نمائندے نے 800 سے زائد لوگوں کو قطار

بنائے ہوئے دیکھا۔ اس گھر سے اکثر غربا میں کھانا مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ قطار میں موجود ہر شخص کو گھنٹوں اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا پھر بھی ان میں سے اکثر کو کھانا نہیں ملتا تھا۔ اسی قطار میں 50 سے زائد ایسے چھوٹے بچے بھی تھے جو بھوک سے موت کی دہلیز پر پہنچ چکے تھے اور کھانا نہ ملنے کی صورت میں ان کی موت کا سو فیصد امکان تھا۔ جنوری 1877ء تک اناج کی قیمتیں سہ گنا بڑھ چکی تھیں۔ جن کی وجہ سے ایک کروڑ افراد بھوکوں مرنے لگے تھے۔

ان حالات میں بہت سے علاقوں میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی۔ حکومت نے مدراس میں مقامی حکام کو امدادی کارروائی کرنے کی ہدایت دیں۔ ان حالات میں اخبار ''دی ٹائمز'' کے مدراس کے نمائندے نے ایک امدادی کیمپ کا دورہ کیا اور لکھا کہ اس کیمپ میں 2000 مصیبت زدگان پناہ لیے ہوئے تھے اور ان میں سے 25 فیصد کے زندہ بچ جانے کا امکان تک نہیں تھا۔ مدراس اور سیلری کے ہسپتالوں اور امدادی کیمپوں میں 100000 سے زائد افراد پناہ گزین تھے جبکہ ان حالات میں بھی ہندوستان سے اناج یورپ کو برآمد کیا جارہا تھا۔ اگر اس کے خلاف کچھ آوازیں بلند ہوئیں تو ہندوستان کے اس وقت کے وائسرائے لارڈ لٹن نے کہا کہ کیا ہندوستان کا دیوالیہ نکال کر قحط زدگان کی مدد کی جائے؟ وائسرائے نے اعلان کیا کہ حکومت اشیائے صرف کی قیمتیں کم کرنے کے لیے مارکیٹ میں مداخلت نہیں کرے گی۔

1878ء کے آخر تک جب یہ قحط سالی اختتام پذید ہوئی تقریباً ایک کروڑ سے زائد افراد بھوکوں مرنے سے ہلاک ہوچکے تھے۔ برطانوی ہندوستان میں آخری مرتبہ قحط دوسری جنگ عظیم کے دوران اس وقت پڑا تھا جب جاپانی فوجیں برما کو تاراج کررہی تھیں اور ہندوستان کو برما سے پہنچنے والی چاول کی سپلائی ختم ہوگئی تھی۔ اسی زمانے میں کلکتہ میں 10 لاکھ سے زائد پناہ گزینوں نے پناہ لی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں قحط پڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برطانوی حکومت اپنی افواج کے لیے اناج اسٹاک کررہی تھی۔

1780ء.....تباہ کن ہری کین

1780ء میں آنے والے گریٹ کیریبین ہری کین سے زیادہ شدید سمندری طوفان مغربی نصف
کرے میں کبھی نہیں آیا۔ اس طوفان میں گھر کر جزیرہ ونفورڈ اور لیورڈ کے 22ہزار سے زائد افراد جاں
بحق ہوگئے اور دنیا کے ان خوبصورت جزائر کا حال ایسا ہوگیا جیسے آگ میں جل کر بھسم ہونے والا کو
علاقہ۔

یہ سمندری طوفان براعظم افریقہ میں سینیگال کے ساحلوں سے شروع ہوا تھا۔ دس دن تک یہ طوفا
زور پکڑتے ہوئے مغربی نصف کرہ کی طرف بڑھتا رہا۔ آخر 9اکتوبر کو یہ باربا ڈوس کے ساحلوں سے ک
گیا۔ دو دن تک ہوائیں 200 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی رہیں اور ان ہواؤں نے جزیرہ پر موج
تقریباً ہر عمارت گرادی اور 6ہزار سے زائد افراد کو ہلاک کردیا۔ اس طوفان نے لنگر انداز جہازوں کو تو
پھوڑ کر رکھ دیا اور سینکڑوں ماہی گیروں کی کشتیاں جو سمندر میں نکلیں وہ اس طوفان میں گھر جانے کے ب
واپس نہیں آئیں۔ اس جزیرے پر آباد ہر خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد اس طوفان کا شکار ہوگیا اور اموات
تعداد 4500 تک پہنچ گئی۔ اس طوفان کا اگلا نشانہ کنگسٹن تھا جو سینٹ وسنٹ نامی جزیرے پر آباد تھا۔ ا
شہر کے 600 مکانات میں سے اس طوفان سے 584 تباہ ہوگئے۔

11اکتوبر کو صبح سویرے یہ طوفان سینٹ لوسیا کی طرف مڑ گیا اور اس نے برطانوی بحری بیڑے کے
بہت سے جہازوں کو ڈبو دیا۔ یہ بحری بیڑہ امریکی انقلابیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا اور طوفا
سے بچنے کے لیے اس بیڑے نے پورٹ کیسٹریز میں پناہ لی ہوئی تھی۔ اس طوفان نے نہ صرف لنگر اند
جہازوں کو ڈبو دیا بلکہ کئی جہازوں کو اٹھا کر شہر کے ہسپتالوں پر دے مارا۔ جس سے یہ ہسپتال تباہ ہوگیا
اس جزیرے پر صرف دو گھر باقی بچے اور دو ہزار افراد مارے گئے۔ سینٹ لوسیا کے بعد اس نے مارٹینیک
رخ کیا جہاں کھڑا ہوا فرانسیسی بحری بیڑہ اس طوفان کی نذر ہوگیا ور 9ہزار سے زائد فرانسیسی ملاح ہلاک
ہوگئے۔

مزید مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے یہ طوفان ڈومنیکا، گواڈیلوپ اور سینٹ یوسٹائیٹس پر حملہ آور ہ
ا اور وہاں اس نے 9ہزار سے زائد افراد کو ہلاک کردیا۔ اب اس کا رخ جنوب مغرب کی طرف ہوگیا اور

یہ جمیکا کی طرف بڑھا جہاں بے شمار عمارتیں منہدم ہوگئیں اور کھڑی فصلیں تباہ و برباد۔ نتیجتاً ہزاروں غلام جو یہاں آباد تھے قحط سالی کا شکار ہوگئے۔ امریکی انقلاب آزادی کے ہنگاموں کی وجہ سے جہازوں کے ذریعہ یہاں خوراک امداد کے طور پر بھی نہ بھیجی جاسکی۔ جمیکا پر اس طوفان سے صرف ایک ہفتہ پہلے ایک بڑے سونامی نے اس کے مغربی ساحلی قصبے سوانا لامار میں تباہی پھیلائی تھی جس سے تقریباً 300افراد ہلاک ہوگئے تھے۔

جمیکا ان دنوں برطانیہ کے زیر انتداب تھا۔ اس کے گورنر جنرل جان ڈیلنگ نے اس طوفان سے ہونے والی تباہی کی رپورٹ لندن بھیجی۔ اس میں اس نے لکھا۔

''آسمان اچانک تاریک ہوگیا اور سمندر میں غیر معمولی امواج پیدا ہوگئیں۔ ابھی سوانا اور لامار کے باشندے سنبھل نہ پائے تھے کہ سمندر سے اٹھنے والی موجوں نے انہیں گھیرلیا۔ یہ طوفانی موجیں جب سمندر کی طرف واپس لوٹیں تو اپنے ساتھ اس قصبے کی ہر شے بہا کر لے گئیں۔ انسانوں، مکان اور مویشی سب بلا امتیاز سمندر کی نذر ہوگئے۔''

جمیکا کے بعد یہ عظیم ہری کین شمال کی طرف مڑتے ہوئے پورٹوریکو پر حملہ آور ہوا۔ یہاں اس نے ایک اور بحری بیڑہ ڈبو دیا۔ یہ تیسرا بحری بیڑہ اسپین کا تھا۔ اس بحری بیڑے پر کم از کم 2000ہسپانوی ملاح ہلاک ہوگئے۔

برطانوی بحریہ کے ایک کمانڈر جنرل وان نے اس وقت کے برطانوی تاجدار جارج سوم کو اس ہری کین سے پہنچنے والے نقصانات کی جو رپورٹ بھیجی وہ یوں تھی۔

میں انتہائی پریشانی کے عالم میں جناب والا کو مطلع کررہا ہوں کہ اس جزیرے کو 10اکتوبر 1780ء کو ایک ہلاکت خیز سمندری طوفان نے گھیرلیا اور اسے مکمل طور پر تباہ کرکے رکھ دیا۔ یہ طوفان بغیر رکے اڑتالیس دن تک جاری رہا۔ اس طوفان کی شدت کے متعلق میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں اور صرف اتنا کہوں گا کہ اس سے پھیلنے والی تباہی سے اس جزیرے پر صرف چند گھر ہی بچے ہیں۔ مجھے خود یقین نہیں آرہا کہ ہزاروں میں سے صرف 10 گھر باقی بچے ہیں اس طوفان سے لوگوں کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کو بیان کرنے سے قلم قاصر ہے۔ ایک طرف تو انسانی لاشوں کے انبار پڑے تھے دوسری طرف معزز گھرانوں کے لوگ خوراک کی تلاش میں ملبے کے انباروں کے درمیان بھٹک رہے تھے۔

مختصر یہ کہ اس ہولناک تباہی کا صرف دھندلا سا تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

1783ء.....آئس لینڈ میں کوہ لیکی کا پھٹنا

کوہ توبا کی عظیم آتش فشانی کی طرح 1783ء میں آئس لینڈ میں ہونے والی کوہ لیکی کی آتش فشانی نے بھی ہزاروں میل دور آباد لوگوں کو ہلاک کردیا تھا۔ آئس لینڈ اپنے گرم پانی کے چشموں اور پراسرار طور پر گڑگڑاہٹ پیدا کرتے ہوئے کیچڑ کی وجہ سے مشہور ہے۔ آئس لینڈ بحر اوقیانوس کے اس وسطی ابھار پر واقع ہے جہاں کرہ ارض کی دو عظیم ارضیاتی پرتیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتی ہیں اسی وجہ سے جون 1783ء کے پہلے ہفتہ میں آئس لینڈ کے باشندے بالکل تیار نہ ہوئے تھے۔ جب زلزلے کے جھٹکوں کی آمد کا ایک پورا سلسلہ شروع ہوگیا پھر اتوار 8 جون کو صبح 9 بجے کوہ لیکی لاوا اگلنے لگا۔ ایک لوتھرین دہقان جان سٹین گرمسن نے اس قیامت کا آنکھوں دیکھا احوال قلم بند کیا ہے۔ زمین ہچکولے کھانے لگی اور اس کی گہرائیوں سے زوردار شور کی آوازیں بلند ہونے لگیں پھر زمین پھٹنے لگی جیسے کوئی پاگل جانور کچھ توڑ کر باہر نکلتا ہے۔ پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے ناقابل بیان حد تک فضا میں بلند ہونے لگے اور آگ اور دھوئیں کے مرغولے بھی۔ آتش فشاں سے برستی ہوئی اس آگ کو ایک چشم دید گواہ نے خدا کا قہر وغضب قرار دیا تھا۔

کوہ لیکی کے اطراف میں دراڑیں پڑ گئیں اور ان سے لاوا ابلنے لگا۔ ایک ماہر آتش فشانی کے مطابق ایسا لگتا تھا کہ جیسے زمین کا ابلتا ہوا سینہ کھل گیا ہو۔ پگھلے ہوئے پتھروں کے اس دھارے نے قریب میں بسنے والے ایک دریا کے پاٹ کو الٹ دیا جس کی وجہ سے دریا کا پانی اطراف وجوانب میں بہنے لگا۔ 18 جون کی کوہ لیکی سے بہنے والے اس لاوے نے مزید شدت اختیار کرلی۔ یہ لاوا 1000 ڈگری سلیسیس Celsius درجے تک حرارت پذیر تھا۔ یہ لاوا اتنی بڑی مقدار میں جمع ہوگیا کہ اس کا حجم یورپ کے مشہور زمانہ پہاڑ کوہ بلانک کے برابر ہوگیا۔ پہاڑ میں 15 میل طویل دراڑ پڑ گئی اور چشم دید گواہ سٹین گرمسن کے مطابق ابلتے ہوئے لاوے کا دریا بڑی رفتار سے بہتا رہا تھا اور اس پگھلے ہوئے لاوے کے دریا میں بڑے چٹانی ٹکڑے اور بڑے پتھر بہہ رہے تھے اور لگتا تھا کہ جیسے لاوے کے سمندر میں بڑی بڑی وہیل مچھلیاں تیر رہی ہوں مگر آگ کی بنی ہوئیں۔ لاوے کے اس بہتے ہوئے دریا نے 20 کے قریب دیہاتوں کو جلا کر راکھ میں تبدیل کردیا۔ بہت سے دیہاتوں میں دریا کا راستہ بند ہوجانے سے پہلے

والے دریائی سیلاب نے تباہی مچا دی۔ پادری گرمسن کے مطابق کوہ لیکی کی آتش فشانی کا ایک پہلو کچھ یوں بہتر تھا کہ اس قدرتی آفت نے لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کردیا۔ پادری صاحب کے مشاہدے میں آیا کہ اس قدرتی آفت کے بعد لوگوں نے باقاعدہ طور پر چرچ آنا شروع کردیا اور عبادات میں حصہ لینے لگے۔20 جولائی کو جب کھولتے ہوئے لاوے نے کرک جوبلی نام کے ایک گاؤں کا رخ کیا تو پادری صاحب نے اس موقع پر ایک یادگار خطبہ دیا جو Fire Serman کہلاتا ہے۔ اس خطبے کے دوران سامعین سر بسجود تھے کہ خدا اس آفت کو ان کے سر پر سے ٹال دے۔ پھر جب وہ چرچ سے باہر نکلے تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خدا نے لاوے کے جلتے ہوئے دریا کو ان کے گاؤں سے ایک میل پرے ہی روک دیا تھا۔

مگر اس کراماتی روک تھام سے بھی کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا کیونکہ کوہ لیکی سے اگلے سال فروری تک لاوا بہتا رہا جس نے 218 مربع میل کے علاقے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ آتش فشاں کے دہانے سے زہریلے بخارات کا اخراج بھی ہوا جس میں 120 ملین ٹن سلفر ڈائیاوکسائیڈ گیس شامل تھی۔ اتنی مقدار میں سلفر ڈائیاوکسائیڈ پورے یورپ کی فیکٹریاں تین سال میں بھی خارج نہیں کرتیں۔ان زہریلے بخارات کیوجہ سے اس خطے (یورپ) میں تیزابی بارشیں ہوئیں۔ جس کی وجہ سے گھاس جڑوں سے کملا گئی۔ فصلیں نہ ہوسکیں اور دریاؤں سے مچھلیاں غائب ہوگئیں۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے اور جانوروں کا چمڑا تک ابال کر کھانے پر مجبور ہوگئے۔ آئس لینڈ کی آبادی کا چوتھا حصہ تقریباً10000 لوگ اس آتش فشانی کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔

تاہم آتش فشانی کے اثرات دور دراز کے علاقوں پر بھی مرتب ہوئے اور ناروے کے شہر برجن اور پراگ میں ایک خشک کہر پڑنے کی وجہ سے ہلاکتیں رونما ہوئیں جبکہ برلن جرمنی میں سورج کا رنگ خون کی طرح سرخ ہوگیا۔ اس کے بعد اس کہر نے فرانس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پھر یہ ماسکو اور بعداد تک جا پہنچی۔ 22 جون کو اس کہر کا ذکر برطانوی اخباروں میں بھی آیا۔ بعض علاقوں میں تاریکی چھا جانے کی وجہ سے سمندروں میں جہاز رانی بھی متاثر ہوئی جیسے 2010ء میں آئس لینڈ میں ہونے والی آتش فشانی سے ہزاروں پروازیں منسوخ کرنا پڑی تھیں۔

انگلینڈ میں اس وقت کے مشہور شاعر ولیم کوپر نے لکھا ہے کہ آئس لینڈ میں ہونے والی اس آتش فشانی کے اثرات کو دیکھ کر انگلینڈ میں بہت سوں کو یہ خیال آیا کہ شاید قیامت آگئی ہے۔

1811-12ء..... نیو میڈرڈ، میسوری کا زلزلہ

نیو میڈرڈ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا وہ علاقہ ہے جہاں اس کی چار ریاستیں، میسوری، آرکنساس، کینٹکی اور ٹینیسے ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ 1811-12ء میں اس علاقے کو امریکہ کی تاریخ کے بدترین زلزلوں نے تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ 1811ء اور 1812ء میں آنے والے ان دونوں زلزلوں کے جھٹکے پورے امریکہ میں محسوس کیے گئے تھے۔

1811ء اور 1812ء میں آنے والے ان دونوں زلزلوں میں سے پہلا 16 دسمبر 1811ء کو آیا تھا۔ یہ ریکٹر اسکیل پر 7.2 درجے کا زلزلہ تھا۔ جبکہ دوسرے زلزلے نے اس علاقے کو 5 فروری 1812ء جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا میگنیچیوڈ Magnitude 7.4 درجے تھا۔ ان دونوں بڑے زلزلوں کے درمیانی دنوں میں اس علاقے میں زلزلے کے بہت سے جھٹکے محسوس کیے گئے تھے۔ ان دونوں زلزلوں کا مرکز وہی علاقہ تھا جہاں یہ چاروں امریکی ریاستیں ایک دوسرے سے ملتی تھیں۔ ان دونوں زلزلوں نے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلی۔ عمارتیں زمین بوس ہوگئیں۔ درخت جڑ سے اکھڑ گئے اور دریائے مسسپی نے اپنا راستہ بدل لیا۔ دوسرے الفاظ میں اس دریا میں سونامی آ گیا جس نے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائی۔ اس زلزلے میں پیدا ہونے والی شاک ویوز اتنی طاقت ور تھیں کہ واشنگٹن کے گرجا گھروں کی گھنٹیاں ان شاک ویوز سے بجنے لگیں۔ اس زلزلے کے جھٹکے انڈیانا سے میساچوسٹس تک محسوس کیے گئے۔ خوش قسمتی سے چونکہ اس علاقے میں ان دنوں آبادی بہت کم تھی اس لیے جانی نقصان بہت کم ہوا۔

امریکی ریاستوں میں یورپین آبادکاری کے وقت سے کم از دو لاکھ مربع میل کے علاقے میں شدید زلزلے آتے رہے تھے۔ یہ علاقہ 1964ء میں الاسکا میں آنے والے زلزلے سے دو گنا بڑا تھا جبکہ 1906ء میں سان فرانسسکو میں آنے والے زلزلے سے متاثر ہونے والے علاقے سے دس گنا بڑا تھا۔ اس زلزلے سے دریائے مسسپی کے خدوخال میں جو تبدیلیاں آئیں وہ بڑے پیمانے پر تباہی لانے کا باعث بنیں۔ اس زلزلے کے دوران زمین کے ابھرنے سے دریا کی وادی تقریباً 15 فٹ بلند ہوگئی۔

نیو میڈرڈ میں رہنے والوں نے اس زلزلے کی آمد سے پہلے اس کے جو آثار دیکھے وہ درختوں کے تنے ٹوٹنے کی آوازیں اور گھروں کی چمنیاں گرنے کی آوازیں تھیں جس کے بعد لوگ انتہائی سرعت سے

اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تا کہ ملبے کے گرنے سے بچا جا سکے۔

اس علاقے میں جو رہائشی مکانات تھے ان میں زیادہ تر شہتیروں سے بنے ہوئے کیبن تھے۔ اس قسم کے مکانات سب سے زیادہ زلزلے پروف ہوتے ہیں اور زلزلے برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر زمین بہت زیادہ ہلنے لگے تو یہ مکانات بھی گر جاتے ہیں۔ عمارات کے گرنے سے تاہم صرف ایک انسانی موت واقع ہوئی تھی مگر بہت سے لوگ دریا میں ڈوب کر مر گئے تھے۔

1812ء..... ماسکو کی آگ

14 ستمبر 1812ء کو فرانسیسی فاتح نپولین بونا پارٹ کی عسکری کامیابیوں کا عظیم لمحہ تھا جب وہ روسی افواج کو بورڈینو Borodino کے مقام پر شکست دینے کے بعد پوکلونی ہل Poklony Hill پر کھڑا ماسکو شہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ روسی مصنف ٹالسٹائی نے اپنی کتاب وار اینڈ پیس میں لکھا ہے کہ فرانسیسی فاتح کے سامنے حد نظر تک ماسکو کے گرجا گھر، باغات اور عمارات دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ جب نپولین کے سپاہی ماسکو میں داخل ہوئے تو ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کیونکہ یہ عظیم روسی شہر بالکل خالی تھا۔ شاید شہر کی آبادی کا صرف پانچواں حصہ شہر میں مکین تھا۔ نپولین کے شہر میں داخل ہونے والے سپاہیوں میں سے ایک نے لکھا ہے کہ شہر میں کسی قسم کی حرکت موجود نہیں تھی اور خاموشی طاری تھی جو بہادر سے بہادر سپاہی پر خوف طاری کر رہی تھی۔ پھر فرانسیسی افواج کے شہر میں داخل ہونے کے صرف ایک گھنٹہ بعد ماسکو میں ہر طرف شعلے بھڑکنے لگے۔ فرانسیسیوں کا خیال تھا کہ شاید یہ ان کا مریڈوں کا کام ہے جو شہر میں فرانسیسی فوج کی آمد سے پہلے لوٹ مار مچائے ہوئے تھے۔

اگلے دن خود نپولین ماسکو میں داخل ہوا اور اس نے کریملن کو اپنا ہیڈ کوارٹر قرار دے دیا۔ تاہم اگلے ہی دن شہر میں تیز ہواؤں کے چلنے سے ریڈ اسکوائر کے اردگرد واقع سٹوروں میں آگ بھڑک اٹھی اور جلدی ہی کریملن کے اردگرد کی گلیاں بھی آگ کی زد میں آ گئیں اور ہواؤں نے چنگاریاں اڑا کر خود کریملن میں بھی آگ لگا دی۔ اس کے میناروں میں سے ایک منارہ آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ نپولین اور اس کے افسرون کو کریملن فوراً چھوڑ کر کہیں اور پناہ تلاش کرنا پڑی مگر وہ جدھر بھی جاتے آگ ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ نپولین اور اس کے افسروں کو ایک فرانسیسی دستے نے شہر میں لوٹ مار چھوڑ کر بچایا اور محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔

اگلے دن صورت حال مزید خراب ہوگئی۔ ایک فرانسیسی کے مطابق ایک ہوا کے چلنے سے شعلے خطرناک حد تک ہر طرف پھیل گئے اور چند گھنٹوں کے اندر اندر پورا شہر جل اٹھا اور آگ کا سمندر بن گیا جس میں آتشیں موجیں یا شعلے آسمان تک بلند ہو رہے تھے۔ فرانسیسی افواج جو شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم کیے ہوئے تھیں۔ آخر مایوسی کے عالم میں شہر چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ ہر طرف شہر کی گلیوں میں دھکے

ہوئے شہتیر گر رہے تھی، چنگاریاں اڑ رہی تھیں اور عمارات کی چھتوں سے گرم دھات کے ٹکڑے شاہراہوں پر گر رہے تھے۔ شہر کی گلیوں میں پھیلا ہوا کثیف دھواں انسانوں کے لیے سانس لینا دشوار بنا رہا تھا اور درجہ حرارت گلیوں میں ٹھہرنا مشکل کر رہا تھا۔ گلیوں کے فرشوں میں لگا ہوا پتھر کسی فرائی پین کی طرح گرم ہو چکا تھا جس سے گلیوں میں چلنا پھرنا دو بھر ہو چکا تھا۔ نپولین اور اس کے ساتھی آفیسروں نے ان حالات میں شہر کے باہر واقع پیٹروف پیلس میں پناہ لی۔ ماسکو میں ہر طرف دھواں اتنا پھیل چکا تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھنا دشوار ہو چکا تھا۔ فرانسیسیوں کو پہلے پہل ایسا لگا کہ خود ان میں کچھ نے شہر کو آگ لگائی ہے مگر جلد ہی رپورٹیں آنے لگیں کہ ماسکو میں آگ خود روسیوں نے لگائی تھی۔ نپولین یہ رپورٹیں دیکھ کر بول اٹھا کہ روسی کتنے وحشی ہیں کہ انہوں نے صرف مجھے تنگ کرنے کے لیے اپنی تاریخ جلادی اور صدیوں میں تعمیر کی جانے والی عمارات کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

17 ستمبر 1812ء کو ماسکو میں بارش ہونے کی وجہ سے بالآخر یہ آگ بجھ گئی مگر روسیوں کے دلوں میں ابھی بھی فرانسیسیوں کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انہوں نے صرف اس لیے اپنے خوبصورت شہر کو آگ لگا دی تھی کہ دشمن کو نہ اس کی عمارتوں میں پناہ ملے اور نہ کھانے پینے کی اشیاء دستیاب ہوسکیں۔ ماسکو کے تین حصے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئے تھے۔ ایک تخمینہ کے مطابق 120 گرجا گھر، 8000 دکانیں اور بہت سے گودام آگ کی نذر ہوگئے تھے۔ ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی اور بہت سی دیگر لائبریریوں میں ہزاروں کتابیں اور آرٹ وفنون کے نمونے تلف ہوگئے۔ ایک اندازے کے مطابق 2 ہزار زخمی روسی اور 20 ہزار زخمی فرانسیسی فوجی اس آتش زدگی میں جاں بحق ہوگئے۔ اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ کتنے روسی شہری اس آگ کی نذر ہوئے تاہم جب ماسکو کے شہری جنگ کے بعد اپنے شہر میں لوٹے تو انہوں نے 50 ہزار باشندوں کو گم شدہ پایا۔

یہ آگ ماسکو میں کس نے لگائی تھی۔ روسی فرانسیسیوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ فرانسیسیوں نے آتش زادگی کے الزام میں کئی روسیوں کو سزائے موت بھی دی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ پسپاہ ہوئی روسی فوج نے اپنے اسلحے اور غلے کے گوداموں کو جلا دیا تھا تا کہ وہ فرانسیسیوں کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔ پھر روسی اپنے پورے شہر کو نذر آتش کرنے میں کیوں تاخیر کرتے۔ ایسا تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا بہت سی اقوام عالم نے دشمن کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے ایسی حکمت عملی پہلے بھی اختیار کی تھی۔ یوں ماسکو کی فتح نپولین کو پریشان کر گئی۔

1815ء.....تمبورا کی آتش فشانی

آج کل مشرق بعید کا جو علاقہ انڈونیشیا کے نام سے جانا جاتا ہے(ان جزائر پر بہت سے آتش فشاں واقع ہیں) وہاں دنیا کی دو بڑی آتش فشانیاں واقع ہوئی ہیں۔ ایک 74000 قبل از مسیح میں جوتو کے مقام پر ہوئی تھی اور دنیا کی سب سے شدید آتش فشانی تھی۔ دوسری بڑی آتش فشانی تمبورا کی آتش فشانی تھی جو 7VEI درجے کی تھی ۔5اپریل 1815ء کو تمبورا کا آتش فشاں پھٹ گیا۔ یہ جدید دور کی سب سے بڑی آتش فشانی تھی۔ اس آتش فشاں سے تقریباً 2 ملین ٹن راکھ فضا میں پھیلی۔ اس آتش فشاں راکھ کے بھاری حصے واپس زمین پر آ گرے جس سے سمباوا کے بہت سے مکان منہدم ہوگئے۔ باریک راکھ کی تہہ جوفضا میں رہ گئی وہ اتنی موٹی تھی کہ سورج کی روشنی زمین پر آنے سے رک گئی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دھوپ کے زمین پر نہ آنے کی وجہ سے زمین کے بہت سے حصوں میں درجہ حرارت گر گیا جو پورے سال جاری رہا۔ اسی وجہ سے بہت سے مورخین 1816ء کو بغیر موسم گرما کا سال کہتے ہیں۔

تمبورا آتش فشاں کی بلندی اس آتش فشانی سے پہلے 13000 فٹ تھی۔ جبکہ اس کے بعد یہ پہاڑ صرف 9ہزار فٹ بلند رہ گیا۔ یعنی 4000 فٹ کی بلندی کم ہوگئی جو اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ آتش فشانی کس شدت کی تھی۔

1512ء میں سب سے پہلے یورپی آباد کار انڈونیشیاء کے اس جزیرے سمباوا پر پہنچے تھے ۔ یہ جھیل توبا سے 1500 میل کی دوری پر واقع ہے۔ یورپی آباد کاروں نے کوہ تمبورا کو ایک مردہ (Extinict) آتش فشاں قرار دیا تھا۔ یورپی آباد کاروں کی اس غلط تحقیق کا علم 300 سال بعد 1812ء میں اس وقت ہوا تھا جب کوہ تمبورا سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ دو سال بعد اس پہاڑ نے آتش فشاں راکھ اگلنا شروع کردی تھی ۔ پھر 15اپریل 1815ء کو ایک بڑی دھماکہ خیز آواز کے ساتھ یہ جوالا مکھی پھٹ پڑا۔ یہ آواز اتنی شدید تھی کہ 800 میل دور جزیرہ جاوا پر سننے کی ایک انگریز سر سٹیمفورڈ ریفلرز نے تصدیق کی تھی۔ سر ٹیمفورڈ ریفلز مختصر برطانوی قبضے کے دوران جاوا کا فوجی گورنر تھا۔ برطانوی افسروں نے اس آواز کو پہلے پہل توپ داغے جانے کی آواز سمجھا تھا جو ان کے نزدیک حملہ آور ولندیزی فوجوں نے داغی تھی۔ اس آواز کا پتہ چلانے کے لیے فوجی دستے روانہ کیے گئے۔

5 دن بعد یہ دھماکہ خیز آواز مزید تیز ہوگئی اور جزیرہ سماٹرا پر بھی سنائی دی گئی۔ شام 7 بجے کے قریب آتش فشاں کے دہانے سے آگ کے تین بڑے ستون بلند ہوئے اور انتہائی بلندی پر چلے گئے۔ پھر سارا پہاڑ جلتے ہوئی لاوے سے ڈھک گیا۔ یہ جلتا ہوا لاوا پہاڑ کے نیچے دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔ اس لاوے کے راستے میں جو کچھ بھی آیا جل کر خاکستر ہوگیا۔ جزیرے سمباوا پر موجود تمام روئیدگی ختم ہوگئی، درخت جڑوں سے اکھڑ کر بہتے ہوئے سمندر میں جا گرے۔ سمباوا کے سمندر میں بہہ جانے والے ان درختوں میں سے ایک چار ہزار میل دور ہندوستان کے شہر کلکتہ سے ملا۔ 300 میل کے علاقے میں آتش فشاں راکھ کے فضا میں پھیلنے سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ آتش فشاں راکھ 800 میل تک پھیل گئی۔ تمبورا کی آتش فشانی جو جولائی کے مہینے تک جاری رہی۔ جب یہ تھمی تو 32 لاکھ ٹن راکھ اور آتش فشاں مادہ 28 میل تک فضا میں پھیل چکا تھا۔

انگریز گورنر ریفلز نے ایک لیفٹیننٹ فلپس کو سمباوا بھیجا تا کہ وہاں کا حال معلوم کیا جا سکے۔ لیفٹیننٹ فلپ نے اس قدرتی آفت سے پہنچنے والے نقصانات کی جو تصویر کھینچی وہ بڑی گھمبیر تھی۔ اس آفت کی بعد اس جزیرے کی آبادی اتنی کم رہ گئی کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ سمباوا کی شاہراہوں پر فلپس کی آمد تک انسانی لاشے بکھرے پڑے تھے۔ مکانوں کے منہدم ہونے کی وجہ سے گاؤں کے گاؤں ویران ہو چکے تھے۔ ان گاؤں کی باقی آبادی خوراک کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اس جزیرے کے قریب سے گزرنے والے ایک بحری جہاز کے کیپٹن نے لکھا تھا کہ ایک گاؤں جو اجڑ چکا تھا کئی فٹ زیر آب آچکا تھا۔ اس کے باشندوں میں سے بہت سے اس آفت کے دوران بھی جاں بحق ہوگئے جو باقی بچے تھے وہ بیماری اور بھوک سے روزانہ مر رہے تھے۔ اس جزیرے پر کھڑی چاول کی فصل مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھی جس کے بعد زندہ بچنے والے باشندوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس جزیرے میں مرنے والوں کی تعداد 12000 سے تجاوز کر گئی تھی۔

کوہ تمبورا کی یہ آتش فشانی انسانی تاریخ کی سب سے بڑی آتش فشانی تھی۔ یہ 1883ء میں ہونے والی کراکاٹوا کی آتش فشانی سے چار گنا شدید تھی۔ اس قدرت آفت کے بعد پھیلنے والی قحط سالی اور بیماری سے شرح اموات تمام آتش فشانیوں سے بڑھ گئی تھی۔ تمبورا کی آتش فشانی سے جو راکھ خارج ہوئی اس کے گھنے بادل سے پوری دنیا میں درجہ حرارت گر گیا۔ یورپ اور امریکہ میں درجہ حرارت میں کمی کی وجہ سے فصلوں کو شدید نقصان پہنچا۔ سوئٹزر لینڈ جیسے ملک میں قحط سالی کی وجہ سے لوگ کتے بلیاں کھانے پر مجبور ہوگئے۔ نیو یارک کے کسان کم خوراکی سے بچنے کے لیے کاشت کیے ہوئے آلو نکال کر کھانے لگے۔

1840.....ناٹچز، مسسپی کا بگولے دار طوفان

بگولاTorando کم پھیلاؤ کی شدید آندھی کو کہتے ہیں۔ یہ کرہ ارض پر انتہائی تیز ترین ہوا پیدا کرنے والی آندھی کی قسم ہے۔ یہ ستون کی شکل میں 300 میل فی گھنٹہ تک کی رفتار سے چلتی ہے اور سطح زمین سے ہر چیز کو اٹھا کر بلند کردیتی ہے۔ براعظم امریکا میں سب سے زیادہ اور سب سے شدید قسم کے بگولے اور طوفان آتے ہیں اور ان کی اوسط 1000 سالانہ تک ہوتی ہے۔ سب سے شدید ترین بگولے دار طوفان ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دریائے مسسپی کے کنارے واقع شہر ناٹچز Natchez امریکہ میں 7 مئی 1840ء کو آیا تھا۔ اس طوفان میں بگولا تقریباً ایک میل کے محیط میں پھیلا ہوا تھا۔

تقریباً 2 بجے سہ پہر کے بعد اس بگولے نے شہر میں تباہی مچانا شروع کردی اور گھروں کو ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل کرنا شروع کردیا۔ ایک چشم دید گواہ کے مطابق اس بگولے میں اینٹوں اور لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کے علاوہ ہر چیز زمین کی سطح سے بلند ہوکر تیر رہی تھی۔ یہاں تک کہ بیل گاڑیاں بھی اس بگولے نے اٹھا کر دور پھینک دیں تھیں۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا اور وہ بعد ازاں اس کا چشم دید احوال بتانے کے لیے زندہ رہے۔ ان کے مطابق یہ کسی گھومتی ہوئی لہر یا زمین پر ابلتے ہوئے بادلوں کی شکل کا بگولا تھا۔ صرف پانچ منٹ کے اندر اندر اس نے شہر کے رہائشی علاقے کا صفایا کردیا اور 48 افراد جاں بحق ہوگئے۔ خشکی کی نسبت اس بگولے نے دریا پر زیادہ جانی نقصان پہنچایا۔ 60 سے زائد کشتیاں ڈبو دیں اور ایک مسافر بردار فیری کو اس پر سوار ہر ذی روح کے ساتھ غرقاب کردیا۔ ناٹچز کے بعد اس بگولے نے دریائے مسسپی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وڈالیہ، لوئریانا میں اس نے بہت سی عمارات کو زمین بوس کردیا اور جانی نقصان 317 افراد تک جا پہنچا۔

جیسا کہ پہلے ذکر آیا تھا کہ امریکہ میں سالانہ اوسطاً 1000 بگولے دار طوفان یا ٹورینڈو آتے ہیں جو دنیا کی تمام ممالک میں آنے والے ایسے طوفانوں سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ 100 بگولے دار طوفانوں میں سے ایک اتنا شدید ہوتا ہے جتنا ناٹچز میں 1840ء میں آیا تھا۔ تاہم آج کل یہ طوفان انیسویں صدی کے مقابلے میں انتہائی کم خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ خصوصاً شرح اموات کے لحاظ سے کیونکہ آج کے جدید ذرائع کی وجہ سے بگولے دار طوفان اٹھنے سے پہلے ہی اس کا پتہ چلا لیا جاتا ہے اور یہاں تک بھی

معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ بگولے کس سمت میں سفر کریں گے اور ان کے راستے میں آنے والے مقامات سے لوگوں کو محفوظ مقامات پر منتقل کرلیا جاتا ہے۔ موسمیاتی پیشین گوئیاں، مواصلاتی رابطے اور دیگر جدید ذرائع لوگوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے میں موثر کردار ادا کرتے ہیں اور اس طرح شرح اموات بہت کم ہوجاتی ہے۔ 1840ء میں امریکہ کا محکمہ موسمیات صرف اس قابل ہوا تھا کہ موسمیاتی آثار دیکھ کر یا ہوا کی رفتار سے اندازہ لگا کر بگولے دار طوفان کی آمد کی پیشین گوئی کرسکتا تھا۔ ناٹچیز میں بگولے دار طوفان کی آمد سے پہلے جو بارش آئی لوگ اس سے لطف اندوز ہوئے کیونکہ اس سے درجہ حرارت میں کمی واقع ہوئی تھی تاہم انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ خوشگوار بارش انتہائی خطرناک بگولے اور طوفان میں بدل جائے گی۔ اسی دوران لوگ کھانا کھانے کی تیاریاں کررہے تھے۔ عین اس لمحے جب یہ بگولے دار طوفان اٹھا اس وقت شہر کے بہت سے ہوٹلوں میں دوپہر کے کھانے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور بہت سے لوگ میزوں کے گرد کھانے کے لیے بیٹھ چکے تھے۔ امریکہ میں یہ خانہ جنگی سے پہلے کا زمانہ تھا اور امریکی کھیتوں اور گھروں میں دو انسانی طبقات مصروف عمل تھے۔ ایک سفید فام امریکی اور دوسرے سیاہ فام افریقی غلام، غلاموں کے طبقے میں ہونے والی اس طوفان سے اموات کو اخبارات نے ایک فقرے سے زیادہ جگہ نہ دی۔ ''سینکڑوں غلام جاں بحق ہوگئے۔'' جبکہ سفید فام طبقے کے 317 افراد کی موت کو خصوصی طور پر شائع کیا گیا۔

1850ء..... آئر لینڈ میں آلوؤں کا قحط

آلو نئی دنیا سے لایا ہوا ایک تحفہ ہے۔ سترہویں صدی کے وسط میں آلو آئر لینڈ میں متعارف کرایا گیا تھا۔ تین سو سال بعد انیسویں صدی کے وسط تک آئر لینڈ کی زراعت کا انحصار صرف آلو کی فصل پر رہ گیا۔ بعض آئرش کسانوں کے پاس صرف پانچ ایکڑ زمین تھی جس میں آلو کاشت کرکے وہ صرف اپنے پورے خاندان کو خوراک فراہم کرتے تھے۔ مزید برآں یہ کہ آلو آئر لینڈ کی آدھی سے زائد آبادی کی پسندیدہ غذا کی حیثیت اختیار کرچکا تھا اور اسی وجہ سے آئر لینڈ کے ہر گوشہ میں کاشت کیا جاتا تھا۔ گندم اور جو کی کاشت بھی کی جاتی تھی مگر ان فصلوں کی فروخت سے زندگی کے دوسرے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ جبکہ خوراک کے طور پر آلوؤں کو زیادہ استعمال کیا جاتا تھا۔

1741ء میں بارشوں کی زیادتی سے آلوؤں کی فصل متاثر ہوئی تھی جس کے بعد قحط سالی کی کیفیت پیدا ہوجانے کی وجہ سے پانچ لاکھ افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ 1816ء میں بھی آلوؤں کی فصل اچھی نہ ہوئی تھی اور ساتھ ہی ٹائفس بخار کی وباء پھیل گئی تھی جس سے دو سالوں میں 50 ہزار افراد جاں بحق ہوگئے تھے۔ 1845ء کے موسم گرما میں آلوؤں کی فصل پچھلی دوبار سے زیادہ خراب ہوئی کہ آلو کھیتوں میں ہی گل سڑ گئے۔ ایسا ایک خرد بینی فنگس کے حملے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس فنگس نے تین سال پہلے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی آلوؤں کی فصل تباہ کردی تھی۔ پھر یہ فنگس کسی بحری جہاز کے ذریعے بحر اوقیانوس عبور کرکے آئر لینڈ پہنچ گیا۔ ساحل پر چلنے والی ہواؤں اور حشرات الارض نے جلد ہی اسے آئر لینڈ کے آلوؤں کے کھیتوں تک پہنچا دیا۔

برطانیہ کے مختلف جزائر میں بھی یہ فنگس پھیل گیا جس کے بعد نہ صرف برطانیہ بلکہ ہالینڈ اور فرانس سے بھی آلوؤں کے پودے کھیتوں ہی میں گل سڑ جانے کی خبریں آنے لگی تھیں۔ ان خبروں پر پہلے پہل آئر لینڈ میں کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی کیونکہ آلو کے پودے پر اکثر سنڈیوں کا حملہ ہوجاتا تھا مگر اس حملے کو سخت جان آلو کا پودا برداشت کر لیتا تھا۔ 1845ء کا موسم گرما کافی گرم تھا۔ اس سیزن میں آلوؤں کے کھیت، آلوؤں کے چمکیلے پھولوں سے بھر گئے، مگر ستمبر کی آمد کے ساتھ ہی آئر لینڈ میں وائر فورڈ اور ویکس فورڈ کے مقامات پر آلوؤں کے پودوں کے پتے مڑ کر مرجھانے لگے، اور اس تیزی سے کہ ایک پودا اگر ہم

کے وقت بالکل تروتازہ تھا مگر شام تک وہ سیاہ پڑ کر مرجھا چکا تھا اور اس کے آلو بھی گلنے لگے تھے۔ اکتوبر تک یہ آلوؤں کی بیماری آئرلینڈ کی 16 کاونٹیوں میں پھیل چکی تھی مگر اس کے باوجود آئرلینڈ کی حکومت آلوؤں کی فصل کو بہتر قرار دے رہی تھی۔ برطانیہ میں زرعی ماہرین آلوؤں کی اس بیماری کو مرطوب آب وہوا کی وجہ سے پیدا شدہ کہہ رہے تھے۔ جس کی وجہ سے حکومت برطانیہ نے احتیاطی تدابیر آئرلینڈ بھجوائیں، مگر یہ بھی ناکام رہیں۔ ادھر اجنبی فنگس Phyto Phthora نے آئرلینڈ کی آلوؤں کی فصل کو مکمل طور پر تباہ کر کے رکھ دیا جس کے نتیجے میں آئرش کسانوں کے پاس ان کے خاندانوں کو کھلانے کے لیے تھوڑی سی مکئی کے علاوہ کچھ بھی نہ رہا یہ مکئی بھی انہیں برطانوی حکومت نے ایک محدود امدادی پروگرام کے تحت بھجوائی تھی۔

نوبت فاقہ کشی تک آ گئی اور لوگ بھوکوں مرنے لگے جس کے ساتھ ہی مختلف وبائی امراض ہیضہ، ٹائیفس، اسہال اور نمونیا پھیلنے سے سینکڑوں کی تعداد میں روزانہ مرنے لگے۔ ادھر گورکن بھی فاقہ زدگی کی وجہ سے اتنے کمزور ہو گئے کہ قبریں کھودنا ایک دشوار کن کام ہو گیا۔ مرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھنے کی وجہ سے تابوت انتہائی مہنگے داموں بکنے لگے اور تابوت بنانے والے بھی کم پڑ گئے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ کفن تک میسر نہ آنے لگا اور لوگوں کو جن چیتھڑوں میں وہ مرتے انہیں میں دفنایا جانے لگا۔

ادھر برطانوی پروٹسٹنٹوں اور آئرش کیتھولکوں میں مذہبی تعصب انیسویں صدی تک حد سے بڑھ چکا تھا جس کی وجہ سے آئرش لوگ یہ سمجھنے پر مجبور تھے کہ برطانوی حکومت انہیں کیتھولک سمجھتے ہوئے اس مصیبت کی گھڑی میں ان کی مدد کرنے سے تساہل برت رہی ہے اور وہ کیتھولک کو جان بوجھ کر اس آفت کا شکار بنا کر ان کا وجود ہی مٹانا چاہتی ہے۔ تاہم برطانوی حکومت نے آلوؤں کے کاشتکاروں کے لیے ایک امدادی پروگرام بنایا جس کے تحت کسانوں کو دیگر روزگار فراہم کیے گیے، مگر محنت مشقت ان فاقہ کے مارے لوگوں سے بہت کم ہوتی تھی۔ ادھر برطانوی حکومت بھی انہیں قلیل معاوضہ دیتی تھی۔ اس لیے بہت سے لوگ تھکن اور بھوک سے مر گئے۔ 1840ء کی دہائی میں آئرلینڈ کی آبادی 80 لاکھ تھی جو 1900ء تک صرف 40 لاکھ رہ گئی۔ بیس لاکھ لوگ آئرلینڈ سے نقل مکانی کر کے امریکہ اور کینیڈا چلے گئے جبکہ 10 لاکھ سے زائد قحط زدگی سے مر گئے۔ بدقسمتی سے امریکہ نقل مکانی کرتے ہوئے جہازوں کی خستہ حالی کی وجہ سے 20 ہزار افراد سمندری سفر کے دوران ہلاک ہو گئے۔ یوں آلوؤں کا قحط آئرش لوگوں کے لیے ایک طرح کا پیغام اجل ثابت ہوا۔

1863ء.....سان ٹیاگو، چلی میں آتشزدگی

دنیا کی سب سے زیادہ خوفناک یک عمارتی آتش زدگی 8دسمبر1863ء کو سان ٹیاگو، چلی کے ایک گرجا گھر، لاکمپا نیاLa Companiaمیں ہوئی تھی ۔ یہ گرجا گر ان دونوں سان ٹیاگو کا پھول Flower of Santiago کہلاتا تھا۔ اخبار''دی ٹائمز'' کے مطابق یہ گرجا گھر چھت سے فرش تک پردوں سے مزین تھا اور اس میں روشنی کا معقول انتظام تھا۔ اس گرجے کی قربان گاہ میں آویزاں کی گئی حضرت مریم علیہ السلام کی تصویر سے اس گرجے کے پردوں میں آگ بھڑک اٹھی تھی ۔ یہ آگ حضرت مریم علیہ السلام کی تصویر کو پیرافین لیمپوں سے لگی تھی ۔ پھر بہت کم وقت میں یہ آگ پورے گرجے میں پھیل گئی۔ بہت سی خواتین بے ہوش ہوگئیں اور بھگدڑ مچنے کی وجہ سے ہجوم نے انہیں کچل دیا۔

بہت جلد گرجا سے باہر نکلنے والے راستے میں مردہ اور مرتے ہوئے لوگوں کا ڈھیر لگ گیا۔ باہر نکلنے کے لیے دھکم پیل کرتے ہوئے بہت سے لوگ گرجا میں پھنس کر رہ گئے۔ آگ کے مزید پھیلنے اور درجہ حرارت کے بڑھنے سے گرجا گھر کی چھتوں سے پگھلا ہوا سیسہ ٹپکنے لگا تھا اس کی علاوہ لیمپوں سے بہتا ہوا تیل نیچے عوام پر گر رہا تھا جو اس جہنم زار سے نکلنے کے لیے وحشت میں ادھر ادھر دوڑ رہے تھے ۔جلد ہی پورا گرجا کسی انگیٹھی کی طرح دہکنے لگا جس سے باہر نکلنا ناممکن ہو چکا تھا۔ ادھر گرجا گھر میں نہ تو آگ بجھانے کے انتظامات تھے نہ ہی کوئی ہنگامی راستہ اس سے باہر نکلنے کا رکھا گیا تھا۔ گرجا کے باہر کچھ لوگوں نے آگ میں پھنسے ہوئے لوگوں کو رسوں کی مدد سے نکالنے کی کوشش کی۔اسی اثناء میں گرجا گھر کی بڑی گھنٹی نیچے نیم مردہ اور بے ہوش لوگوں پر آ گری۔ اخبار''دی ٹائمز'' نے لکھا کہ اس گھنٹی نے گر کر بہت سے لوگوں کو جان کنی کے عذاب سے نجات دلائی تھی۔

اس آگ کا شکار ہونے والے2000افراد میں زیادہ تر خواتین شامل تھیں۔ ایک ہم عصر مورخ کے مطابق سان ٹیاگو کا کوئی خاندان ایسا نہیں تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد اس سانحہ میں جاں بحق نہ ہوا ہو۔ کوئی ایسا خاندان بھی نہیں تھا جو غمزدہ نہ ہو بلکہ کئی خاندان تو پورے کے پورے اس آتش زدگی میں مارے گئے۔ اس خوفناک سانحے کے فوراً بعد سان ٹیاگو میں آگ بجھانے کا پورا ایک شعبہ وجود میں آ گیا جو اس سانحے سے پہلے قائم نہیں کیا گیا تھا۔

1864ء.....کلکتہ میں سمندری طوفان

5 اکتوبر 1864ء کو ہندوستان کا مشہور شہر کلکتہ بڑی حد تک زیر آب آ گیا اور ایک سمندری طوفان نے اس کے بڑے حصے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سمندری طوفان سے تقریباً 60 ہزار سے زائد لوگ مارے گئے اور مزید کئی ہزار اس طوفان کے بعد پھیلنے والے وبائی امراض کا شکار ہو کر مر گئے ۔اس سمندری طوفان نے دریائے ہگلی کے جنوب سے ہندوستان کے مشرقی ساحل پر یلغار کی تھی ۔ دریائے ہگلی وہ دریا ہے جو دریائے گنگا کے ساتھ مل کر ڈیلٹا بناتا ہے ۔ صبح 10 بجے کے بعد جب یہ سمندری طوفان اس دریا میں داخل ہوا تو اس کی سطح آب بڑھنے لگی اور بڑھتے بڑھتے 40 فٹ بلند پانی کی دیوار بن گئی ۔ پھر یہ بلندی دوپہر تک مزید امواج آنے سے اور بڑھ گئی ۔ پانی کا یہ بڑا ریلہ جب خشکی کی طرف بڑھا تو اس کے راستے میں آنے والی ہر چیز خس وخاشاک کی مانند بہہ گئی جس کے بعد شہر کی بندرگاہ اور اس کے ارد گرد کا علاقہ دوبارہ تعمیر کرنا پڑا۔

دنیا کے مختلف حصوں میں طوفان کو ان کے شدائد کے لحاظ سے مختلف نام دیے جاتے ہیں۔ایشیاء میں جس طوفان کی فتار 39 میل فی گھنٹہ سے کم ہو اسے Tropical Depression کا نام دیا جاتا ہے جبکہ 39 میل فی گھنٹہ سے تیز چلنے والا طوفان Storm کہلاتا ہے اور 73 میل فی گھنٹہ سے زائد رفتار سے چلنے والا طوفان Cyclone کہلاتا ہے۔ ہندوستان کے موسمیاتی حالات کیریبیئن سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں ہوائیں تیز تر ہیں اور بارشیں زیادہ ہوتی ہیں تاہم انیسویں صدی میں موسمی شدائد سے نمٹنے کے لیے کوئی خاص انتظامات نہیں تھے۔ اسی وجہ سے بہت ہی زیادہ جانی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا اور بہت سی عمارات منہدم ہوگئیں۔ اگرچہ ہم آج کل موسمیاتی پیشین گوئیوں اور دیگر ذرائع کے ذریعے انتباہ بھیج کر موسمی شدائد سے نمٹنے کی بہتر صلاحیتیں رکھتے ہیں تاہم 2004ء میں انڈونیشیائی سونامی کے ہندوستان کے مشرقی ساحل سے ٹکرانے کے بعد اس آفت سے بچنے کے لیے انتظامات میں کمی کی وجہ سے بہت سے جانی نقصانات ہوئے۔ اس وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بحیرہ کیریبیئن اور جنوبی امریکی ریاستوں میں آنے والے طوفانوں کے مقابلے میں ہندوستان میں آنے والے طوفان زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔

ان دونوں خطوں میں سب سے پہلے درجہ حرارت میں سخت تفاوت پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کا
سرطان Tropic of Cancer کے جنوب میں واقع ہے جبکہ جنوب مشرقی ریاست ہائے متحدہ امریکہ ا
کے شمال میں واقع ہے۔ اس وجہ سے ہندوستان کے قریبی سمندروں کا درجہ حرارت امریکہ کے قریبی
سمندروں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ سے ہوائیں زیادہ مقدار میں آبی بخارات کو ہندوستان کی سرزمین کی
طرف کھینچ کر لاتی ہیں اور بارش کا اوسط یہاں بہت زیادہ ہے۔ کلکتہ اور اس کے ارد گرد کے پہاڑی
علاقے جن کی بلندی 4000 فٹ سطح سمندر سے بلند ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بارشوں کا ریکارڈ رکھتے
ہیں۔ ان علاقوں میں 450 انچ سالانہ بارش تک ہوتی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بارش چراپونجی بنگال قریب
میں ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر چہ کلکتہ میں بہت کم بارش ہوتی ہے مگر پھر بھی یہاں سمندر کے ا
قریب ہونے کے وجہ سے بارش کی اوسط بہت زیادہ ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بحیرہ کیریبین کے ا
مقابلے میں بحر ہند بڑا وسیع وعریض سمندر ہے۔ اسی وجہ سے اس سمندر میں چلنے والی ہوائیں زیادہ رفتار قریب
سے چلتی ہیں اور بحیرہ کیریبین کے مقابلے میں یہاں زیادہ شدید طوفان آتے ہیں۔

1737ء میں خلیج بنگال کے شمال میں آنے والے ایک سمندری طوفان نے شدید تباہی مچائی تھی اور
ہزاروں افراد جاں بحق ہوگئے تھے۔ اسی طرح 1864ء کے صرف پچیس سال بعد یعنی 1889ء میں آنے
والے ایک اور سمندری طوفان نے اس خطے میں شدید تباہی مچائی تھی۔ ہندوستان کا یہ علاقہ ہمیشہ ہی سے
طوفانوں کی زد میں رہا ہے اور ان طوفانوں سے اس علاقے کے باشندوں کو شدید نقصانات کا سامنا رہا
ہے مگر دوسری طرف اس خطے میں مون سون کی بارشیں اس خطے کو زرخیز ترین خطہ بھی بناتی ہیں اور بنگال
اور دیگر ہندوستانی کاشتکاروں کی فصلوں کا انحصار بھی انہیں پر ہے۔

اس خطے میں آنے والے طوفان برطانوی بحری جہازوں کے لیے بھی انیسویں اور اٹھارہویں صدی
میں بہت نقصان دہ تھے اور اس زمانے میں انگریز افسروں کو ہندوستان کے اس خطے کے متعلق موسمیاتی
معلومات کی کمی کا سامنا بھی تھا۔ 1864ء میں آنے والے اس سمندری طوفان میں کلکتہ کی بندرگاہ میں
موجود جہازوں میں ایک Proserpine نامی جہاز تھا جو اس طوفان میں پھنس کر کلکتہ کی بندرگاہ سے
200 میل دور طوفانی ہواؤں نے دھکیل دیا تھا۔ 24 گھنٹے تک اس شدید سمندری طوفان کا مقابلہ کرنے کے
بعد جب یہ جہاز پرسکون سمندری علاقے میں پہنچا تو یہ پانی کی سطح پر تیرنے کے قابل نہیں رہا تھا اور اس
کے جہازی جہاز سے طوفان کا پانی نکال نکال کر ادھ موئے ہو چکے تھے۔

1865ء.....بحری جہاز ''سلطانہ'' کی غرقابی

اینڈرسن وائل Anderson Vile امریکہ کی خانہ جنگی کے دنوں میں بدنام زمانہ کنفیڈریٹ جنگی قیدیوں کا کیمپ تھا جہاں 45000 امریکی یونین فوجی قید تھے۔اس جنگی کیمپ کی حالت ناگفتہ بہ تھی ۔وبائی امراض اور بھوکوں مرنے سے یہاں تقریباً 13000 فوجی قیدی ہلاک ہوچکے تھے ۔ اپریل 1865ء میں امریکہ کی خانہ جنگی اختتام پذیر ہوئی تو 1700 ٹن وزنی دخانی بحری جہاز ''سلطانہ'' امریکی یونین کے جنگی قیدیوں کو وہاں سے واپس وطن لانے کے لیے بھیجا گیا۔ یہ جہاز خانہ جنگی کے ایام میں جنگی دستوں کو مختلف مقامات پر پہنچانے کی خدمات سرانجام دیتا رہا تھا۔ اسی وجہ سے اس جہاز کی مرمت اور بحالی کا کام بھی کیا جانا تھا۔مگر یونین کے فوجی دستوں کو وطن واپس پہنچانا بھی ایک فرض عین تھا جس کی ادائیگی کے لیے سلطانہ 21 اپریل 1865ء کو نیو اورلینز سے سنسناٹی کے لیے روانہ ہوا۔ نیو اورلینز سے روانگی کے وقت اس پر 100 مسافر اور 80 عملے کے ارکان سوار تھے۔ اس کے علاوہ چینی کی بوریاں ،100 گھوڑے کچھ ،سور اور ایک 10 فٹ لمبا مگر مچھ بھی اس جہاز پر لادا گیا تھا۔

سلطانہ جب وکسبرگ کی بندرگاہ واقع مسسپی میں رکا تو پتہ چلا کہ اس جہاز کا ایک بوائلر لیک ہے جس کی فوراً مرمت کر دی گئی۔ بعد ازاں وکسبرگ سے ہی 2400 یونین فوجی جو اینڈرسن وائل کے جنگی کیمپ سے رہا ہوئے تھے اور 80 کے قریب شہری اس جہاز پر سوار ہوئے ۔جہاز کے عملے یا بندرگاہ کے حکام نے ان مسافروں کی کوئی باقاعدہ فہرست مرتب نہ کی بلکہ بعد ازاں مرتب کی جانے والی ایک رپورٹ کے مطابق اس جہاز پر اس کی استعداد سے 6 گنا زیادہ مسافر سوار تھے اور یہ بری طرح اوور لوڈڈ تھا۔

یہ جہاز وکسبرگ سے روانگی کے دو دن بعد امریکی ریاست ٹینیسی کی بندرگاہ میمفس پہنچا تو اس کا مرمت شدہ بوائلر دوبارہ لیک ہوگیا۔ اس کی ایک مرتبہ پھر مرمت کی گئی۔میمفس کی بندرگاہ پر اس جہاز سے کچھ افراد اترے وہ باقی سوار لوگوں سے خوش قسمت ثابت ہوئے جو اس جہاز کے ساتھ غرقاب ہوگئے تھے۔ سلطانہ نے یہاں سے ایندھن (کوئلہ) لیا اور ایک بار پھر سنسناٹی کے لیے روانہ ہوگیا۔ اثنائے راہ میں 27 اپریل کی رات دو بجے سلطانہ کا دو مرتبہ مرمت شدہ بوائلر پھٹ گیا ۔ بوائلر پھٹنے سے اتنا شدید

دھماکہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کے جسموں کے چیتھڑے اڑ گئے اور بہت سے لوگ جہاز سے سمندر میں گرے۔ اس دھماکے کے فوراً بعد اس جہاز میں آگ بھڑک اٹھی جس سے اس جہاز کا کپتان حوصلہ ہ بیٹھا۔ادھر فوجیوں نے آگ کے خوف سے سمندر میں چھلانگیں لگانا شروع کردیں۔ پانی میں چھلانگ لگانے والے ان امریکی فوجیوں میں سے بہت سے تیرنا نہیں جانتے تھے اسی وجہ سے وہ تیراک فوجیوں سے چمٹ گئے نتیجتاً تیراکوں کو بھی ساتھ لے ڈوبے۔

رات کے آخری پہروں میں سلطانہ اپنی ہی آگ میں جل رہا تھا۔بہت سے فوجی جو اس پر سوار تھے وہ جہاز کے اگلے حصے میں کھڑے ہوکر جہاز کی عقبی حصے کو جلتا ہوا دیکھ رہے تھی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں آگ کا رخ اگلے حصے کی طرف ہوگیا۔خوفزدہ فوجیوں نے آگ کے جہنم سے بچنے کے لیے سمندر میں چھلانگ لگا دی ۔ان فوجیوں میں سے چند زندہ باقی بچے۔

ایک چشم دید گواہ جو پہلے دھماکے کے بعد سمندر میں جا گرا تھا اس نے بتایا کہ جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو پانی میں پایا۔ اس کے پاس بہت سے لوگ پانی میں گرے ڈوبنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔قریب ہی ایک گھوڑا بھی سمندر میں گرا ہوا تھا۔ اس بے چارے جانور سے دس خوفزدہ انسان چمٹے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہ جانور بھی زیر آب چلا گیا۔کچھ لوگ جہاز سے گرے ہوئے بیرلوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ان میں سے ایک کا چہرہ بالکل جھلس گیا تھا مگر وہ درد سے چیخنے کی بجائے بے چینی سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

اس حادثے کے بعد تین اور امریکی بحری جہاز امداد بہم پہنچانے کے لیے جائے حادثہ کی طرف روانہ ہوگئے تاہم ان کے پہنچنے سے پہلے ہی سلطانہ پر سوار فوجیوں میں آدھے جل کر مر چکے تھے اور باقی پانی میں ڈوب گئے تھے۔ جلے ہوئے فوجیوں کی لاشیں کئی دن تک دریائے مسسپی کے پانی میں نمودار ہوتی رہیں۔

سلطانہ کی غرقابی امریکہ کی بحری تاریخ میں ایک بڑا حادثہ تھا مگر چونکہ خانہ جنگی اخبارات میں لوگوں کی توجہ کھینچے ہوئی تھی اس لیے اس حادثے کو اخبارات نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ دوسرے اس حادثے سے صرف 12 دن پہلے مشہور۔امریکی صدر ابراہم لنکن کو قتل کردیا گیا تھا اور اخبارلت اس سانحے کی کوریج میں مصروف تھے ۔اخبارات کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ ابلاغ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے بھی اس حادثے کو کوئی خاص کوریج نہ مل سکی تھی۔

1871ء.....شکاگو کی خوفناک آتشزدگی

تاریخ عالم میں انیسویں صدی کی آخری دہائیوں تک جتنی آتشزدگی ہوئیں ان میں سب سے بڑی اور تباہ کن آتشزدگی شکاگو، ایالت illinoin امریکہ میں 18 اکتوبر 1871ء کو رونما ہوئی۔

1871ء میں شکاگو شہر کی عمر صرف 40 سال تھی یعنی اسے آباد ہوئے صرف 40 سال گزرے تھے، وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا سب سے تیزی کے ساتھ نشوونما پانے والا شہر تھا۔ تاہم اس زمانے میں اس شہر کی 60 ہزار عمارات میں سے 40 ہزار عمارتیں لکڑی سے تعمیر کی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ اس شہر کی گلیوں کو بھی لکڑی کے تختوں کے ساتھ ہی پختہ بنایا گیا تھا۔ لکڑی کے فرش والی اس کی گلیوں اور شاہراہوں کی طوالت 650 میل تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس شہر میں آگ لگنے کا سامان بدرجہ اتم موجود تھا۔ کوئلے اور لکڑی کے کوداں، لکڑی کا فرنیچر بنانے کی فیکٹریاں، گھروں کے فرش بھی لکڑی سے بنائے گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ شہر باآسانی کسی وقت بھی آتش زدگی کا شکار ہوسکتا تھا۔ پھر 18 اکتوبر 1871ء کو رات کو پونے 9 بجے شکاگو کے ایک اناج گھر میں آگ بھڑک اٹھی۔ یہ اناج گھر شہر کے مغربی علاقہ ڈی کون سٹریٹ Dekoven Street میں پیٹرک اولیری Patric O'leray کے گھر کے عقب میں واقع تھا۔ کہتے ہیں اس شام پیٹرک اولیری کی بیوی جب اپنی ایک گائے کا دودھ نکالنے لگی تو گائے نے مٹی کے تیل کے ایک لیمپ کو لات ماردی تھی جس سے وہ لیمپ پچھواڑے میں واقع اناج کی کوٹھی میں جا گرا اور آگ لگ جانے کا باعث بن گیا تھا تاہم مسز اولیری اس کے میاں اور اس کے بچوں نے بعد ازاں حلفیہ بیان پر بیان دیا تھا کہ جب آگ بھڑکی اس وقت وہ اپنی خواب گاہوں میں سوئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اولیری کے لنگڑے ملازم ڈینس پر شک کیا گیا کہ وہ اس اناج گھر میں رات کے وقت چپکے سے شراب پینے کے لیے چوری چھپے داخل ہوا تھا اور جب اس نے اپنا پائپ سلگایا تو بے خیالی میں ماچس کی تیلی فرش میں پھینک دی جو آتش زدگی کا باعث بن گئی۔ مگر ڈینس نے حلفیہ بیان میں بتایا کہ جب آگ لگی وہ گلی کے اس پار تھا اور آگ کے شعلے دیکھ کر اس نے "آگ آگ" کا شور مچایا اور پھر دوڑ کر مسٹر اولیری کے گھوڑے اور مویشی کھول کر آزاد کرنے کی کوشش کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اسی اثناء میں اس کی لکڑی کی بنی ہوئی ٹانگ اس سے الگ ہو کر گر گئی اور اسے ایک چھڑے سے چپٹ کر اس آتش زدہ

اناج گھر سے نکلنا پڑا۔

تقریباً 9 بجے شب آس پاس کے پڑوسی آگ دیکھ کر قریبی فائر الارم سسٹم کے قریبی سیل کی طرف دوڑے مگر کسی وجہ سے پورے شہر سے منسلک اس فائر الارم ٹیلی گراف سسٹم سے اطلاع نہ بھجوائی جاسکی اور اس طرح فائر ڈیپارٹمنٹ کو مزید 20 منٹ اطلاع نہ بھجوائی جاسکی۔ اسی اثناء میں قریبی فائر اسٹیشن کے منارے سے ایک چوکیدار نے آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے دیکھے اور آگ بجھانے والے عملے کو اطلاع دی مگر جب یہ عملہ وہاں پہنچا تو آگ مسٹر اولیری کے اناج گھر کے آس پاس میں گھروں تک پھیل چکی تھی۔ اس کے علاوہ آگ بجھانے والے عملے کے اکثر ارکان گزشتہ شب کی ایک آگ بجھانے میں مصروف ہونے کی وجہ سے تھکے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک آگ بجھانے والے انجن کے کام کرنے کی وجہ سے بھی آگ پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ رات دس بجے تک شہر کے پانچ نمبر بلاک سینٹ پال کے گرجا گھر تک آگ پہنچ چکی تھی۔ پھر ایک فرنیچر فیکٹری اس آگ کی زد میں آگئی۔ فیکٹری میں آگ پکڑنے والا سامان بھرا ہوا تھا۔ اس وقت اس علاقے میں ہوائیں 60 میل فی گھنٹہ رفتار سے چل رہی تھی جس کی وجہ سے آگ مزید بھڑک اٹھی۔

امید تھی کہ دریائے شکاگو کی جنوبی شاخ اس آگ کو بڑھنے سے روک دے گی مگر اس دریا میں گرنے کی وجہ سے خود دریا میں کئی مقامات پر آگ بھڑک اٹھی۔ ساڑھے گیارہ بجے رات کے قریب آگ نے اس طرح دریا عبور کرکے شہر کے جنوبی حصے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور یہ شہر کے کوئلہ خانوں والے علاقے میں بھی پھیل گئی۔ آگ کا اگلا ہدف شہر کے زیریں حصے میں واقع شہر کا تجارتی مرکز تھا۔ اس علاقے میں واقع پوسٹ آفس، کراس بی اوپیرا ہاؤس، فائر ڈیپارٹمنٹ اور اخبار شکاگو ٹرائبیون سب جل کر خاکستر ہوگئے۔ اخبار شکاگو ٹرائبیون نے ایک ضمیمہ کے ذریعے شہر کو خبردار کیا تھا کہ آگ میلوں میں پھیل چکی ہے۔ ڈیڑھ بجے شب تک ملحقہ عمارات خالی کرالی گئیں تاکہ جانی نقصان سے بچا جائے۔ اب آگ دریائے شکاگو کی مین شاخ تک پہنچ چکی تھی، اور سوال یہ تھا کہ کیا یہ اس آگ کو بڑھنے سے روک دے گی؟ اور شہر کا شمالی علاقہ محفوظ رہے گا۔ مگر دریا کی یہ شاخ بھی آگ کو روکنے میں ناکام رہی کیونکہ دریا میں جلتا ہوا ملبہ بڑی مقدار میں گر گیا تھا جس کی وجہ سے آگ دریا عبور کرنے میں کامیاب رہی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر واقع واٹر ورکس جلد ہی شعلوں میں گھر گیا۔ صبح 3 بجے تک اس کی ورکس کی عمارت جل چکی تھی اور اس کے پمپ کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔ آگ بجھانے والا عملہ اگرچہ دوسرے شہروں سے بھی شکاگو پہنچ گیا مگر پانی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ نہ کرسکا۔

[illegible] تین لاکھ مکینوں میں سے تقریباً 75 ہزار افراد اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ چکے تھے

کچھ جھیل میں جا گھسے اور انہوں نے صرف اپنی سروں کو پانی سے بلند رکھا۔ جب جلتے ہوئے لکڑی کے شہتیر جھیل کے پانی میں گرتے تو وہ ایک طرف ہٹ جاتے ۔ ایک شخص نے ریت کا گھروندا بنا کر اپنے بیوی بچوں کی جان بچائی اور انہیں آگ سے محفوظ کیا۔ جھیل میں وہ لوگ ڈوب گئے جو کشتیوں میں پناہ لیے ہوئے تھے اور ان کی کشتیوں کو آگ لگ گئی ۔ امراء نے ان حالات میں اپنی قیمتی اشیاء اپنے غلاموں کے ذریعے زمین میں دفن کرائیں تا کہ انہیں بچایا جاسکے۔ جبکہ حکام نے آگ کے راستے میں آنے والے مکانات کو گرانا شروع کردیا تا کہ آگ کو مزید بڑھنے سے روکا جاسکے۔ 9 اکتوبر کو سہ پہر 5 بجے تک آگ مزید بڑھ چکی تھی اور شکاگو ریونیو برج آگ پکڑنے کے بعد دھات کے مڑے تڑے ٹکڑوں میں بدل چکا تھا۔ اگلی رات تقریباً 11 بجے بارش کے شروع ہونے کے بعد کہیں جا کر آگ بجھ گئی ،مگر اس وقت تک پورا شہر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔

شہر کے 2100 ایکڑ رقبے میں سے تقریباً 1800 عمارات تباہ ہوچکی تھیں اور تقریباً ایک لاکھ افراد بے گھر ہوچکے تھے۔ سرکاری اعدادوشمار کے مطابق 300 کے لگ بھگ افراد جاں بحق ہوئے تھے مگر حقیقتاً شرح اموات اس سے کہیں زیادہ تھی اور بہت سی لاشیں جل کر اتنی مسخ ہوگئی تھیں کہ ان کی شناخت نہ ہوسکی تھی۔

اخبار ''ایوننگ جرنل'' کی اشاعت میں دیے گئے اعدادوشمار کے مطابق شہر کے تمام بڑے ہوٹل،عوامی عمارات ،تمام بینک، تمام اخبارات کے دفاتر اور تمام تفریحی مقامات، تمام تجارتی مراکز، تمام ریلوے ڈپو، واٹر ورکس اور گیس ورکس، کئی گرجا گھر، سینکڑوں نجی رہائشی مکانات اور دیگر عمارات جل کر خاکستر ہوگئیں تھیں۔ امریکہ کا عظیم شہر شکاگو راکھ ڈھیر میں بدل کر اپنی تمام شان وشوکت کھوچکا تھا۔ تاہم اگلے ہی دن شہر کے معمار سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور جلد ہی شہر کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ کچھ ہی دنوں میں شہر کے اخبارات دوبارہ جاری کردیے گئے ۔ تقریباً ایک ہفتے کے بعد شہر میں پانی کی فراہمی دوبارہ شروع کردی گئی اور صرف چھ ہفتوں میں شہر کی بہت سے عمارتیں جو اینٹوں اور پتھروں سی تعمیر کی گئی تھیں بحال کردیں گئیں ۔شہر میں تعمیر کی جانے والی نئی عمارات پہلی عمارات سے ہر طرح بہتر اور خوبصورت تھیں۔ صرف ایک دہائی میں ایک نیا شکاگو پہلے شکاگو کی راکھ سے ابھر کر سامنے آ گیا۔ حیرت انگیز طور پر مسٹر اولیری کا گھر آگ سے محفوظ رہا تھا مگر اولیری کو شہر کے لوگوں کی ناراضگی سے بچنے کے لیے شکاگو چھوڑنا پڑا تھا۔

1881ء..... ہے فونگ، ویتنام کا سمندری طوفان

ویتنام کا شہر ہے فونگ Haiphong خلیج ٹونکن Gulf of Tonkin کے کنارے واقع ہے۔ یہ ویتنامی شہر جزائر فلپائن کے ارد گرد اٹھنے والے سمندری طوفانوں کے راستے میں واقع ہے۔ یہ طوفان بحر الکاہل سے گزر کر ایشیا کی سرزمین تک اسی راستے سے پہنچتے ہیں۔

15 ستمبر 1881ء کو آنے والے ایک شدید سمندری طوفان نے ہے فونگ اور ملحقہ علاقوں کو تاراج کر کے رکھ دیا تھا۔ 30000 افراد جاں بحق ہو گئے۔ اس زمانے میں ویت نام میں سمندری طوفان سے بچنے کے لیے حفاظتی انتظام نہ ہونے کے برابر تھے۔ نہ ہی ساحل کے قریب کوئی حفاظتی پشتے موجود تھے۔ اس لیے شدید جانی مالی نقصانات سے کسی طور پر بچا نہیں جا سکا۔ تاہم آج کل بھی سمندری طوفانوں کے خلاف احتیاطی تدابیر کرنا اور ان سے پہنچنے والے نقصانات کو کم کرنا بہت مشکل کام ہے۔

جنگ عظیم دوم کے دوران امریکی جنگی بحری بیڑے کے کمانڈر ایڈمرل ولیم ہیلسے William Halsey کو ایک ایسے ہی سمندری طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طوفان میں پھنس کر اس کے بیڑے کے 780 جہازی ہلاک ہو گئے تھے۔ تین تباہ کن بحری جہاز غرق ہو گئے اور 100 کے قریب جنگی طیارے لاپتہ ہو گئے تھے۔ اس طرح امریکہ بحری بیڑے کو دشمن کا سامنا کرنے سے پہنچنے والے نقصانات سے کہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

1881ء میں آنے والے سمندری طوفان سے بہت پہلے جاپانیوں کو امریکی ایڈمرل ہیلسے ہی کی طرح بحرالکاہل میں اٹھنے والے ان سمندری طوفانوں کی شدت کا پتہ چل گیا تھا۔ 1281ء میں ایک منگول بحری بیڑے نے جاپان پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس بحری بیڑے کے جہاز ایک ایسے ہی سمندری طوفان میں تباہ ہو گئے تھے۔ اس واقعہ کی یاد آج بھی جاپانی زبان کا لفظ Kamikaze دلاتا ہے جس کے معنی ''آسمانی مددگار ہوا'' کے بنتے ہیں۔ اسی لفظ کے ایک معنی خودکشی کے بھی ہیں جو جنگ عظیم دوم میں Kamikaze پائلٹوں کی خودکشی کی یاد دلاتے ہیں۔

ویت نام کا شہر ہے فونگ دریائے سرخ کے ڈیلٹا میں ہنوئی سے 60 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر صدیوں سے شمالی ویت نام کی ایک بندرگاہ رہی ہے اور اسی وجہ سے ویت نام کی تجارت کا مرکز بھی

رہا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جب ویت نام ایک فرانسیسی نوآبادی قرار پایا تھا تو یہ فرانسیسی بحریہ کا ہند چینی کے علاقے میں اہم ترین مرکز بن گیا تھا۔

جنگ عظیم دوم کے بعد جب ویت نام نے فرانسیسیوں سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی شہر پر فرانسیسیوں نے عسکری اقدام کیا تھا۔ جنگ ویت نام (بیسویں صدی کے نصف) کے دوران امریکہ نے ہے فونگ پر شدید بم باری کی تھی اور اسے تباہ کردیا تھا۔ جنگ کے بعد اس شہر کی تعمیر نو کی گئی اور یہ ایک صنعتی مرکز بن گیا۔ 27 ستمبر 2005ء کو علی الصبح اس شہر کو تقریباً 124 سال بعد ایک بار پھر ایک شدید سمندری طوفان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

تاہم اس مرتبہ اس شدید سمندری طوفان کی آمد کا پہلے ہی سے علم ہونے کی وجہ سے حفاظتی اقدامات کرلیے گئے تھے اور ساحلی علاقوں سے 2000 افراد کو محفوظ مقامات پر منتقل کردیا گیا تھا۔ ساحل کے قریب حفاظتی پشتے بھی موجود تھے جو اس طوفان کی آمد سے سالوں پہلے تعمیر کرلیے گئے تھے تاکہ نقصانات کم سے کم ہوں۔ اس مرتبہ بھی یہ سمندری طوفان بحیرہ فلپائن میں 20 ستمبر 2005ء کو اٹھا تھا۔ پھر یہ لوزون Luzon کے علاقے سی گزرتا ہوا بحیرہ جنوب چین کے گرم پانیوں تک پہنچ گیا اور اس نے ایک ٹائفون کی شکل اختیار کرلی یہ ٹائفون جزائر ہینان Hainan Island سے گزرتا ہوا 25 ستمبر 2005ء کو ویت نام کے ساحلوں تک پہنچ گیا۔ 27 ستمبر کو اس نے 100 میل فی گھنٹہ کی رفتار حاصل کرلی۔ ویت نامی حکام بھی اس ٹائی فون کی آمد پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہ کئی دہائیوں میں آنے والا سب سے شدید سمندری طوفان تھا۔ اس طوفان کے ساتھ ساتھ سیلابی ریلے بھی تھے جن کی وجہ سے اس مرتبہ 180 افراد جاں بحق ہوگئے جن میں آدھے ہے فونگ سے تعلق رکھتے تھے۔

ویت نام کے نائب زیراعظم نے بہت سے ویت نامی افسروں کے ساتھ 27 ستمبر کو ہے فونگ کا دورہ کیا تھا تاکہ سمندری طوفان سے پہنچنے والے نقصانات کا اندازہ کیا جاسکے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک حفاظتی پشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے شدید نقصان پہنچا تھا اور شہر کا امدادی مرکز بھی امدادی کارروائی عمل میں نہ لاسکا تھا۔ اس طوفان کی آمد کے چند دن بعد ویت نام کی حکومت کو عالمی برادری سے مدد کی اپیل کرنا پڑی تھی اور 20 لاکھ امریکی ڈالر کی نقد اور سامان کی طلب کی گئی۔

1883ء.....کراکاٹوا کی آتش فشانی

ماضی میں جزائر شرق الہند کہلانے والے انڈونیشیا میں انیسویں صدی میں دنیا کی دو بڑی آتش فشانیاں ہوئیں جو اس علاقے میں گزشتہ 1000 میں ہونے والی بڑی آتش فشانیاں تھیں۔ ایک کوہ تمبورا کی آتش فشانی جو 1815ء میں ہوئی جبکہ دوسری کوہ کراکاٹوا کی جو 1883ء میں ہوئی تھی۔ کراکاٹوا جاوا اور سماٹرا کے درمیان واقع تھا۔ آتش فشانی سے پہلے یہ سطح سمندر سی 6000 فٹ بلند تھا جبکہ آتش فشانی کے بعد یہ زیر آب آ گیا اور اس کی بلندی سطح سمندر سے بھی کم رہ گئی تھی۔ اگرچہ کراکاٹوا کی شدت تمبورا کی شدت سے دس گنا کم تھی مگر اس کے باوجود اس کے تباہ کن اثرات پوری دنیا میں مرتب ہوئے تھے۔ کراکاٹوا کے پھٹنے سے جو آواز یا دھماکہ پیدا ہوا تھا وہ پوری انسانی تاریخ کی سب سے بلند آواز تھی۔

کراکاٹوا جاوا اور سماٹرا کے درمیان آبنائے سنڈا Sunda Strait میں واقع ہے۔ پوری انڈونیشیا کی تاریخ میں یہ ایک غیر آباد جزیرہ رہا ہے جس پر وقتاً فوقتاً لوگ سیر کے لیے آ جاتے تھے۔

کراکاٹوا گزشتہ بیس لاکھ سال میں صرف ایک بار پھٹا تھا اور ایک خاموش آتش فشاں تھا۔ تاہم مئی 1883ء سے اس آتش فشاں کے دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ انڈونیشیا کے نزدیکی آباد جزائر کے لوگوں نے اسے معمول کے مطابق بات سمجھتے ہوئے قابل توجہ نہیں سمجھا اور اس پہاڑ پر چڑھ کر لوگوں نے اس کے ابلتے ہوئے دہانے میں جھانکنے کی کوششیں کیں۔ چونکہ اس موسم گرما کے شروع میں ہونے والے دھماکوں کو خطرناک نہیں سمجھا گیا لہٰذا اس علاقے سے لوگوں کو نکالا بھی نہ گیا جس کی وجہ سے کافی جانی نقصان ہوا۔

اتوار 26 اگست کی دوپہر کے بعد کراکاٹوا کے دہانے میں دھماکوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا اور آتش فشاں راکھ کی بارش ہونے لگی جو آبنائے سنڈا میں موجود بحری جہازوں اور لوگوں کے مکانات پر گرنے لگی۔ یہ سلسلہ اگلے چوبیس گھنٹے تک جاری رہا اور سوموار کے دن اس پہاڑ پر 4 بڑے دھماکے ہوئے۔ پہلا دھماکہ دن 10 بجے کے قریب ہوا جو اتنا شدید تھا کہ اس نے واقعتاً پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس دھماکے کی آواز اتنی بلند تھی کہ اس نے جنوبی آسٹریلیا میں اپنے گھروں میں سوئے ہوئے لوگوں کو جگا دیا۔ آسٹریلیا کا یہ علاقہ کراکاٹوا سے دو ہزار پانچ سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

کراکاٹوا کے پھٹنے سے راکھ کا بادل 50 فٹ بلندی تک گیا اور آتش فشانی سے پھیلنے والی گرد کرہ ارض کے تقریباً ہر کونے تک پہنچی۔ اس دھماکے سے جو شاک ویوز Shock Waves پیدا ہوئیں انہوں نے تقریباً سات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کرہ ارض کے گرد سات چکر لگائے۔ تین مرتبہ ایک سمت میں اور 4 مرتبہ اس کے عمل معکوس میں۔ آتش فشاں سے نکلنے والی راکھ اتنی دبیز تھی کہ آبنائے سنڈا پر پورے دو دن تک تاریکی چھائی رہی اور رات کا سماں رہا۔ کراکاٹوا کے ساتھ ساتھ اس جزیرے پر موجود دیگر 17 چھوٹے آتش فشاں بھی پھٹ پڑے۔ ان سب کی آتش فشانی سے جزیرے کے اردگرد کے سمندر کا درجہ حرارت 60 درجے سنٹی گریڈ تک بڑھ گیا۔ جاوا ور سماٹرا کے گرد واقع سمندر پر دس فٹ موٹی آتش فشاں راکھ کی تہہ جم گئی۔ دھماکے کی وجہ سے سمندر میں سونامی یا ایک اونچی موج پیدا ہوئی جس نے آس پاس کی آبادیوں میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائی۔ اس سونامی کے اثرات جنوبی امریکہ جیسے دور دراز علاقوں تک بھی دیکھنے میں آئے۔

100 سے 120 فٹ بلند سونامی نے 300 ساحلی آبادیوں کو تاراج کیا اور 36 ہزار سے زائد افراد ہلاک ہوگئے۔ مرنے والوں میں زیادہ تعداد اس لہر سے پیدا ہونے والی سیلابی کیفیت میں ڈوب کر ہلاک ہوئی تھی۔ جبکہ آتش فشاں لاوے کے پھیلنے سے بہت کم ہلاکتیں ہوئیں۔ کراکاٹوا پر ہونے والے دھماکے اتنے شدید تھے کہ آبنائے سنڈا میں موجود دیگر چھوٹے چھوٹے جزائر اور خود کراکاٹوا کے جزیرے کا پچاس مربع میل کا علاقہ سمندر میں ڈوب گیا۔

جزائر انڈونیشیا کے درمیان سفر کرنے والے بحری جہازوں میں سے اکثر شاک ویوز کی وجہ سے ڈوب گئے اور سماٹرا اور دیگر جزائر کی بندرگاہوں میں لنگر انداز جہازوں کو سونامی نے اٹھا کر میلوں دور خشکی پر لا پھینکا۔ انہیں جہازوں میں ایک ڈچ گن بوٹ ''ہیرو'' شامل تھی یہ سماٹرا کی بندرگاہ سے ایک میل دور گھنے جنگل سے ملی تھی۔

کراکاٹوا کی آتش فشانی سے جو گرد فضا میں پھیلی وہ اتنی کثیف تھی کہ جنوبی امریکا میں اگلے دو سال تک دوپہر کے وقت سورج نیلا نظر آتا تھا جبکہ جزائر ہوائی میں اس آتش فشانی کے کئی ماہ بعد تک سورج غروب ہونے کے وقت سبز دکھائی دیتا تھا۔

صرف یہی نہیں بلکہ اس سانحہ کے کئی ماہ بعد تک پوری دنیا میں غروب آفتاب کا منظر قابل دید تھا کہ ایسا لگتا تھا جیسے افق پر مختلف رنگوں کی آگ جل رہی ہو۔ یہاں تک کہ اکتوبر 1883ء میں امریکی ریاست کنکٹی کٹ کے علاقے نیو ہیون میں جب لوگوں نے غروب آفتاب کے وقت افق پر پھیلے ہوئے سرخ رنگ کے شعلے دیکھے تو آگ بجھانے والے عملے کو ٹیلی فون کردیا۔ براعظم امریکہ کے مشرقی ساحلوں

غروب آفتاب کے وقت ان دنوں ایسے ہی منظر دیکھنے میں آئے۔

اس آتش فشانی کے بعد کوہ کراکاٹوا سمندر میں ڈوب گیا اور اس کی جگہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ابھر
جو انڈونیشیائی زبان میں افلک کراکاٹوا کہلاتا ہے یعنی کراکاٹوا کا بچہ۔ یہ چھوٹا سا آتش فشانی جزیرہ سمو
میں اس حادثہ کے 45 برس بعد یعنی 1928ء میں ایک ہلکے سے دھماکے کے بعد ابھرا تھا۔ اس جزیرے
اکثر چھوٹے چھوٹے دھماکے ہوتے رہتے ہیں، مگر اس کا امکان نہیں ہے کہ یہ پہلے جیسی شدید طاقت
دھماکے سے دوچار ہو۔

1887ء.....چین کے دریائے زرد میں سیلاب

چین کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس خطے کے دونوں بڑے دریاؤں دریائے زردYellow Riverاور دریائے یانگٹز Yangtze River میں اکثر سیلاب آتے رہے ہیں۔ دریائے زرد جو دنیا کا سب سے گہرا دریا ہے یہ 2877 میل کا سفر طے کر کے سمندر میں گرتا ہے اور اپنے ساتھ 1.6 بلین ٹن زرد رنگ کی دریائی تلچھٹ بھی سمندر میں سالانہ گراتا ہے۔ اس دریا کو چین کے دکھ China's Sorrow کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اس دریا میں گزشتہ 3000 سال میں 1500 کے قریب سیلاب آ چکے ہیں۔ شاہان زو جنہوں بارہویں صدی قبل از مسیح سے تیسری صدی قبل از مسیح تک چین پر حکومت کی تھی ۔ انہوں نے نوجوان لڑکیوں کو بطور قربانی اس دریا میں پھینک کر اس کے سیلابوں کو روکنے کی کوشش کی تھی جیسے قدیم مصر میں دریائے نیل کی روانی کو بحال کرنے کے لیے مصری ایک خوبصورت دوشیزہ ہر سال دریائے میں پھینکتے تھے۔مگر یہ انسانی قربانی بھی بار آور نہیں ہوئی اور یہ شہنشاہ دریائے زرد کے سیلابوں کو نہ روک سکے۔

مقامی لوگوں نے اس دریا کے سیلابوں کے نقصانات کو کم کرنے کے لیے کئی عملی طریقے بھی اختیار کیے تھے جن میں حفاظتی پشتوں کی تعمیر شامل تھی۔ یہ پشتے بعض اوقات دریا کے پاٹ سے 8 میل کے فاصلے پر بنائے جاتے تھے تا کہ ایک وسیع رقبے میں اس دریا کے سیلابی پانی کو محدود کر دیا جائے۔

1887ء میں چین کی تاریخ کا سب سے خوفناک سیلاب اس دریا میں آیا تو دریائے زرد کا پانی حفاظتی پشتوں پر سے گزر گیا۔خصوصاً ہینان صوبے Henan Provience میں جہاں یہ پشتے نشیب میں بنے ہوئے تھے۔ پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ زیر آب آ گیا۔ اس علاقے میں 11 بڑے قصبے اور سینکڑوں دیہات پانی میں ڈوب گئے اور اس خوفناک سیلاب کی تباہ کاریوں سے تقریباً 9 لاکھ افراد ہلاک ہو گئے جبکہ 40 لاکھ افراد بے گھر ہو گئے۔ اسی وجہ سے اس دریا کو ''غموں کے دریا'' کا نام دیا گیا تھا اور اتنی وسیع تباہ کاری کے بعد یہ نام کچھ زیادہ برا نہیں تھا۔ اس دریا میں آنے والے اس تباہ کن سیلاب سے ہونے والی تباہیوں کا دارومدار دراصل پشتوں کی کم بلندی اور سیلابی پانی میں بہہ کر آنے والی تلچھٹ پر تھا۔ یہ تلچھٹ دریا کے ساتھ یک دم بہہ کر نہیں آتی بلکہ آہستہ آہستہ دریا کی سطح کو بلند کرتی رہتی ہے جس کی وجہ سے دریا کی سطح آس پاس کی زمینوں سے بلند ہو جاتی ہے جس سے سیلابی ریلہ پشتوں کے اوپر سے گزر کر

نقصان پہنچا دیتا ہے۔

اس سیلاب بے درماں سے بچنے کے لیے چین کے لوگ احتیاطی تدابیر کے طور پر دریا کے پانی کی سطح کے بڑھنے اور موسم کی خرابی کا جائزہ لیتے رہتے تھے، جیسے ہی دریا کے پانی کی سطح بلند ہوتی تو لوگوں کی فوج فوراً حفاظتی پشتوں کو بلند کر دیتی تھیں مگر لوگوں کو اس کام کے لیے اکٹھا کرنا اور اس کام کے لیے فیصلہ کن لمحے کا پتہ چلانا بھی ایک مشکل کام تھا۔ 1887ء میں موسم گرما کے آخری حصے میں بڑی زوردار بارشیں ہوئیں جس کی وجہ سے 28 ستمبر 1887ء کو حفاظتی پشتے بیٹھ گئے اور غیر متوقع طور پر پانی سیلاب کی صورت میں ہر طرف بہنے لگا۔ صوبہ ہینان جہاں یہ صورت حال پیش آئی۔ عمومی طور پر سطح سمندر سے تقریباً 600 فٹ بلند ہے۔ جو ان پہاڑی علاقوں سے بالکل مختلف ہے جہاں سے دریائے زرد نکلتا ہے۔ ہینان کا صوبہ چونکہ سمندر کے قریب واقع ہے۔ اسی وجہ سے وہ دریائے زرد کے ڈیلٹا کے بھی قریب واقع ہے۔ اس صوبے کو عموماً شمالی چین کا میدانی علاقہ بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے ہی پشتے ٹوٹنے کے خطرے کا الارم بجا دیا گیا اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد دریا کی طرف دوڑی تا کہ حفاظتی پشتوں میں پڑنے والی دراڑوں کی مرمت کر دی جائے مگر لوگوں کے دریا تک پہنچنے سے پہلے ہی پشتوں میں 2000 فٹ طویل شگاف پڑ چکے تھے۔ اس وجہ سے دریا کے پانی کو بہت کم روکا جاسکا۔ پانی کے تیزی سے پھیلنے کے بعد بہت سے لوگوں نے دریا کے بلندی والے علاقوں تک پہنچنے کی کوشش کی تا کہ سیلاب سے بچا جاسکے مگر وہ پانی کے ریلوں میں پھنس کر ڈوب گئے۔

ژینگ ژو Zheng Zhou شہر کے قریب حفاظتی پشتوں میں پڑنے والے شگافوں کی وجہ سے صرف ایک گھنٹہ بعد جھیل اونٹاریو جتنی بڑی جھیل وجود میں آ گئی۔ اس علاقے کے کچھ لوگوں نے سیلاب سے بچنے کے لیے چھوٹی کشتیوں میں دوسرے علاقوں تک پہنچنے کی کوشش کی اور سیلابی ریلوں کا شکار ہو گئے۔ جبکہ کچھ لوگوں نے ڈوبتے ہوئے تنکوں تک کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر پانی میں بہہ گئے۔

ستمبر کے آخر میں چین کے اس علاقے میں درجہ حرارت اتنا کم ہو گیا کہ یہاں کے رہنے والوں کو سردی لگنے لگی۔ سیلاب میں پھنسے ہوئی لوگوں کو نکالنے کا کام چھوٹی کشتیوں کے ذریعے کیا گیا مگر یہ سینکڑوں سیلاب میں پھنسے ہوئے خاندانوں کو وہاں سے نکالنے کے لیے کم تھیں۔ بچاؤ کی امید میں سینکڑوں پانی میں ڈوبتے ہوئے لوگ اونچے درختوں کی شاخوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ ستمبر میں چین میں درجہ حرارت کافی نیچے آ جاتا ہے جس دن دریائے زرد میں یہ سیلاب آیا اس دن ہوائیں بھی کافی تیز چل رہی تھیں۔ جس وجہ سے ہر شخص ٹھنڈ محسوس کر رہا تھا۔ سیلاب آنے کے بعد سے لوگوں نے اپنے گھروں کی چھتوں پر پناہ لی ہوئی تھی جب دیر تک امدادی جماعتیں انہیں بچانے کے لیے نہ پہنچ سکیں تو وہ بے چارے

سردی اور بھوک کا شکار ہو کر اپنی زندگیاں کھونے لگے۔ سیلاب میں پھنسے ہوئے ایک خاندان نے جب اپنے زندہ بچ جانے کی کوئی امید نہ پائی تو انہوں نے اپنے ایک بچے کو ایک صندوق پر تھوڑی سی خوراک دے کر اور اس کا نام ایک کاغذ پر لکھ کر بٹھا دیا۔ یہ صندوق سیلابی پانی میں اس وقت تک تیرتا رہا جب تک اس بچے کو کسی امدادی جماعت نے دیکھ نہ لیا۔

بہت کم تنظیمیں سیلاب زدگان کی مدد کے لیے میدان میں اتری تھیں۔ کچھ غیر ملکی تبلیغی ادارے سیلاب زدگان کو تھوڑی بہت خوراک پہنچا رہے تھے مگر یہ خوراک سیلاب زدگان کی وسیع تعداد کے لیے بہت کم تھی۔ اسی وجہ سے ہزاروں افراد بھوکوں مر گئے۔ پھر جب آخر کار یہ سیلابی پانی اترا تو لوگوں نے تقریباً آٹھ فٹ موٹی کیچڑ کی تہہ ان مقامات پر جمی پائی جہاں جہاں سیلابی پانی کھڑا تھا۔ پھر جب یہ کیچڑ سوکھا تو چین کا یہ سرسبز علاقہ صحرا دکھائی دینے لگا۔ لوگ حیران تھے کہ ایسے خطرناک سیلابی علاقوں میں کسان کیوں رہتے اور کاشت کرتے ہیں یا کیوں آتش فشاں پہاڑوں کے دامن میں آباد ہوتے ہیں۔ دونوں سوالوں کا جواب ایک ہی تھا کہ ایسے مقامات انتہائی زرخیز ہوتے ہیں۔

موسم سرما کے شدت اختیار کرنے کے باجود سیلابی علاقوں میں تیزی سے بحالی کا کام سرانجام دیا گیا۔ کھیتوں اور کھلیانوں کی صفائی کے ساتھ ساتھ حفاظتی پشتے دوبارہ تعمیر کر لیے گئے۔ تاہم جیسے جیسے موسم گرما قریب آیا ان علاقوں میں ایک اور سیلاب آنے کا خطرہ بڑھ گیا۔

1888ء..... نیویارک برفانی طوفان کی زد میں

امریکہ محکمہ موسمیات نے 12اور13مارچ1888ء کوہلکی سی برف باری کے بعد مطلع صاف ہوجانے اور موسم کے خوشگوار سرد رہنے کی پیشین گوئی کی تھی ۔ تاہم 12مارچ کو آدھی رات کے بعد نیو یارک میں بارش ہوئی جو بعد ازاں طوفانی برف باری میں بدل گئی۔ محکمہ موسمیات کی پیشین گوئی کے مطابق یہ ہلکی سی برف باری اتنی شدید تھی کہ 13مارچ کی صبح 7 بجے تک نیو یارک کے درو بام پر دس انچ موٹی برف کی تہہ جم چکی تھی اور جب 13مارچ کو یہ برفانی طوفان تھما تو نیو یارک کی مشہور زمانہ شاہراہیں 21انچ موٹی برفانی چادر کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔

گزشتہ کئی سو سال میں نیو یارک میں اتنی شدید برف باری کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ برف باری کے تھمنے کے بعد جب صفائی کا کام شروع ہوا تو برف کے نیچے سے لوگوں کی منجمداور ٹھٹھری ہوئی لاشیں دریافت ہوئیں۔ ایک شخص جو برف میں دب جانے کی وجہ سے قریب المرگ تھا اسے طبی امداد فراہم کرکے بچا لیا گیا۔ اس نے بتایا کہ برفانی طوفان میں گھر کر سردی کی شدت سے مرجانے والوں کی لاشیں ہر سمت بکھری ہوئی تھیں۔ صبح سویرے ڈبل روٹیاں تقسیم کرنے والا ایک شخص سردی کی شدت سے ٹھٹھر کر رستے میں جاں بحق ہوگیا۔ نیو یارک کے بہت سے شہری میٹرو ٹرینوں میں پھنس کر رہ گئے تھے ۔انہیں 25 سینٹ فی کس کے حساب سے سیڑھیوں کی مدد سے ٹرینوں سے نکالا گیا۔ نیو یارک کی شاہراہوں پر چلنے والی گھوڑا گاڑیوں کے گھوڑے برف باری کی شدت سے شاہراؤں پر چلتے ہوئے مر گئے ۔پورے پورے مکان اور بلند وبالا عمارتیں سینکڑوں ٹن وزنی برف کی چادر کے نیچے دب گئیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں آنے والا یہ برفانی طوفان اتنا شدید تھا کہ ریاست مین سے لے کر واشنگٹن تک کا پورا علاقہ برف باری کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔اور نیو یارک سے اوہیو تک کے تمام امریکی شہر اس کی زد میں آ گئے تھے۔ اس برفانی طوفان کے دوران 70 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سرد ہوائیں چلتی رہیں تھیں جن سے امریکہ کے مشرقی ساحل پر بندرگاہوں میں لنگر انداز بحری جہاز ڈوب گئے اور بہت سے بھٹک کر اپنے راستے سے دور جا نکلے۔ کنکٹی کٹ سے میساچوسٹس تک 150انچ برف باری ہوئی جس کی وجہ سے ان شہروں میں بہت سے نظام درہم برہم ہوگئے۔ فائر

سسٹم خراب ہوگیا۔ بجلی فیل ہوگئی۔ نیویارک کا ایسٹ ریورEast River نامی دریا منجمد ہوگیا۔ برف باری کی شدت کی وجہ سے نہ صرف بچے سکول نہ جاسکے بلکہ کاروباری لوگ بھی کام پر جانے کے بجائے اپنے گھروں کو لوٹ آئے اور موسم کی خرابی کی وجہ سے انہیں 13 مارچ کا دن اپنے گھروں میں رہ کر گزارنا پڑا۔

برفانی طوفان سے نیو یارک شہر کی روزمرہ زندگی انتہائی متاثر ہوئی۔ اس کا نقشہ اخبار نیویارک ٹائمز نے اپنی 14 مارچ 1888ء کی اشاعت میں کچھ یوں کھینچا تھا۔

13 مارچ کو جہاں شہر میں انسانوں کی گہما گہمی کم ہوگئی تھی وہیں ریلوے انجنوں سے بھاپ کے اخراج کی آوازیں اور ان کے سیٹیاں بجانے کی آوازیں بھی بالکل خاموش تھیں۔ پورے شہر میں برفانی ہواؤں کے چلنے کی گڑگڑاہٹ کے سوا موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ نیو یارک کے وسیع وعریض ریلوے اسٹیشن کے اندر تک برف درآئی تھی۔ اور ریلوے لائنیں مکمل طور پر برف کے نیچے دب چکی تھیں۔ پورا شہر ایک برفانی تابوت بن چکا تھا۔

اس برفانی طوفان میں پھنس کر 400 سے زائد افراد نیویارک میں فوری طور پر جاں بحق ہوگئے تھے جبکہ مزید 400 افراد طوفان کے بعد ہلاک ہوگئے تھے۔ یہ نیو یارک کی تاریخ کا سب سی بدترین برفانی طوفان تھا۔ اس دن شہر کے تھیٹروں میں سے چند میں شو شروع ہوئے تو سینکڑوں تماشائیوں کی بجائے گنتی کے چند افراد دکھائی دیے تو تھیٹر کے مالکوں نے یہ شو منسوخ کردیے۔ یوں شوبز کا شعبہ بھی اس برفانی طوفان سے بری طرح متاثر ہوا اور زندگی کی گہما گہمی معطل ہوکر رہ گئی۔

1889ء.....جونز ٹاؤن، پینسلوانیا میں سیلاب بلاخیز

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ کا بد ترین سیلاب 31 مئی 1889ء کو جونز
پینسلوانیاJohns Town Pensylva میں آیا تھا جس نے 3000 آبادی کے اس صنعتی شہر کو
کر کے رکھ دیا تھا۔ اور 2200 کے لگ بھگ افراد ہلاک ہوگئے تھے جبکہ ہزاروں افراد بے گھر
تھے۔ بہت سے لوگوں کے مکانات بنیادوں سے اکھڑ کر گر گئے۔ ایک چھوٹی سی جھیل جو جونز
بلندی سے 400 فٹ بلندی پر واقع تھی اور پنسلوانیا کے نہری نظام کو پانی فراہم کرتی تھی۔ اسے
ماہی گیری کے مقاصد کے لیے چند افراد کے ایک گروپ نے خرید لیا تھا۔ اس گروپ نے اس جھ
اس کے بند کو بلند کر کے مزید پھیلا دیا تھا۔ ادھر اس بند اور جھیل میں فالتو پانی کے اخراج کے
راستہ نہیں رکھا گیا تھا۔ 1889ء کے ابتدائی پانچ مہینوں میں تقریباً ایک سو دن تک مسلسل بارشیں
رہیں اور اپریل میں پہاڑوں پر جمی ہوئی برف پگھلنے سے اس علاقے کی دریاؤں میں پانی کی
ہوگئی۔ 31 مئی 1889ء کو ہونے والی ایک شدید بارش کی وجہ سے جھیل میں بھی پانی کی سطح ڈیم
بلند ہوگئی اور اس بند کے کئی مقامات سے پانی رسنے لگا پھر تھوڑی ہی دیر میں یہ بند ٹوٹ گیا اور
میں پھیلی ہوئی اس جھیل کا پانی نیچے وادی میں جونز ٹاؤن کی طرف دھاڑتا ہوا بڑھا۔

1889ء میں جونز ٹاؤن ایک فولاد ساز کمپنی کا شہر کہلاتا تھا اور اپنی فولاد سازی کے بلند معیار اور
صنعتی ٹاؤن ہونے کی وجہ سے جانا جاتا تھا۔ اس کی بنیاد 1794ء میں رکھی گئی تھی۔ 1834ء میں
ریلوے لائن بچھا دی گئی جس سے اس قصبے کی اہمیت بڑھ گئی، مگر یہ قصبہ دو دریاوں کے سنگم کے
واقع تھا۔ ان دونوں دریاؤں میں ہر سال بالضرور طغیانی آتی تھی۔ یہی طغیانی 1889ء میں قیامت
کی شکل اختیار کر گئی۔

31 مئی 1889ء کو سہ پہر 4 بجے جونز ٹاؤن کے باشندوں نے پہلے مدھم سے شور کی آواز
بڑھتے ہوئے آسمانی بجلی کی گڑگڑاہٹ نما دھاڑ میں بدل گئی اور سیلابی ریلہ جونز ٹاؤن میں
ہوگیا۔ چند ہی لوگوں کو پتہ چل سکا کہ کیا ہوا تھا۔ گزشتہ رات کی طوفانی بارش سے ساؤتھ
ڈیمSouth Fork Dam بیٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد 16 ملین ٹن پانی دھاڑتا ہوا جونز ٹاؤن میں داخل

تھا۔ سیلابی پانی کے ریلے 16 فٹ بلند تھے اور ان کے ساتھ کچرا بھی پانی میں شامل تھا۔ 40 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بہتے ہوئے اس پانی کے ریلے نے اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو خس وخاشاک کی مانند بہا کر رکھ دیا۔ لوگوں نے اس سیلابی پانی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کے باوجود اس کے دھارے میں پھنس گئے۔ اور ہزارون ٹن وزنی کچرے کے ٹکڑوں میں دب کر مارے گئے۔ بہت سے لوگ پانی مین بہتے ہوئے خار دار تاروں میں الجھ گئے۔ اس زمانے میں ٹیلی فون کی سہولت موجود نہ تھی جس کے ذریعے جونز ٹاؤن کے شہریوں کو اس طوفان بلا خیز کی اطلاع دی جاسکتی۔ ٹیلی گراف کی سہولت بھی اتنی موثر نہ تھی کہ مختلف مقامات کے لوگوں کو خبر دار کیا جاسکتا۔

ایک نوجوان سول انجینئر جس نے ساؤتھ فورک ڈیم میں پہلے پہل شگاف پڑتے ہوئے دیکھے تھے وہ جونز ٹاؤن کے باسیوں کو اس خطرے سے خبردار کرنے کے لیے اپنے گھوڑی پر سوار ہو کر قصبے میں پہنچا اور اس نے اعلان کیا کہ ڈیم ٹوٹنے والا ہے۔ لہٰذا اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگو۔ اس نے ٹیلی گراف کے ذریعے بھی اس کی اطلاع بھجوائی تھی مگر لوگوں نے توجہ نہ دی۔ پھر یہ انجینئر قصبے میں داخل ہوتے ہوئے جیسے ہی ریلوے لائن پل کو عبور کرنے لگا خود بھی سیلابی ریلے کی لپیٹ میں آ کر مارا گیا اور ریلوے پل بھی تباہ ہوگیا۔ ڈیم ٹوٹنے کے صرف دس منٹ بعد سب کچھ تباہ ہوگیا تھا مگر ابھی اور مصیبتیں اٹھانا باقی تھیں۔ جیسے ہی تاریکی پھیلی ہزاروں لوگ پانی کے ریلوں میں پھنس کر بہتے ہوئے اولڈ اسٹون برج سے ٹکرا گئے۔ یہ پل دونوں دریاؤں کے سنگم پر تعمیر کیا گیا تھا۔ سیلاب کے ریلوں میں بہتے ہوئے لوگ اس پل کی محرابوں میں پھنسے ہوئے کچرے میں الجھ گئے اور پانی میں چکراتے ہوئے بے بسی کے عالم میں چل بسے۔ سیلاب دنیا کے بہت سے حصوں میں اکثر وبیشتر آتے رہتے ہیں اور کوئی نئی چیز نہیں سمجھے جاتے۔ اکثر لوگوں کو جو سیلابی میدانوں میں آباد ہوتے ہیں سیلاب کی تباہ کاریاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ چونکہ ان سیلابی میدانوں کا قدرتی کام ہزاروں اور لاکھوں کیوسک پانی کو پھیلانا ہوتا ہے۔ اس سے اکثر تباہ کاری مچتی ہے۔ تاہم جونز ٹاؤن کا سیلاب بلا خیز تھا۔ اس کے متعلق نیو یارک ورلڈ نامی اخبار نے لکھا تھا کہ ''ایسا ہولناک سیلاب پہلے کسی امریکی شہر میں نہیں آیا تھا۔ اس سیلاب نے ہر طرف دہشت، بربادی اور ہلاکتیں پھیلا دیں۔ سیلاب نے بے شمار مکانات اور دیگر عمارات منہدم کردیں۔ اگر کوئی شخص ان تباہ کن مناظر کو دیکھتا تو اس کا پاگل ہونے سے بچنا ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔ یہ سیلاب جانز ٹاؤن کے میتھڈسٹ گرجا گھر کو اس کی میناروں سے اکھیڑ کر لے گیا تھا۔ اور 37 ریلوے انجن اس میں کھلونوں کی طرح بہہ گئے تھے۔

1891ء.....جاپان میں زلزلہ

نوبیNobi جاپان کا ایک زرخیز علاقہ ہے جو جاپانی شہر نوگویاNogoya کے شمال میں واقع ہے۔ اس علاقے میں 28 اکتوبر 1891ء کو ریکٹر اسکیل 8. کا شدید زلزلہ آیا۔ اس زلزلے نے جزیرہ ہونشوHonshu کو ٹوکیو سے اوساکا تک تاراج کر کے رکھ دیا۔ اس علاقے کی تمام تر تعمیرات، لوہے کے پل، عمارتیں اور گھر سب زمین بوس ہوگئے۔ تقریباً 7000 افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ 10000 افراد شدید زخمی ہوئے تھے۔ 100000 افراد بے گھر ہو گئے۔ اس علاقے کے تمام دیہات، تمام قصبے بھی اس زلزلے کے ہاتھوں تباہ ہوگئے۔ صوبہ نوبی کے دو بڑے قصبے زلزلے کے مرکز کے انتہائی قریب واقع ہوئے تھے۔ شہر نوگویا میں زلزلے کی وجہ سے گیس کی پائپ لائن پھٹنے کی وجہ اور تمام رسل ورسائل بند ہونے کی وجہ سے بہت سے مقامات پر آگ لگ گئی۔

آج جاپان کے لوگ زلزلے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اسی وجہ سے جاپان کے سکولوں میں جسمانی ورزشوں کے پیریڈ میں زلزلے سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر تک سکھائی جاتی ہیں۔ تاہم 1891ء تک جاپان بھی زلزلوں کی آمد کے بارے میں اتنا کچھ ہی جانتے تھے۔ جتنا باقی دنیا جانتی تھی۔ 1891ء میں جاپان میں دو انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو دارالحکومت کو کیوٹوKyoto شہر سے ٹوکیو منتقل کیا جانا اور دوسرے میجی حکومت شاہی کی بحالی ایک اور تبدیلی یہ رونما ہوئی تھی کہ جاپان نے مغربی دنیا سے مکمل طور پر رابطہ استوار کرلیا تھا اور جاپان مغربی ملکوں برطانیہ اور امریکہ کی طرح ایک ترقی یافتہ ملک بننے کے راستے پر گامزن ہوگیا تھا۔ جاپانی طالب علموں کو جدید علوم کی تعلیم کے لیے یورپ اور امریکہ بھیجا جانے لگا تھا۔ ملک میں جدید صنعتیں لگانے کے لیے یورپی ماہرین کو جاپان آنے کی دعوت دی گئی تھی مگر ان ترقی پسندانہ اقدامات کے باوجود بہت سے جاپانی اس عقیدے پر ایمان رکھتے تھے کہ زلزلے روایت پسندی کے خلاف کیے جانے والے اقدامات کی سزا کے طور پر آتے ہیں۔

1819ء میں آنے والے زلزلے کے نقصانات کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ یہ جاپانی عقائد بھی سامنے آئے۔ اوساکا نوگویا اور کوب Kobe میں پہنچنے والے نقصانات کی تشہیر دیہاتوں میں پہنچنے والے جانی ومالی نقصانات سے پہلے سامنے آئی۔ ان شہروں میں بہت سی عمارات اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔

اوساکا میں دو بڑی مغربی طرز پر بنی ہوئی ٹیکسٹائل ملز جو اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں زمین بوس ہوگئیں۔ اس کے علاوہ مغربی طرز پر بنے ہوئے دو لوہے کے پل بھی بیٹھ گئے جس کے بعد مغربی طرز اپنانے کے خلاف بولنے والوں کو موقع مل گیا اور انہوں نے مغربی طرز پر تعمیر کی گئی ان تعمیرات کا منہدم ہونا ایک سزا کے طور پر پیش کیا۔ دو اخبارات نے ان کے نقطہ نظر کو کچھ یوں پیش کیا کہ اوساکا اگرچہ زلزلے سے ہل کر رہ گیا مگر جاپانی طرز پر تعمیر کی گئی عمارات صحیح وسلامت تھیں اور صرف یورپی طرز پر تعمیر کی گئی عمارات منہدم ہوئی تھیں۔ تاہم اخبار کے ایڈیٹر نے یہ بھی لکھا کہ جاپانی تعمیرات چونکہ لکڑی سے بنی ہوئی تھیں اس لیے منہدم ہونے سے بچ گئیں اور مغربی طرز کی عمارات چونکہ اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں اس لیے گر پڑیں۔ تاہم جب اس زلزلے سے دیہاتوں میں پہنچنے والے نقصانات کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ سینکڑوں جاپانی طرز کے مکانات بھی منہدم ہوئے تھے اور ساتھ ساتھ ان میں آگ بھی لگ گئی تھی، جس سے زیادہ جانی نقصان پہنچا تھا۔ تاہم اس کے باوجود جاپانیوں نے مغربی طرز تعمیر کو نقصان دہ سمجھا اور جاپانیوں نے مغربی اقوام سے اپنے تعلقات کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

1894-1905ء.....آرمینیائی قتل عام

عثمانی ترکوں کے ہاتھوں آرمینیائی عیسائی رعایا کا قتل عام جو 1894ء سے 1896ء تک جاری رہا اس وقت کے عثمانی سلطان عبدالحمید ثانی کے نام پر حمیدی قتل عام بھی کہلاتا ہے۔ یہ سلطان عبدالحمید کی یورپی طاقتوں پر دھاک بٹھانے اور اسلام پسند پالیسی کا نتیجہ تھا۔ اس قتل عام میں ایک اندازے کے مطابق 80ہزار سے تین لاکھ آرمینیائی باشندے قتل کیے گئے تھے جس کے نتیجے میں 50ہزار آرمینیائی بچے بے آسرا اور یتیم ہوگئے تھے۔

ہٹلر نے جب پولینڈ پر حملہ کیا تھا تو اس نے بڑے نفرت بھرے انداز میں کہا تھا کہ ''آرمینیا کے لوگوں کو کون یاد کرے گا؟ ہٹلر کا اشارہ ان مسیحی آرمینیائی باشندوں کی طرف تھا جو 1896-1894ء میں عثمانی ترکوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

انیسویں صدی کے آخری عشرے میں یورپی طاقتوں ،برطانیہ ،فرانس اور روس نے عثمانی سلطان عبدالحمید ثانی پر زور دیا کہ وہ ایک نئے اصلاحی معاہدے پر دستخط کرے تاہم معاہدہ برلن کی طرح اس معاہدے پر بھی عمل درآمد نہ ہوسکا۔ یکم اکتوبر 1895ء کو قسطنطنیہ (استنبول) میں دو ہزار آرمینیائی باشندے اکٹھے ہوئے اور انہوں نے اصلاحات کے نفاذ کے لیے ایک قرارداد پیش کی اور ایک جلوس نکالا۔ عثمانی پولیس نے اس جلوس پر حملہ کرکے اسے منتشر کرکے چھوڑا مغربی طاقتوں کی طرف سے اس اصلاحی پیکج کے ملنے کے بعد کہتے ہیں کہ سلطان عبدالحمید نے کہا تھا کہ ''یہ معاملہ بالآخر خون خرابے پر ختم ہوگا۔''

جلد ہی عثمانی سلطنت میں خصوصاً استنبول میں آرمینیائی باشندوں کو قتل کیا جانے لگا اور پھر اس دباؤ نے بڑھ کر دوسرے عثمانی شہروں کو بھی گھیرے میں لے لیا۔ ہزاروں مسیحی آرمینیائی باشندے اپنے مسلمان ہمسایوں کے ہاتھوں قتل ہوگئے۔ ایک امریکی نامہ نگار ولیم سکٹی پن نے جو ارض روم میں موجود تھا لکھا۔

جمعہ کے دن بعد از دوپہر جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا (یکم نومبر 1895ء) وہ ہمیشہ کے لیے میرے دماغ میں محفوظ ہوگیا ہے یہ کسی آدمی کے لیے اس کی زندگی کا خوف ناک ترین منظر تھا۔ 321 آرمینیائی باشندوں کی لاشیں بے گوروکفن بکھری پڑی تھیں۔ مغربی ذرائع نے تشدد کے ان واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

انیسویں صدی کے آخر تک تقریباً 40 لاکھ آرمینیائی باشندے عثمانی سلطنت میں آباد تھے۔ ان مسیحی آرمینیائی باشندوں سے یورپی مورخین کے مطابق عثمانی سلطنت میں دوسرے درجہ کے شہریوں کا سلوک کیا جاتا تھا اور صدیوں سے وہ نہ تو اپنی جائیدادوں کی حفاظت کر سکے تھے نہ ہی اپنے گھروں اور اپنی زندگیوں کی۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں کچھ آرمینیائی باشندوں نے خود اختیاری کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ سلطان عبدالحمید ثانی عثمانی سلطنت کی بگڑتی ہوئی حالت کی وجہ سے علیحدگی پسندی کی تحریکوں سے بڑا نالاں تھا۔ اسی وجہ سے وہ آرمینیا کے ہمسائے کردوں کو ان کے خلاف ابھارتا رہتا تھا۔ 1894ء میں ترک فوجی دستوں نے کردوں سے مل کر ہزاروں آرمینیائی باشندوں کو قتل کر دیا اور ان کے گاؤں کے گاؤں نذر آتش کر دیے۔ اس کے دو سال بعد 1896ء میں آرمینیائی جنگجوؤں نے استنبول (قسطنطنیہ) میں عثمان بینک پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہونے والی پر تشدد کارروائی میں تقریباً 50 ہزار باشندوں کو ترک عوام نے قتل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس مسلم ترک عوام کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ حملے اگلے کئی سالوں تک جاری رہے۔ 1900ء میں کرد دیہاتیوں نے جو ترک فوجی دستوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے تقریباً 400 آرمینیائی لوگون کو قتل کر دیا۔ ایک گاؤں میں کچھ آرمینیائی لوگوں نے ایک گرجا گھر میں پناہ لی تو اس گرجا گھر کو نذر آتش کر دیا گیا ور اس گرجا گھر میں موجود تمام افراد ہلاک ہوگئے۔ 1904ء میں آرمینیا میں بغاوت برپا ہوگئی مگر اس بغاوت کو ترک فوجی دستوں اور مقامی کردوں نے مل کر دبا دیا اور آرمینیا میں درجنوں دیہات نذر آتش کر دیے گئے اور ہزاروں مرد وخواتین اور بچے ہلاک کر دیے گے۔ 1909ء میں نوجوان ترک تحریک نے زور پکڑا اور عثمانیہ سلطنت کو ایک آئینی بادشاہت میں بدل دیا۔ کچھ وقت کے لیے کچھ آرمینیائی باشندوں نے حکومت میں اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا مگر جو گروہ اقلیتوں کے لیے مساوی حقوق کا خواہاں تھا وہ جلد ہی غیر موثر ہوگیا۔ روس کے اپنی آرمینیائی اقلیت سے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے تھے۔

انیسویں صدی میں روس کے زاروں (قیصران روس) نے سینکڑوں آرمینیائی اسکول بند کر دیے، لائبریریاں اور اخبارات کے دفتروں پر پابندیاں عائد کر دیں تھیں۔ 1905ء میں تاتاری مسلمانوں نے روس کے شہر باکو، طفلیس اور ایری وان Erevan میں آرمینیائی لوگوں کے گھروں پر حملہ کر دیا۔ کمیونسٹ انقلاب پسندوں نے آرمینیائی لوگوں کی حمایت کی جبکہ زار کے فوجی دستے تاتاریوں کے ساتھ تھے اور انہوں نے درجنوں آرمینیائی گاؤں اجاڑ کر رکھ دیے اور سینکڑوں آرمینیائی باشندوں کا قتل عام کیا مگر جب پہلی جنگ عظیم میں ترکی عثمانی سلطنت نے جرمنی اور آسٹریا کا اتحادی بن کر روس پر حملے شروع کیے تو

روس کا زار ترکی کی آرمینیائی اقلیت کا ہمدرد بن گیا جس کی وجہ سے آرمینیائی لوگ یہ سوچنے لگے جنگ میں روس کی فتح کے بعد انہیں آزادی نصیب ہوجائے گی ۔ادھر جنگ عظیم اول میں ترکی آمیز شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تو ترکی کے وزیر جنگ ،اسماعیل انور نے ان ذلت آمیز شکستوں آرمینیائی اقلیت کو ٹھہرایا ۔عثمانی حکومت کی پروپیگنڈہ مشینری بھی حرکت میں آ گئی اور اس نے اقلیت پر الزام لگایا کہ وہ استنبول میں ایک بغاوت رونما کر کے عثمانی حکومت کی ذمہ دار شخصیتوں چاہتے تھے۔ اس الزام کے بعد ایک بار پھر ترکی میں آرمینیائی اقلیت کا قتل عام شروع اور 19 اپریل 1915ء تک تقریباً 50 ہزار آرمینیائی قتل کردیے گئے۔ یہ قتل عام صرف ترکی کے وان Van میں کیا گیا تھا ۔آرمینیائی اقلیت نے جرمنی اور امریکہ کو مدد کی درخواست دی مگر ان کی نہ ہوئی ۔ تاہم جب روسی فوج وان کے قصبے میں داخل ہوئی اور مہینوں سے محصور آرمینیائی لوگوں محاصرے سے نکالا تو کچھ امن ہوا مگر یہ امن زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا ور صرف ایک ماہ قائم رہ سکا وان سے صرف چند میل دور واقع شہر بٹلیس Bitlis میں صرف آٹھ دنوں کے اندر 15000 آرمی کردیے گئے۔ جبکہ ترکی کے فوجی دستوں نے بحیرہ اسود کی بندر گاہ ٹریزون Trebizone 17000 آرمینائی باشندوں میں سے صرف 100 آرمینیائی باشندوں کو ہلاک کر دیا اور 250 آرمینیائی راہنماؤں کو استنبول میں گرفتار کرلیا گیا اوران میں بہت سوں کو قتل کردیا گیا ۔ ایک ماہ بعد حکومت نے قانون پاس کیا کہ آرمینیائی باشندوں کو ترکی سے نکال دیا جائے اور ان کی جائیدادوں کرلیا جائے ۔انور پاشا نے حکم دیا کہ عثمانی فوج میں موجود آرمینیائی فوجیوں سے ہتھیار واپس لیجائیں اور انہیں مزدور بٹالین میں شامل کردیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ بلکہ مغربی مورخین کے مطابق 1894ء سے 1915ء تک ترکی کے صوبے میں 6 لاکھ آرمینیائی باشندوں کا قتل عام کیا گیا ۔چار لاکھ آرمینیائی جلاوطنی کی ذلت میں مارے گئے 2 لاکھ کو جبراً اسلام قبول کرنا پڑا تھا۔ جنگ عظیم اول کے بعد معاہدہ سیورے میں آرمینیا کو آزادی دینے فیصلہ کیا گیا تھا مگر نئے ترک راہنما مصطفیٰ کمال نے یہ معاہدہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ بہرحال سارے معاملے میں مغربی مورخین نے انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیا۔

1896ء..... برطانوی ہندوستان میں قحط اور خشک سالی

1896ء سے اگلے پانچ سال تک برطانوی ہندوستان خشک سالی کا شکار رہا جس سے پورا برصغیر خوفناک قحط کا شکار ہوگیا۔ اس قحط سے برطانوی ہندوستان میں تقریباً4700افراد روزانہ ہلاک ہوئے۔ یوں مجموعی طور پر1896ء سے 1901ء تک قحط سے ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد8250000 تھی۔ اس پانچ سالہ انسانی المیے نے برطانوی ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

1896ء میں اس شدید خشک سالی کا آغاز ہندوستان کے جنوبی اور مغربی علاقے کے تین لاکھ مربع میل سے ہوا۔1898ء میں اس کے نتائج سامنے آئے اور یہ المیہ اپنے عروج پر پہنچا اور بہت سے علاقوں میں قحط پڑ گیا اور ہلاکتوں کی تعداد60لاکھ تک پہنچ گئی۔ مجوعی طور پر 61لاکھ افراد اس خشک سالی سے متاثر ہوئے ۔ جب یہ خشک سالی اگلے دو سال اور جاری رہی تو اس سے 225000افراد مزید ہلاک ہوگئے۔ ہندوستان قصبوں میں گلیاں لاوارث انسانی لاشوں سے اٹ گئیں۔ ماں باپ کے جاں بحق ہونے کی وجہ سے بہت سے بچے بے سہارا ہوگئے۔ ہندوستان کے محتاج خانے بے گھر اور بے سہارا لوگوں سے بھر گئے۔ لاکھوں انسانوں کے پاس ان محتاج گھروں میں پناہ لینے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ حکومتی امداد سے چلنے والے یہ ادارے جلد ہی جرائم کے گڑھ بن گئے ۔ یہاں جسم فروشی عام ہوگئی اور لاعلاج بیماریوں کے شکار لوگ بھی پناہ لینے لگے جس سے یہ جہنم زار بن گئے ۔

کم سن لڑکیوں سے جسم فروشی جبراً کرائی جاتی اور طاقت ور کمزوروں سے بے گار لینے لگے ۔بے پناہ کام کرانے کے باوجود انہیں کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک محتاج کا گھر دورہ کرنے والی ایک انگریز خاتون نے اپنے اہل خانہ کو جو برطانیہ میں رہتے تھے لکھا کہ برے مرد، کئی عورتیں اور معصوم بچیاں اور سادہ لوح افراد سب ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہوگئے تھے ۔محتاج گھروں میں کوڑھ کے مریض اور جنسی امراض کا شکار لوگ بھی پناہ لیے ہوئے تھے جس سے حفظان صحت خطرے میں پڑ گئے تھے۔

اس قحط سالی میں ہندوستان کے لوگ ہر وہ چیز کھا گئے جو حلق سے نیچے اتر سکتی تھی جس طرح روس میں پڑنے والے قحط کے دوراں روسی درختوں کی چھال، تنکے اور مٹی تک کھا گئے تھے ۔ اسی طرح ہندوستانی بھی بھوکوں مرتے ہوئے تھوہر کے کانٹے دار پودے ، اور ہر قسم کے جنگلی پھل اور گھاس تک کھا گئے۔

ملک میں ہر قسم کے روزگار ختم ہو گئے تاہم جس خوش قسمت کو کوئی کام مل جاتا وہ اتنی حقیر رقم کما سکتا کہ اس سے ایک وقت کا کھانا تک نہیں کھا سکتا تھا۔ گندم انتہائی گراں ہو چکی تھی اور ہندوستانی اپنے ہی ملک میں پیدا ہونے والے اس اناج کو خرید نہیں سکتے تھے۔ ان حالات میں لوگوں نے فاقہ زدگان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر تھوڑی سی رقم کے عوض زیادہ سے زیادہ بے گار لینا شروع کر دی۔ تاہم مضبوط جسم کے لوگ تو یہ محنت و مشقت کر سکتے تھے اور کمزور لوگوں کے لیے یہ بے گار ناممکن کام تھا۔

جیسے جیسے قحط سالی نے مزید زور پکڑا تو انجام کار لوگ مردم خوری پر اترے آئے۔ تاریخ عالم اس بات پر گواہ ہے کہ جب کبھی انسان بھوک کے ہاتھوں پاگل پن کا شکار ہوا وہ انسانی گوشت تک کھانے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ بھوک کے ہاتھوں مرنے والوں کی لاشیں ان حالات میں ہر طرف بکھری پڑی تھیں اس لیے خوراک کے اس ذریعہ سے لوگ فائدہ اٹھانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

چونکہ برطانوی نوآبادکاروں نے ہندوستانی عوام کو اس المیے سے بچانے کے لیے کچھ زیادہ کوشش نہیں کی اس لیے خشک سالی کے ان پانچ سالوں میں بے شمار لوگ موت کا شکار ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ خشک سالی کو انسانی کوششوں سے نہیں روکا جا سکتا تاہم قحط کے اثرات کو کم کیا جا سکتا ہے مگر نوآبادکار حکمرانوں نے اس کے لیے بھی خلوص سے کوشش نہ کی اور ہندوستانیوں کے ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

1896ء.....جاپان پر سونامی کا حملہ

سونامیTsunamisc جاپانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی سمندر کی اونچی طوفانی لہر کے ہیں ۔ جو سمندر میں زیر آب آنے والے زلزلے سے پیدا ہوتی ہے ۔ زیر آب آتش فشانی کا عمل بھی یہ خوفناک لہریں پیدا کرتا ہے۔ یہ طوفانی لہریں 120 میل طویل اور500 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں ۔ تاہم سمندر کے وسط میں یہ قابل توجہ نہیں ہوتیں مگر ان کے ساتھ پانی بڑی مقدار اور طوفانی رفتار کے ساتھ خشکی پر در آتا ہے اور اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو بہا کر لے جاتا ہے ۔

15جون 1896ء کو ریکٹر اسکیل پر 8.5درجے کا ایک شدید زلزلہ جاپانی جزیرے ہوشوHonshu کے شمال مشرق میں واقع جاپانی صوبے سانکریکوSankriku کے ساحلی علاقوں میں آیا۔ اس زلزلے کا مرکز ان ساحلی علاقوں سے 90 میل دور گہرے سمندر میں اس جگہ تھا جہاں Japan Trenchواقع ہے ۔

تاہم اس زلزلے کے اثرات ساحل پر بہت کم تھے جیسا کہ ریکٹر اسکیل پر8.5 کے درجہ کے زلزلے کے ہوسکتے تھے۔اسی وجہ سے اس زلزلے سے سمندر میں کسی بڑے سونامی کے پیدا ہوجانے کی امید نہیں تھی۔ جاپان کے اس ساحلی علاقے میں اکثر وبیشتر زلزلے آتے رہتے تھے۔ اس لیے جاپانی زلزلوں کے عادی تھے اس لیے انہوں نے اس زلزلے کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیا مگر اس زلزلے کے صرف35منٹ بعد جاپان کی تاریخ کا بدترین سونامی ان ساحلی علاقوں پر حملہ آور ہوگیا۔پہلی طوفانی لہر خشکی سے واپس سمندر کی طرف پلٹی ہی تھی کہ صرف پانچ منٹ بعد ایک دوسری طوفانی لہر چڑھ دوڑی۔ سونامی کی یہ دوسری طوفانی لہر سطح زمین سے125فٹ بلند تھی۔ اس طوفانی لہر کے راستے میں آنے والی ہر چیز تباہ وبرباد ہوگئی۔ سونامی کے اس حملے میں26000افراد ہلاک ہوگئے جبکہ 9ہزار مکانات صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

جب یہ زلزلہ آیا تو بہت سے جاپانی ساحل پر دوتہوار یا جشن منانے کے لیے جمع تھے ۔ ان میں سے ایک جاپان کی 1894ء میں چین کی سرزمین پر فتح کی خوشی میں جاپانی فوجیوں کی واپسی کا جشن تھا جبکہ دوسرا ایک سالانہ تہوار تھا جسے لڑکے کا تہوار کہتے تھے۔ دن کے آغاز میں جب زلزلے کے معمولی جھٹکے آئے تو ان جھٹکوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا ۔ اسی طرح اس تباہ کن سونامی کی آمد سے پہلے جو غیر معمولی

شگون دیکھنے میں آئے جیسے کنوؤں کا پانی اتر جانا اور ٹیونا مچھلیوں کی غیر معمولی آمد ان غیر معمولی شگونوں کی بھی توجہ نہ دی گئی۔ اس کے علاوہ اس دن سونامی کی آمد سے پہلے بہت زور دار آوازیں بھی سنائی دیں مگر یہ دونوں تہوار جاری رکھے گئے۔ پھر سونامی کی لہریں ساحل پر چڑھ آئیں تو یہ دونوں تہوار منانے والوں میں سے کم از کم 28ہزار افراد ان کا نشانہ بن گئے۔

سونامی کی طوفانی لہر اس دن شام 8.30 منٹ پر حملہ آور ہوئی۔ جاپانی دیہاتی علاقوں اور قصبوں میں رہنے والے لوگ اکثر بہت جلد سو جاتے تھے۔اس لیے جب یہ طوفانی لہر ساحلی قصبوں اور بستیوں میں آئی تو ان علاقوں کے اکثر مکین اپنے بستروں میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔طوفانی لہر ان کے مکانوں کو بھی اپنے ساتھ سمندر میں بہا کر لے گئی۔جن کے اندر مکین سوئے ہوئے تھے۔ان میں سے بیشتر لوگ پانی کے وزن سی فوراً مر گئے۔شاید ان مرنے والوں کی روحوں کو بھی سکون ملا کیونکہ بہت سے گھرانے پورے کے پورے ہی ایک ہی وقت میں ہلاک ہوگئے تھے اور یوں عزیز واقارب کو ان کی موت کا ماتم تک نہیں کرنا پڑا تھا۔ جو لوگ پانی کے اس طوفانی ریلے سے نہیں مرے وہ بعد ازاں تیزی سے منہدم ہوتی ہوئی عمارتوں کے ملبے تلے دب کر مر گئے یا پھر پانچ سو میل فی گھنٹہ سے آنے والی دوسری لہروں نے انہیں عمارتی ملبے پر لاکر پٹخ دیا جس سے ان کی موت واقع ہوگئی۔

1896ء میں آنے والے اس شدید سونامی نے خلیج ہونشو کو انسانی لاشوں سے پاٹ دیا۔ یہ انسانی لاشیں اتنی زیادہ تھیں کہ بحری جہاز ان کے درمیان سے نہیں گزر سکتے تھے۔ جاپان کے جزیرے ہونشو کے شمال مشرقی ساحلی علاقوں پر حملہ آور ہونے والی سونامی کی لہریں 300 میل چوڑی اور 10 سے 125فٹ تک بلند تھیں اور یہ خشکی میں100 میل اندر تک چڑھ آئی تھیں۔

اس سونامی نے بہت سے ساحلی قصبوں کو نیست ونابود کرکے رکھ دیا اور ہر قدرتی آفت کی طرح بہت سے لوگ اس آفت کے بعد پھیلنے والی بیماریوں سے جاں بحق ہو گئے۔بعض پانی کے اس طوفان سے بچ جانے کے باوجود اپنے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہوگئے۔ اس سونامی میں زخمی ہونے والوں کے متعلق ایک اخباری نامہ نگار نے لکھا تھا کہ بعض اس شدید طور پر زخمی ہوئے کہ ان کے جسموں پر سے گوشت اتر گیا اور ہڈیاں نظر آنے لگیں تھیں۔ بعض زخمیوں کے جسم طوفانی لہروں نے مروڑ کر رکھ دیے تھے۔

1897ء..... برطانوی ہندوستان کے صوبے آسام میں زلزلہ

آج کل جو خطہ بنگلہ دیش کہلاتا ہے۔ اس میں برطانوی ہندوستان کے صوبے آسام کا بھی بہت سا علاقہ شامل ہے۔ صوبہ آسام میں آنے والا 12 جون 1897ء کا زلزلہ انتہائی شدید تھا اور ریکٹر اسکیل پر 8.7 درجے کا زلزلہ تھا۔ اس زلزلے نے امریکی ریاست نیو انگلینڈ جتنے وسیع علاقے میں موجود ہر عمارت کو ملبے میں بدل دیا تھا۔ ہندوستان کے شمالی مغربی اور جنوبی علاقوں سے آنے والی رپورٹوں میں بتایا گیا تھا کہ ان سب علاقوں میں بھی اس زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے تھے۔ ڈھاکہ جو آج کل بنگلہ دیش کا دارالحکومت ہے یہ آسام کے جنوب میں واقع تھا۔ ڈھاکہ میں ہونے والی اموات کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ 6 ہزار سے زائد لوگ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ پچاس میل طویل ریلوے لائنیں مکمل طور پر تباہ ہوگئیں تھیں۔ دارجیلنگ جو آسام کے شمال مغرب میں کافی دوری پر واقع تھا، وہاں چائے کی صنعت مکمل طور پر تباہ ہوگئی۔ اس میں عمارتیں اور باغوں میں کھڑی چائے کی فصل دونوں شامل تھے۔ مشرقی بنگال ریلوے لائن لمبی مدت کے لیے بند کردی گئی کیونکہ اس کے راستہ میں آنے والے کئی پل اس زلزلے میں زمین بوس ہوگئے تھے۔ موسم کی خرابی نے مزید مصیبتیں کھڑی کردی تھیں۔ درجہ حرارت سائے میں 120 درجے فارن ہائیٹ تک پہنچ گیا تھا اور بارشیں بھی مون سون کی آمد کی وجہ سے شدت اختیار کرگئی تھیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ بارشوں کا ریکارڈ رکھنے والا علاقہ چراپونجی صوبہ آسام ہی میں واقع ہے۔ اس مقام پر اوسطاً بارش 450 انچ سالانہ تک ہوتی ہے اور کبھی کبھی اس سے بھی بڑھ جاتی ہے۔

ایک برطانوی خاتون جو آسام کے چائے کے باغات میں رہتی تھی اس نے اپنے ایک دوست کو اس زلزلے کی آمد کے دوسرے دن برطانیہ خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ وہ اپنے بستر میں دراز تھی جب یہ زلزلہ آیا اور اتنی شدید بیمار تھی کہ گھر سے باہر نکلنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ اچانک زلزلے کی خوفناک آواز کے ساتھ گھر کی ہر چیز ہلنے لگی۔ جس کے بعد وہ دروازے کی طرف رینگنے پر مجبور ہوگئی جہاں اس کے ایک ہندوستانی ملازم اس کے سر پر گرتی ہوئی چیزوں سے نجات دلائی۔ اپنے خط میں اس نے لکھا کہ وہ کھڑے ہونے سے بھی لاچار تھی۔ اس کے ملازم نے کسی نہ کسی طرح اسے مکان کی عمارت گرنے سے پہلے اس مکان سے باہر نکال لیا۔ زلزلہ کے متعلق اس برطانوی خاتون نے لکھا کہ بدترین زلزلہ تھا اور اس نے

ذاتی طور پر ایسے زلزلے کو دیکھا تو کجا اس کے متعلق کبھی سنا بھی نہیں تھا۔ زلزلہ کے بعد موسلا دھار بارشیں مون سون کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہوگئیں۔ جو عمارتیں زلزلے میں منہدم ہونے سے بچ گئی تھیں وہ اس طوفان بادوباراں سے لرزنے لگیں۔ اس زلزلے اور طوفانی بارشوں کے سلسلہ کے بعد دارجیلنگ کا دوسرے تمام مقامات کے ساتھ رسل ورسائل کا رابطہ ٹوٹ گیا۔

1897ء میں دارجیلنگ میں میسر دنیا سے رابطہ کا واحد ذریعہ صرف ٹیلی گراف تھا جس کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا تھا۔ سڑکوں میں شگاف پڑگئے تھے اور جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اس خاتون نے لکھا کہ زلزلہ کے بعد باقی سارا دن مسلسل جھٹکے آتے رہے۔

آسام کی ارضیاتی پرت کو اکثر اوقات شلونگ پرت کہا جاتا ہے۔شلونگ Shillongاس علاقے کا دارالحکومت ہے۔ یہ ایک پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا علاقہ ہے جہاں بلندیاں سطح سمندر سے لے کر کوہ ہمالیہ کی بلندیوں تک پہنچتی ہیں۔ تاہم شلونگ ارضیاتی پرت سطح سمندر سے 5000 فٹ سے بھی کم بلندی پر واقع ہے۔ یہاں کی زمینیں مون سون کی بارشوں کی بہتات ہونے کی وجہ سے زرخیز ہیں۔ شلونگ کی ارضیاتی پرت کئی ممالک کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں چین، مغرب میں نیپال اور مشرق میں برما یا میانمار واقع ہے جبکہ بنگلہ دیش اس کے جنوب میں ہے۔

1897ء میں برطانوی حکام اتنی بڑی قدرتی آفت سے نمٹنے کے لیے ضروری انتظامات نہیں کر رکھے تھے۔ دوسرے یہ نوآبادکار صرف اپنے ملک کے لیے منافع کمانے میں مصروف تھے۔ وہ نوآبادی کی رعایا کی بھلائی تک کا خیال نہیں رکھتے تھے نہ تو عوامی سطح پر میڈیکل سروسز کا انتظام تھا اور نہ ہی آفت زدگان کو پناہ دینے کے لیے کوئی شیلٹر تعمیر کیے گئے اور نہ ہی انہیں خوراک پہنچانے کا کوئی انتظام موجود تھا۔ تاہم برطانوی گورنر نے بے گھر افراد کے لیے تمام سرکاری عمارات کھول دیں تاکہ ان میں بے گھر افراد پناہ لے سکیں۔ اس کے علاوہ اس نے سرکاری خزانے سے وہ فنڈ کہ جو ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریبات پر خرچ کیا جانا تھا وہ آفت زدگان کو خوراک مہیا کرنے پر خرچ کردیا۔ ملکہ نے خود گورنر کو اس کے اس اقدام پر مبارک باد کا پیغام بھیجا تھا۔

1899ء.....یاکوٹاٹ، الاسکا میں آنے والا شدید زلزلہ

ماہ ستمبر 1899ء میں الاسکا کے علاقے خلیج یاکوٹاٹ Yakutat Bay کو شدید زلزلوں کی ایک سیریز نے ہلا کر رکھ دیا۔ زلزلوں کی اس سیریز کو ریکٹر اسکیل پر 7 درجہ بتایا گیا تھا۔ الاسکا کا یہ علاقہ بہت کم آبادی کا حامل تھا اس لیے پورے مہینہ زلزلے کے جھٹکے متواتر آنے کے باوجود اس علاقے میں کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ تاہم زلزلے کی اس سیریز نے اس علاقے کا جغرافیائی حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ کئی مقام پر سطح زمین 47 فٹ سے زیادہ بلند ہوگئی جو کسی زلزلے کی وجہ سے آنے والی ایک تاریخی تبدیلی تھی۔ زلزلوں کی اس سیریز کا سب سے شدید زلزلہ 10 ستمبر کو آیا تھا جس کی شدت ریکٹر اسکیل پر 8.0 درجے تھی۔ اس زلزلے نے فیئر بینک Fair Bank سے لے کر 600 میل سے زائد دوری پر واقع سٹکا Sitka کے علاقے تک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے پانچ سال کے بعد اس علاقے کا دورہ کرنے والی ماہرین کی ایک جماعت نے اس علاقے میں بہت سے بحری قشرے اور گھونگھے مردہ حالت میں ہر طرف بکھرے ہوئے پائے تھے۔ انہوں نے اس علاقے میں بہت سے مقامات چھ فٹ سے زائد سطح زمین سے نیچے بیٹھے ہوئے پائے۔ 10 ستمبر 1899ء کو آنے والا زلزلہ تقریباً 90 منٹ تک جاری رہا تھا اور اس کے بعد بھی بہت سے جھٹکے آئے تھے۔

الاسکا کے جنوبی ساحل کا پورا علاقہ جس میں ایلیوشن آئی لینڈ Aleutain Island بھی شامل ہیں جو مغربی سمت میں تین الاقوامی خط تبدیلی تاریخ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ علاقہ 1500 میل تک زندہ آتش فشاں پہاڑوں کی ایک پوری سیریز پر مشتمل ہے اور براعظم امریکہ میں سب سے زیادہ آتش فشاں پہاڑوں کا علاقہ ہے۔ یہاں ریاست متحدہ امریکہ میں آنے والے زلزلوں کی سالانہ مجموعی تعداد سے زیادہ زلزلے آتے ہیں۔ جزائر ایلیوشن وہ جزائر ہیں جن میں سے کچھ اپنے پہاڑی سلسلوں کی وجہ سے سطح سمندر سے بہت بلند ہیں۔ یہ جزائر لاکھوں سال کی آتش فشانی اور زلزلوں کی وجہ سے وجود میں آئے تھے۔ اس مقام پر بحرالکاہل کی ارضیاتی پرت مسلسل شمالی امریکہ کی ارضیاتی پرت کو دباتی ہے جو اس دباؤ سے کھسکتی رہتی ہے۔ یہی اس علاقے میں زلزلوں کی بہتات کا سبب ہے۔

الاسکا میں ماضی میں آنے والے زلزلوں کا ریکارڈ مکمل طور پر موجود نہیں ہے۔ اس ریکارڈ کے

مطابق 1788ء جولائی میں آنے والا زلزلہ اولین زلزلے کے طور پر ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اس زلزلے کی وجہ سے الاسکا کے کچھ حصوں میں سونامی لہریں بھی در آئیں تھیں۔ الاسکا میں وہ علاقے زلزلوں کی آماجگاہ کے لحاظ سے مشہور ہیں جن میں سے ایک یہی جزائر ایلیوشن چین کا علاقہ ہے جبکہ دوسرا علاقہ خلیج یاکوٹاٹ کا ساحلی علاقہ ہے۔ 1899ء سے 1969ء تک الاسکا میں ریکٹر اسکیل 8 درجے اور اس سے زائد شدت کے تقریباً آٹھ بڑے زلزلے آئے تھے۔ ان شدید زلزلوں میں سے تقریباً چار زلزلے شدید مالی نقصان اور جغرافیائی حلیے میں تبدیلی کا سبب بنے تھے جبکہ دوسرے چار زلزلے چونکہ کسی رقبے یا شہر میں نہیں آئے تھے اس لیے بہت کم نقصان کے حامل تھے۔ الاسکا کی تاریخ میں جو ریکٹر اسکیل پر 9 درجے کا سب سے شدید زلزلہ آیا تھا وہ الاسکا کے شہر اینکورتج Anchorage کا زلزلہ تھا جو 1964ء میں آیا تھا۔ اس کا ذکر 1964ء کی قدرتی آفات میں آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔ 1900ء میں بھی ریکٹر اسکیل پر 7.9 درجے کا ایک زلزلہ یاکوٹاٹ کے علاقہ میں محسوس کیا گیا تھا۔

1905ء میں جن امریکی ماہرین نے 1899ء کے زلزلے کی رپورٹ مرتب کرنے کے لیے یاکوٹاٹ کے علاقے کا دورہ کیا تھا ان کی مرتبہ اس رپورٹ کے مطابق انہیں اس علاقے میں اس زلزلے سے آنے والی بہت سی ارضیاتی تبدیلیوں کے شواہد ملے تھے۔ ماہرین کی اس جماعت نے 150 مربع میل کے علاقے کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ اس علاقے میں رہنے والے ماہی گیروں نے بھی ان ماہرین کو اس زلزلے سے ہونے والی ارضیاتی تبدیلیوں کی تفصیلات مہیا کی تھیں۔ اس کے علاوہ اس جماعت نے ہبارڈ گلیشیر کے قریب کیمپ لگا کر خود بھی بہت سی ارضیاتی تبدیلیوں کا معائنہ کیا تھا۔ یاد رہے کہ اس زلزلے کی آمد سے چند سال پہلے الاسکا میں یوکون Yokon کے علاقے میں سونا دریافت ہونے کی وجہ سے ایک گولڈ رش بھی رہا تھا اور جب اس علاقے میں 1899ء کا زلزلہ آیا تو سونا تلاش کرنے والے بہت سے لوگ بھی موجود تھے جو اس زلزلے کی وجہ سے اپنی زندگیوں تک سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ زندہ بچ جانے والے افراد نے بھی ماہرین کو بہت سی اہم معلومات بہم پہنچائی تھیں۔

1900ء.....گیلیو اسٹون ٹیکساس میں آنے والا ہری کین

۱۹۰۰ء میں گیلیو اسٹونGalveston ٹیکساس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا بدترین ہری کین آیا تھا۔ اس طوفان کی رفتار 14 میل فی گھنٹہ تھی۔ اس طوفان سے سمندر میں 20 فٹ اونچی طوفانی لہریں اٹھیں جنہوں نے وہ پورا جزیرہ ڈبو دیا جس پر گیلیو اسٹون واقع تھا۔ اس طوفان سے تقریبا8000افراد ہلاک ہوگئے اور اس سے کہیں زیادہ لاپتہ ہوگئے۔ یہ جانی ومالی نقصان شکاگو میں لگنے والی آگ سے پہنچنے والے جانی نقصان سے کہیں زیادہ تھا۔ ہزاروں عمارات تباہ ہوگئیں۔امریکہ کے محکمہ موسمیات کے پیشین گوئی کرنے والوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ ہری کین شمال مشرق کی طرف سفر کرتے ہوئے بحر اوقیانوس کے وسطی ساحلی مقامات کو متاثر کرے گا۔ یہ پیشین گوئی اس مفروضے پر مبنی تھی کہ یہ طوفان کسی خاص سمت میں رخ بدل لے گا۔1900ء میں موسمیاتی پیشین گوئیاں غیر پیشہ وارانہ ہوتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں آج کل کے جدید آلات سائنس دستیاب نہیں تھے۔ کیوبا کا محکمہ موسمیات امریکہ کے ماہرین کی اس پیشین گوئی سے متفق نہیں تھا۔کیوبا کے ماہرین موسمیات کا خیال تھا کہ یہ طوفان اب مغرب کا رخ کرے گا چونکہ امریکہ اور کیوبا کے ماہرین موسمیات میں کوئی باہمی تعاون موجود نہیں تھا س لیے کیوبا والوں کی بات پر دھیان نہیں دیا گیا اور امریکی ماہرین کی بات کو اولیت حاصل ہوگئی۔

ہفتہ 8 ستمبر کی صبح کو سطح سمندر بلند ہونا شروع ہوگئی تھی جبکہ آسمان پر بادل اتنے گہرے نہیں تھے کہ آنے والے طوفان کا پتہ چلتا۔ موسم کی اسی کیفیت اور محکمہ موسمیات کی طرف سے بھیجی جانے والی کمزور وارننگ کی وجہ سے گلیواسٹون کے باشندوں کو طوفان کی شدت کا اندازہ نہ ہوسکا اور انہوں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ چونکہ امریکی ماہرین موسمیات کی اس طوفان کے رخ کے بارے میں پیشین گوئی پوری نہیں ہوئی تھی ااور اس طوفان نے فلوریڈا اور امریکہ کے مشرقی ساحل کا رخ نہ کیا تھا۔خلیجی ساحل پر واقع موسمیاتی اسٹیشنوں سے یہ رپورٹیں بھی آرہی تھیں کہ ایک سمندری طوفان خلیج میں مغرب کی سمت میں بڑھ رہا ہے جو انتباہ موسمیاتی سروس نے بھیجا تھا اس میں ہری کین کا لفظ استعمال نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کی گیلواسٹون موسمیاتی سروس کے ڈائریکٹر کو یقین تھا کہ گیلیو اسٹون کو کوئی سمندری طوفان نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ انہیں وجوہات کی بنا پر بہت کم لوگوں نے طوفان کی آمد سے پہلے اس شہر کو چھوڑا۔ پھر جب

لوگوں کو اس ہری کین کے آثار نظر آئے تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی اور یہاں سے بھاگنا ممکن نہیں تھا۔ پھر دوپہر کے بعد جب ہوا کی رفتار تیز ہو گئی اور سمندر میں پانی کی سطح بلند ہونے لگی تو لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں یا بڑی عمارتوں میں پناہ لی۔

گیلیو اسٹون 1900ء میں ہاؤسٹن سے 50 میل جنوب مشرق میں ایک بڑی بندرگاہ تھی جو اسی نام کے 32 میل لمبے ایک جزیرے کے شمال مشرقی گوشے میں واقع تھی۔ اس بندرگاہ کو شاہراہ اور فیری کے ذریعے مین لینڈ سے ملایا ہوا تھا۔ اس زمانے میں اس شہر کی آبادی 42000 تھی اور یہ امریکی ریاست ٹیکساس کا ایک اہم شہر تھا۔ جس جزیرے پر یہ واقع تھا اس کی سطح سمندر سے اوسط بلندی صرف 5 فٹ تھی۔ ہاستمبر کو آنے والے ہری کین میں طوفانی لہریں 20 فٹ بلند تھیں۔ اس لیے گیلیو اسٹون کی شاہراہوں اور گلیوں میں 15 فٹ بلند پانی در آیا جو گھر ساحل سمندر کے قریب تھے وہ سب سے پہلے زمین بوس ہو گئے اور ان میں استعمال شدہ لکڑی کے شہتیر طوفانی ہوا میں میزائل بن کر اڑنے لگے اور راستے میں آنے والی دیگر تعمیرات کے لیے مہلک اور تباہ کن ہتھیار ثابت ہوئے۔ محکمہ موسمیات کا ڈائریکٹر آئزک کلائن تھا جس کے خیال میں یہ شہر کسی سمندری طوفان کا نشانہ نہیں بن سکتا۔ طوفان کی آمد کے بعد اس نے اپنے گھر والوں اور مزید 45 افراد کے ساتھ اپنے گھر میں پناہ لی مگر کچھ دیر بعد اس کا گھر بھی طوفان کی شدت کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ خوش قسمتی سے کلائن ان اٹھارہ افراد میں شامل تھا جو اس کے گھر کے منہدم ہونے کے بعد زندہ بچے تھے۔ مکانات کے زمین بوس ہو جانے سے جو لوگ اس طرح زندہ بچے تھے وہ مکانات کے ملبے میں پھنس گئے۔ ان میں سے بہت سے پانی کے چڑھ آنے کی وجہ سے ڈوب کر مر گئے جبکہ بہت سوں کو طوفانی لہروں نے ملبے کو ان پر ڈال کر ہلاک کر دیا۔ یوں طوفان کی شدت سے بچ جانے والے بہت سے افراد شہر کے ملبے میں کئی دن تک پھنسے رہنے کی وجہ سے بھی ہلاک ہو گئے۔

مواصلات کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے اس لیے اس شہر کی تباہی کی خبر امریکہ کی دوسری ریاستوں میں کہیں جا کر دو دن بعد پہنچی۔ لاشوں کی تعداد اتنی تھی کہ انہیں ایک ایک کر کے دفنانا ممکن نہیں تھا اس لیے جہاں بھی لاشیں پڑی ہوئی تھیں وہیں ان کی چتائیں جلانے کا انتظام کیا گیا اور یوں یہ چتائیں ہفتوں تک جلتی رہیں۔ جبکہ زندہ بچ جانے والوں کو ساحل کے ساتھ ساتھ آویزاں کیے گئے لکڑی کے خیموں میں پناہ دی گئی جبکہ کئی افراد نے شہر کے ملبے سے لکڑی نکال کر اپنے لیے لکڑی کے کیبن بنا لیے تھے۔ 4 دن کے بعد شہر میں پانی کی سروس بحال کر دی گئی اور ویسٹرن یونین نے چند دن بعد ٹیلی گراف کی سروس کو بحال کر دیا۔ تین ہفتے کے بعد اس بندرگاہ سے کپاس پھر باہر بھیجی جانے لگی۔ تعمیر نو اور بحالی

کا کام بھی تیزی سے شروع کر دیا گیا۔ خلیج کے کنارے ایک 17 فٹ بلند کنکریت کی دیوار تعمیر کی گئی تا کہ آئندہ آنے والے طوفانوں کے نقصانات سے بچا جا سکے۔ یہ دیوار 8 میل طویل تھی ۔ شہر کی تعمیر کے دوران جو سب سے اہم کام طوفانی امواج سے بچنے کے لیے کیا گیا وہ یہ تھا کہ شہر کے لیول کو پہلے سے بلند رکھا گیا اور شہر کو سطح سمندر سے تقریباً 17 فٹ بلندی پر تعمیر کیا گیا۔ 1915ء میں بھی اسی طاقت کا ایک ہری کین گیلیو اسٹون سے ٹکرایا تھا مگر اس کی 12 فٹ بلند طوفانی لہروں کو شہر کی حفاظتی دیوار نے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ 1900ء میں آنے والے اس سمندری طوفان میں سرکاری ریکارڈ کے مطابق 275 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ 2001ء میں گیلواسٹون کی دوبارہ تعمیر کو امریکن سوسائٹی آف سول انجینئرز نے ایک قومی تعمیراتی کارنامے سے اعزازی طور پر تعبیر کیا۔

1902ء.....کوہ پیلی کی آتش فشانی

جمعرات 8 مئی 1902ء کو ویسٹ انڈیز میں واقع فرانسیسی جزیرے مارٹینیق martinique پر واقع آتش فشاں کوہ پیلی Mount Pelee پھٹ پڑا۔ اس کی آتش فسانی کے صرف تین منٹ بعد اس پہاڑ کے دامن میں آباد قصبہ سینت پائرے St. Pierre صفحہ ہستی سے معدوم ہوگیا۔ اس قصبے کی آبادی 30000 نفوس تھی۔ تھوڑی دیر میں شہر میں موجود ہر شخص جاں بحق ہوگیا۔

کئی ہفتے سے یہ بیدار آتش فشاں گندھک کے آمیزے کے ساتھ خوفناک گیس خارج کر رہا تھا جس سے آتش فشاں کے قرب وجوار میں آباد تمام آبادیوں میں وہاں کے باشندوں کا دم گھٹتا جارہا تھا۔ پھر 8 مئی کو صبح سات بج کر 49 منٹ پر یہ پوری شدت سے پھٹ پڑا اور صرف تین منٹ کے بعد 30 ہزار نفوس میں صرف چند اشخاص اس آفت کا حال سنانے کے لیے زندہ بچے۔ اس پہاڑ کے پھٹنے کے بعد آتش فشانی مادہ اور لاوا فضا میں بکھرنے کی بجائے زمین پر تیز رفتاری سے بہتا ہوا سینٹ پائرے کے قصبے میں آن پہنچا۔ چشم دید گواہوں کے مطابق یہ جلتا ہوالاوا کسی آگ کے دریا کی طرح قصبے میں داخل ہوگیا اور قصبے کے در و بام خس و خاشاک کی مانند جلنے لگے۔ اگلے پورے پانچ گھنٹے تک یہ قصبہ آگ میں جلتا رہا اور قصبے کی ہر شے کے علاوہ اس نے بندرگاہ میں لنگر انداز 18 بحری جہازوں اور ان کے عملے افراد کو بھی جلا کر راکھ کردیا۔

1902ء میں مارٹینیق ایک فرانسیسی نوآبادی تھی جس کی آبادی 50 ہزار افراد سے کچھ کم تھی۔ اس جزیرے پر جس پہلے یورپی نے قدم رکھے تھے وہ کرسٹوفر کولمبس تھا جو 1502ء میں یہاں پہنچا تھا۔ اگلے 133 برس تک یہاں کوئی یورپی آباد کار آباد نہ ہوا۔ 1535ء میں اس جزیرے پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہوگیا اور انہوں نے اس جزیرے پر گنا، کپاس اور تمباکو کی کاشت شروع کردی۔ غلامی کا ادارہ یہاں اٹھارہویں صدی میں متعارف کرایا گیا تھا جس کے بعد یہاں کے کھیتوں میں دوسری امریکی نوآبادیوں کی طرح غلاموں سے کام لیا جانے لگا۔ 1848ء میں اس نوآبادی میں غلامی منسوخ کردی گئی اور یہ فرانسیسی حکومت کے زیر نگیں آ گیا تھا۔

8 مئی کے سانحہ سے زندہ بچ جانے والے صرف دو اشخاص میں ایک قتل کا مجرم پچیس سالہ آگسٹس

تھا جسے سزائے موت سنائی جا چکی تھی ،صرف ایک دن بعد اس کی سزا پر عمل درآمد کیا جانا تھا۔ اسی وجہ سے اسے ایک ایسی کال کوٹھڑی میں رکھا گیا جس کی دیواریں پتھریلی اور موٹی تھیں۔ اس کوٹھری میں صرف گھٹنوں کے بل جھک کر داخل ہوا جا سکتا تھا۔ اس کوٹھڑی کے تنگ و تاریک اور دبی ہوئی ہونے کی وجہ سے آگسٹس کی جان بچ گئی گو وہ گرم ملبے تلے اس کوٹھڑی میں تین دن تک زندہ رہا تھا۔ اور بری طرح جھلس گیا تھا۔ امدادی جماعتوں نے اسے نکالا اور ہسپتال پہنچایا۔ صحت یابی کے بعد اس کی سزائے موت منسوخ کردی گئی۔ بعد ازاں یہ شخص ایک سرکس میں پیلی کے سانحہ میں زندہ بچ جانے والے کی تختی آویزاں کرکے کام کیا کرتا تھا۔

سینٹ پائرے کے قصبے اور آس پاس کے علاقوں میں 40ہزار کے قریب اموات واقع ہوئیں اتنی بڑی تعداد میں اموات کی وجہ فرانسیسی حکام کی قصبے کے انتظام وانصرام سے لاپرواہی تھی۔ آتش فشانی سے پہلے جو قدرتی اشارے ملے ان پر توجہ نہ دی گئی جس کی وجہ سے اتنی بڑی تعداد میں انسان مارے گئے۔ ادھر اس قصبے میں مقامی گورنر کا انتخاب ہونے والا تھا۔ اس لیے مقامی گورنر نے دوبارہ منتخب ہونے کی لالچ میں حکم نافذ کیا کہ کوئی شخص انتخاب سے پہلے یہ قصبہ نہیں چھوڑے گا یہ انتخاب 10 مئی کو عمل میں آنے تھے۔ چونکہ قصبے میں ہمہ وقت گندھک کی تیزابی بو پھیلی ہوئی تھی اس لیے لوگوں نے اپنے ناکوں پر گیلا کپڑا رکھ کر اس ناگوار بو سے بچنے کی کوشش کی اور سینٹ پائرے میں 8 مئی کی قدرتی آفت کے آنے تک محدود رہے مگر اس زہریلی آب وہوا سے بہت سے مویشی اور گھوڑے ہلاک ہوگئے۔ جنہیں نظر انداز کرکے بھی شہری قصبے میں موجود رہنے پر مجبور تھے۔

5 مئی کو کوہ پیلی کے دہانے سے ابلتے ہوئے کیچڑ کا سیلاب جاری ہوا۔ کیچڑ کا یہ سیلاب ایک پوری شوگر مل اور اس میں کام کرنے والے مزدوروں کو نگل گیا۔ اس سانحہ میں 100 افراد ہلاک ہوگئے۔ اس خوفناک حادثے نے بہت سے لوگوں کو ڈرا دیا اور کچھ لوگ شہر کو چھوڑ گئے مگر یہ لوگ معدودے چند تھے۔

پھر آتش فشانی کے بعد اس علاقے کا درجہ حرارت بڑھ کر 1800 فارن ہائیٹ تک پہنچ گیا اور ایک آتشیں طوفان قصبے کی طرف بڑھا جس نے صرف 3 منٹ کے اندر پورے قصبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ قصبے کی ہر شے جلنے لگی۔ گویا قصبہ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی اور کسی ذی روح کو بھاگنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ کچھ لوگ اس آگ کے طوفان سے اور کچھ آتش فشاں سے نکلنے والی گرم زہریلی گیسوں سے ہلاک ہوگئے۔

1903ء.....شکاگو، ایروکوئیس تھیٹر میں ہونے والی آتش زدگی

انیسویں صدی کے آخری عشروں میں شکاگو میں لگنے والی خوفناک آگ کا خوف شکاگو کے شہریوں کے دلوں پر ابھی تک طاری تھا۔ اسی وجہ سے شکاگو کے وسطی علاقے میں تعمیر ہونے والے ایک نئے تھیٹر کے مالکوں نے اس نوتعمیر شدہ تھیٹر کے بارے جھوٹ موت میں یہ افواہ پھیلائی تھی کہ یہ تھیٹر مکمل طور فائر پروف ہے اور اس میں آگ لگنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس تھیٹر میں آگ لگنے کی صورت میں باہر نکلنے کے لیے نہ تو ہنگامی زینے رکھے گئے تھے اور نہ ہی آگ بجھانے کا مناسب انتظام، فائر الارم، ریت اور پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ اس کے باوجود تھیٹر کے مالکان نے متعلقہ حکام کی مٹھی گرم کر کے تھیٹر کھولنے کے تمام سرٹیفکیٹ حاصل کر لیے تھے۔ تھیٹر کی اس عمارت میں اگرچہ آگ لگنے کی صورت میں 30 ہنگامی راستے بھی رکھے گئے تھے مگر ان میں سے 27 ابھی بند تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تھیٹر کی سیٹوں میں انتہائی قسم کا آتش گیر ریشہ بھرا ہوا تھا۔ آگ سے بچاؤ کے لیے اسکے پردے بھی نہیں لٹکائے گئے تھے اور نہ ہی تھیٹر کے عملے کو آگ سے بچاؤ کی ہنگامی مشقیں کرائی گئی تھیں مگر ان سب خامیوں کے باوجود تھیٹر میں شو کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔

30 دسمبر 1903ء کو ایروکوئیس تھیٹر کی اسٹیج پر اس وقت کے ایک مشہور گلوکار اور رقاص ایڈی فوائے نے ایک کھیل ''مسٹر بلیو برڈ'' میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اس کے فین یہ مظاہرہ دیکھنے کے لیے بڑی تعداد میں ایٹر کوئیس تھیٹر آئے۔ اس تھیٹر میں صرف 1602 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی مگر اس دن 1830 افراد یہ کھیل دیکھنے کے لیے اس نوتعمیر شدہ تھیٹر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یوں 225 افراد کے لیے ایکسٹرا سیٹوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

اخباروں میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ ایروکوئیس تھیٹر میں اس دن 1830 افراد میں 1000 سے زائد بچے بھی تھے جو کرسمس کی تعطیلات میں ایڈی فوائے کے فن سے لطف اندوز ہونے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ تماشائیوں کی اس بڑی تعداد کی علاوہ 275 اداکار، کارکن اور عملے کے ارکان بھی تھیٹر میں موجود تھے۔ اس لیے مجموعی تعداد 2105 افراد تک پہنچتی تھی۔

پھر جب کھیل شروع ہوا تو پہلا ایکٹ تو بخیریت گزرے گا۔ دوسرے ایکٹ کے آغاز میں ایک گانا

تھا جس میں ایڈی فوائے نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اس گانے کے بول تھے" پیلی چاندنی میں"In the Yellow Moonlight اس گانے کے دوران پرفارمنس دیتے ہوئی ایڈی فوائے پر اس گانے کے بولوں کے مطابق اسٹیج پر پیلے رنگ کی روشنی ڈالی جانا تھی۔ جیسے ہی پیلی روشنی والے بلب جلائے گئے ان بلبوں کی تار سے شعلے نکلے اور اسٹیج پر نصب ایک سینری پر گرے اور اس کو آگ لگ گئی۔ اس آگ کو لگتا ہوا تماشائیوں نے بھی دیکھا۔ مگر یہ اتنی معمولی تھی کہ کسی کو خوف محسوس نہیں ہوا۔ اسٹیج پر موجود عملے کے ارکان نے اس آگ کو ہاتھوں سے بجھانے کی کوشش کی مگر یہ بجھنے کی بجائے مزید بھڑک اٹھی اور پھیلنا شروع ہوئی۔ آگ کو بڑھتا ہوا دیکھ کر لوگوں کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

اسٹیج کے عقبی ڈریسنگ میں اداکار ایڈی فوائے نے جو اپنی انٹری کا انتظار کر رہا تھا اور اسے اسٹیج پر لگنے والی اس آگ کا علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اگر کسی نے "لفظ آگ" بولا تو قیامت مچ جائے گی۔ اور ہر شخص آگ کے خوف سے باہر نکلنے کے لیے دوڑ پڑے گا۔ ان حالات میں اس نے اسٹیج پر آ کر اعلان کیا کہ

" ناظرین! آپ فکر مت کیجئے سب کچھ ٹھیک ہے۔ آپ برائے مہربانی افراتفری پھیلانے سے پرہیز کریں۔ تھوڑی دیر بعد کھیل کو دوبارہ شروع کیا جائے گا۔"

مگر اس کے بعد ایڈی فوائے نے اسٹیج کے عملے کو کہا کہ وہ ایسبسٹاس کا پردہ گرا دیں تا کہ آگ اسٹیج سے آگے نہ بڑھے مگر ایسا کوئی پردہ اس تھیٹر میں سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ اس لیے عملے نے ایک سینری نیچے لٹکا دی جو نیچے آتے ہوئے راستے ہی میں اٹک گئی۔ اس کے بعد تمام اداکار اور عملے ارکان ایک عقبی راستے سے خود بھی باہر نکل گئے۔ اس عقبی راستے کے کھولے جانے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اس دروازے سے آنے والے ہوا کے جھونکے شعلوں کو مزید بھڑکانے کا سبب بن گئے۔ آگ اب اس سینری کو بھی لگ گئی جو ناظرین کے سروں پر لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہر طرف افراتفری مچ گئی اور ہر شخص آگ سے بچاؤ کے ہنگامی راستوں کی طرف دوڑا۔ نتیجہ میں جو بھگدڑ مچی اس سے 402 افراد ہلاک ہوگئے۔ آگ بجھانے والا عملہ اگرچہ بروقت پہنچ گیا مگر بھگدڑ کی وجہ سے مرنے والوں کی لاشوں کے ڈھیروں نے دروازوں اور لابی میں سے گزرنے کی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ اس لیے آگ بجھانے والا عملہ کچھ نہ کر سکا اور تھیٹر جلتا رہا۔ پھر خدا خدا کر کے جب آگ بجھی تو سب سے کام پہلا کام لاشوں کو نکالنا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق آگ بجھانے والا عملہ تقریباً اگلے تین گھنٹے تک مسلسل دو یا تین لاشیں فی منٹ کے حساب سے باہر نکالتا رہا۔ ان لاشوں سے جو رقوم اور قیمتی اشیاء اکٹھی کی گئیں ان سے بالٹیاں بھر گئیں۔ مرنے والوں میں سینکڑوں بچے بھی شامل تھے جو ایڈی فوائے کی پرفارمنس دیکھنے آئے تھے۔

شکاگو کے ایروکوئیس تھیٹر میں لگنے والی یہ آگ امریکی تاریخ میں تھیٹروں میں لگنے والی سب سے خوفناک آگ تھی۔ سانحے کے بعد تھیٹر کے مالکان نے ناظرین پر الزام لگایا کہ ان کے بھگدڑ مچانے کی وجہ سے یہ سانحہ پیش آیا اور اتنی وسیع تعداد میں اموات واقع ہوئی ہیں۔ پھر پولیس اور دیگر تفتیشی اداروں کی تفتیش سے یہ قلعی کھل گئی کہ عمارت میں تعمیراتی طور پر بہت سے نقائص تھے اور تھیٹر کے مالکان نے آگ سے بچنے کے لیے سرے سے کوئی انتظامات کیے ہی نہیں تھے۔

تاہم تھیٹر کے مالکان پر یہ الزام ثابت ہوجانے کے باوجود ان پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ مقدمے کی صورت میں شکاگو فائر ڈیپارٹمنٹ اور پولیس کے علاوہ دیگر حکام پر بھی بدعنوانی کرنے کے بہت سے الزامات سامنے آتے تھے۔

ادھر آگ کے دوران ہی کچھ ابن الوقت لوگوں نے تھیٹر میں گھس کر جلتے ہوئے تماشائیوں کی مدد کرنے کی بجائے لوٹ مار کا بازار گرم کردیا اور یہ لٹیرے لاشوں کی جیبوں اور جسموں پر سے قیمتی اشیا لوٹنے میں مصروف ہوگئے تھے۔ تاہم اس کی سزا ان لٹیروں کو بھی نقد ملی تھی اور ان میں سے بہت سے دھوئیں کی شدت کی وجہ سے دم گھوٹ کر ہلاک ہوگئے۔

ایروکوئیس تھیٹر کے اس سانحے نے البتہ امریکی قوم کے ضمیر کو جگادیا تھا اور امریکہ کے دیگر شہروں میں موجود تھیٹروں کی مکمل طور پر جانچ پڑتال کی گی۔ نیو یارک میں تھیٹر مالکان کے فائر پروف دعوؤں کے باوجود کئی تھیٹر بند کردیے گئے۔ ادھر تعمیر نو اور مرمت کے بعد 1904ء میں ایروکوئیس تھیٹر کو دوبارہ کھولا گیا مگر اس کا نام تبدیل کرکے ''کولونیئل تھیٹر'' رکھ دیا گیا۔ 1925ء میں یہ تھیٹر بھی بند کردیا گیا اور اسکی جگہ پر اوریئنٹل تھیٹر کھولا گیا۔ یہ تھیٹر 1998ء میں بند کردیا گیا اور اسکی جگہ پر فورڈ سنٹر برائے پرفارمنس کھولا گیا جس میں آگ بجھانے کا ہر انتظام موجود ہے۔

1904ء.....امریکی بحری جہاز جنرل سلوکم پر آتش زدگی

آگ جہاں انسان کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں وہیں یہ ایک آفت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور انسانی تاریخ کے صفحات اس سے پہنچنے والے نقصانات سے بھرے پڑے ہیں۔

ایک دخانی بحری جہاز جنرل سلوکم کا نام ایک بہادر امریکی جنرل کے نام پر رکھا گیا تھا جس نے خانہ جنگی یونین آرمی کی کمانڈ کی تھی ۔ بعد ازاں یہ جنرل نیو یارک سے کانگریس کا رکن منتخب ہوا تھا۔ جنرل سلوکم ایک مسافر بردار بحری جہاز تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں نیو یارک کے مضافات میں جرمنی سے آنے والے لوگوں کی ایک بستی ''لٹل جرمنی'' کہلاتی تھی۔ اس آبادی میں سینٹ مارک کا لوتھرن چرچ واقع تھا۔ اس چرچ نے اپنے اسکول میں تعلیم پانے والے بچوں اور ان کے والدین کو سیر کرانے کے لیے بحری جہاز جنرل سلوکم کو کرائے پر حاصل کیا۔ یہ جہاز تیرہ سال سے خدمات انجام دے رہا تھا مگر ایک بدقسمت جہاز تھا اور دو مرتبہ سمندر کے سینے پر دوسرے جہازوں سے ٹکرا چکا تھا اور تین مرتبہ خشکی پر چڑھ چکا تھا۔ ایک مرتبہ اپنے 400 مسافروں کے ساتھ پوری رات سمندر میں بھٹکتا رہا تھا۔ 15 جون 1904ء کی صبح 9 بج کر 30 منٹ پر یہ جہاز اپنے 1300 مسافروں کے ساتھ ایسٹ ریور East Eiver کی سیاحت پر روانہ ہوا۔ دریا میں سفر کرتے ہوئے اسے دریا کے دونوں کناروں سے دیکھا جاسکتا تھا۔ پرسکون طور پر ایک گھنٹہ تک سفر کرنے کے بعد اس جہاز میں اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ کہتے ہیں کہ یہ آگ جہاز کے عین وسط میں عرشے کے نیچے واقع ایک سٹور میں کسی کے لاپرواہی سے جلتی ہوئی سگریٹ پھینکنے کی وجہ سے لگی تھی۔ دھواں نکلتا دیکھ کر عملے کے ایک رکن نے جیسے ہی اس سٹور کا دروازہ کھولا۔ ہوا لگنے سے شعلے تیزی سے بھڑکنے لگے اور آگ تیزی سی پھیلنے لگی۔ مسافروں نے آگ دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا۔ ادھر اس جہاز کا عملہ آگ بجھانے کی تربیت نہ ملنے کی وجہ سے نااہل تھا۔ اس نے آگ کو بجھانے کی کوشش کرنے کی بجائے عرشے پر جا کر خود بھی ''آگ آگ'' کا شور مچانا شروع کر دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس جہاز کے کپتان ولیم وان شیک کو جہاز پر آگ بھڑکنے کی فوری اطلاع دے دی گئی تھی مگر اس نے خود بھی اس حوالے سے کچھ نہ کیا اور سفر کو جاری رکھا۔ ادھر دریا کے کنارے پر کھڑے لوگ بھی خاموش تماشائی بنے اپنی دور بینوں سے جہاز پر خواتین اور بچوں کو بے بسی کے عالم میں آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا دیکھتے

رہے۔

ان حالات میں کئی مسافروں نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور جہاز پر زندہ نذر آتش ہونے کی بجائے پانی میں ڈوب گئے یا دریا میں گرنے کے بعد جہاز کی گھومتی ہوئی ٹربائن میں پھنس کر مر گئے۔

ادھر کیپٹن نے جہاز کو روک کر آگ بجھانے کی بجائے ساحل تک جلد پہنچنے کے لیے جہاز کی رفتار تیز کر دی۔ اس کے علاوہ وہ دریا میں واقع ایک جزیرے لنکن زمیڈو پر لنگر انداز ہو کر مسافروں کو جہاز سے باہر نکال کر ان کی جانیں بچا سکتا تھا مگر اس نے ایسا بھی نہیں کیا۔ بعد ازاں کپتان نے دعویٰ کیا کہ وہ جلتے ہوئے جہاز کو اگر اس جزیرے تک لے جاتا تو اس جزیرے کی عمارات کو آگ لگ جانے کا خطرہ تھا۔ اس لیے اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

جہاز کے مسلسل سفر کرنے کی وجہ سے شعلوں کو مزید ہوا ملی اور جہاز ایک متحرک جہنم زار بن گیا۔ ادھر نیو یارک سٹی کا آگ بجھانے والا عملہ بھی ساحل پر اس جہاز کی پہنچنے کا انتظار کرتا رہا اور دور سے لوگوں کو اس جہنم زار میں جلتا ہوا دیکھتا رہا۔ جہاز کے مسافر بے بسی کے عالم میں چیخ رہے تھے اور بے بسی کے عالم میں دریا میں چھلانگیں لگا رہے تھے کیونکہ اس کے سوا اور وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جہاز پر آگ بجھنے کی اس لیے بھی امید نہیں تھی کہ جہاز پر آگ بجھانے کے لیے پانی موجود نہیں تھا۔ سب لوگ آگ سے بچنے کی وجہ سے جہاز کی ریلنگ سے لٹکے ہوئے تھے جو سینکڑوں آدمیوں کا بوجھ پڑنے کی وجہ سے ٹوٹ گئی اور بہت سے لوگ دریا میں جا گرے۔

ان حالات میں جہاز بے قابو ہو کر نارتھ برادرز نامی جزیرے کی ساحلی چٹانوں سے ٹکرا گیا۔ کچھ خوش قسمت لوگ اس جہنم سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور بہت سے جہاز میں پھنس کر زندہ جل گئے۔ بحری حادثات میں اکثر کپتان اپنی جان تک دے کر مسافروں کی حفاظت کرتے ہیں مگر یہاں معاملہ الٹ تھا اور کپتان اور جہاز کا عملہ زندہ بچ گیا تھا۔ کپتان کے ساحل پر قدم رکھتے ہی اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اپنے فرائض سے غفلت برتنے پر اسے دس سال قید کی سزا دی گئی تاہم امریکی صدر ٹافت نے چند سال بعد اس کی سزا معاف کر دی مگر اسے کیپٹن کے عہدے کے لیے نااہل قرار دیا۔

1905ء.....سینٹ پیٹرز برگ، روس کا خونیں انقلاب

22 جنوری 1905ء کو سینٹ پیٹرز برگ روس میں زار روس کے حکم پر اس کے سرمائی محل کے باہر اس کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں پر زار کی وفادار فوجوں کے فائر کھولنے سے ایک ہزار سے زائد مظاہرین موقع پر ہلاک ہوگئے اور ہزاروں کی تعداد میں شدید زخمی ہوئے۔ زار روس بیسویں صدی کے آغاز تک ایک مطلق العنان حکمران تھا جس کے ایسے ظالمانہ اقدامات نے خود اس کے خلاف 1917ء کا بڑا انقلاب برپا کر دیا تھا۔

1905ء میں شاہ روس، زار نکولس دوم Czarnicholas-II تھا۔ وہ اس جدید زمانے میں بھی ایک مطلق العنان حکمران تھا۔ دوسرے الفاظ میں روس میں بیسویں صدی کے آغاز تک مطلق العنان بادشاہی قائم تھی۔ کسی قسم کا کوئی احتجاجی مظاہرہ جو زار کو پسند نہ ہوتا اسے بزور طاقت دبا دیا جاتا تھا۔ جیسے جیسے اس ملک میں صنعتیں لگائی گئیں تو ریاست اور مفلس و مفلوک الحال مزدور طبقے میں ٹکراؤ بڑھتا چلا گیا تھا اور پر تشدد ہوگیا تھا۔ ان مظاہروں میں اور سال بہ سال بڑھتی ہوئی ہڑتالوں میں کئی مفلوک الحال مزدور ہلاک ہوگئے تھے۔ 22 جنوری کو تقریباً ایک لاکھ احتجاجی مزدوروں نے ایک پادری کی راہنمائی میں اپنی احتجاجی قرارداد پیش کرنے کے لیے روس کے دارالحکومت سینٹ پیٹرز برگ میں زار کے سرمائی محل کی طرف ایک پرامن مارچ کیا۔ یہ احتجاجی مزدور کوئی سیاسی مطالبہ نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنی معاشی حالت بہتر کرنے کے لیے صرف روزگار کے لیے اچھی شرائط کا مطالبہ کر رہے تھے مگر زار کے سرمائی محل کے سامنے پہنچنے کے بعد ان کا دوستانہ طور پر استقبال کیے جانے کی بجائے ان پر گولیاں برسائیں گئیں جس کے بعد ایک ہزار سے زائد مفلوک الحال مزدور موقع پر ڈھیر ہوگئے اور ہزاروں شدید طور پر زخمی ہوگئے مگر ان کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ بلکہ یہ واقعہ روسی تاریخ کا ایک اہم انقلابی موڑ بن گیا۔

22 جنوری 1905ء کا یہ پرامن مظاہرہ مزید پریشانیاں اور حکومت سے ٹکراؤ کی حکمت عملی مرتب کرنے کا باعث بنا۔ احتجاجی مظاہرے اور تشدد آئندہ مہینوں میں اتنا بڑھا کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ زار روس اب ان مظاہروں کو گولیوں کے زور پر بھی نہیں روک سکے گا۔ آخر اپنی ظالمانہ ڈکٹیٹر شپ کے اس دور میں زار کو ان احتجاجیوں کو کچھ مراعات دینے کی ضرورت کا احساس ہونے لگا اور یہ بھی سوچا گیا کہ اگر

سرمائی محل کے باہر 22 جنوری کو احتجاجی مظاہرہ کرنے والوں سے زار کے نمائندے ایسا ظالمانہ سلوک نہ کرتے تو 1911ء کے خونریز واقعات بھی پیش نہ آتے۔ تاہم ان واقعات کے بعد زار کے کچھ مراعات دینے کا باقاعدہ طور پر اعلان کر دیا۔ اس مراعات کے اعلان نے 1917ء کے بڑے ٹکراؤ کو مزید تیز کرنے کے لیے موثر کر دیا۔

تاہم ان تمام احتیاطی تدابیر کے اختیار کرنے کے باوجود 1917ء کے ابتدائی مہینوں تک تمام حالات انقلاب کے لیے سازگار ہو چکے تھے۔ پھر 8 مارچ 1917ء کو دارالحکومت میں ہڑتالیں اور روٹی کے متعلق ہنگامے شروع ہو گئے۔ پھر اس کے چار روز بعد رومانوف خاندان کی بادشاہی کو جو 1613 سے جاری تھی تقدیر کی آخری مہر لگ گئی۔ اگرچہ کمیونسٹ یا بالشویک راہنما ان دنوں روس سے باہر جلاوطنی میں تھے مگر انقلاب بپا ہو گیا۔ اس مرتبہ انقلاب کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ زار کی فوج نے بھی اس کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ جب زار نے حکم دیا کہ ہڑتال کرنے والے مزدوروں پر گولی چلائی جائے تو صرف چند افراد نے اس کے اس خونی حکم کی تعمیل کی اور 13 مارچ کو خود اس کے اس حکم کے خلاف فوج بھی ہڑتالیوں میں شامل ہو گئی۔ اسلحہ کے ڈپوؤں کے دروازے توڑ دیے گئے پھر پولیس کا تعاقب شروع ہو گیا جس کے بعد پولیس بھی منظر عام سے ہٹ گئی۔ فوجوں کو یہ بغاوت دبانے کا حکم دیا گیا تو مزدوروں اور سپاہیوں کی ایک سوویٹ بنائی گئی جس نے روسی پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی سے بات چیت کی جس کے بعد ایک عارضی حکومت وجود میں آ گئی۔ اس کے ایک ماہ بعد لینن بھی اپنی جلاوطنی سے واپس آ گیا۔ اس کے بعد نومبر کا انقلاب بپا ہوا اور عارضی حکومت بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی۔ 20 اکتوبر کو لینن نے پیٹروگراڈ پہنچ کر ایک فوجی انقلابی کمیٹی پر اقتدار حاصل کر لیا تھا جس کے بعد عارضی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا اور 7 نومبر کو یہ انقلاب یا بغاوت شروع ہو گئی۔ چونکہ پیٹروگراڈ میں انقلاب کی پوری تیاری کر لی گئی تھی اس لیے اس شہر میں دوسرے شہروں کی نسبت بہت کم خونریزی ہوئی اور فوجی انقلابی کمیٹی نے سوویٹ کا نمائندہ بن کر اقتدار سنبھال لیا اور یوں 1905ء کے خونیں انقلاب میں بہنے والا خون رائیگاں نہیں گیا۔

1906ء.....سان فرانسسکو، کیلی فورنیا میں زلزلہ

18اپریل1906ء کو صبح سویرے5:30منٹ پر ابھی بہت سے شہری اپنی خواب گاہوں میں خوابیدہ تھے کہ ریکٹر اسکیل پر 7.8درجے کے ایک شدید زلزلے نے کیلی فورنیا کے شہر سان فرانسسکو کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ زلزلے کا پہلا جھٹکا صرف ایک منٹ طویل تھا مگر یہ قیامت خیز منٹ ایک سال سے بھی زیادہ طویل محسوس ہوا جو لوگ اس جھٹکے سے بیدار ہوئے وہ سلیپنگ ڈریس میں گھروں سے نکل کر گلیوں میں بھاگے۔ دوسرے جھٹکے کے ساتھ شہر کی ہر عمارت میں شکست وریخت شروع ہوگئی جس کی وجہ سے لوگ اپنے لرزتے ہوئے گھروں سے دور ہٹنے پر مجبور ہوگئے۔

پھر جب زمین پانی کی لہروں کی طرح اوپر نیچے اٹھنے لگی تو گیس کی پائپ لائنیں پھٹ گئیں جن کے آگ پکڑنے کی وجہ سے شہر میں ہر طرف خوفناک آگ بھڑک اٹھی۔ زلزلے کے جھٹکوں نے شہر میں بچھے ہوئے پانی کے پائپوں کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ جس نے آگ کو مزید خوفناک بنادیا کیونکہ پانی کے بغیر آگ بجھانے والا عملہ بھلا کیسے آگ بجھا سکتا تھا اس کے نتیجے میں سان فرانسسکو تین دن آگ کے شعلوں میں گھرا جلتا رہا۔

چونکہ مایوسی کے عالم میں انسان کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں اور وہ غلط قدم اٹھانے لگتا ہے۔ کچھ ایسا ہی فرانسسکو میں رہنے والے اطالوی گھرانوں نے کیا۔ بدحواسی میں یہ لوگ آگ پر شراب انڈیلتے رہے جس سے یہ مزید بھڑکتی رہی اور پانی پائپوں میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے آگ بجھانے والا عملہ غلیظ کیچڑ پائپوں کے ذریعے کھینچتا رہا۔

ادھر فوج نے آگ بجھانے کے لیے آگ کے راستے میں آنے والی عمارتوں کو ڈائنا میٹ سے اڑا دیا کہ ملبے کے ڈھیر آگ کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا اور عمارتی ملبے کے ڈھیروں میں بھی آگ بھڑک اٹھی اور حالات مزید خراب ہوگئے اور امریکہ کے اس بڑے شہر کے تقریباً500بلاک جل کر خاکستر ہوگئے شہر میں موجود پتھر سے تعمیر کی گئی تمام عمارات زمین بوس ہوگیں جبکہ بلندو بالا سکائی سکریپر اور کچھ لکڑی کے فریمو الی تعمیرات اس شدید زلزلے سے بچ گئیں تھیں تاہم لکڑی کے فریم والے گھروں نے آگ پکڑ لی۔

زلزلے نے شہر کی 28188 عمارات زمین بوس کر دی تھیں۔ ان عمارات میں سٹی ہال کی زلزلہ پروف بلڈنگ بھی شامل تھی جس کی تعمیر پر پچاس لاکھ ڈالر خرچ آئے تھے۔ شہر میں بے شمار اپارٹمنٹ ہاؤسز، سینما، ہوٹل، فیکٹریاں، ہسپتال، سکول، چرچ اور گھروں کی عمارتیں منہدم ہوگئیں۔ ان گرتی ہوئی عمارات سے جو لوگ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے ان میں سے کچھ گرتی ہوئی عمارتوں کے ملبے میں دب کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس زلزلے اور اس کے نتیجے میں لگی ہوئی آگ نے انسانوں اور جانوروں کو یکساں طور پر ہلاکت میں ڈالا تھا۔ ایک اخبار نے سان فرانسسکو کے زلزلے کی ایک ایسی تصویر بھی شائع کی تھی جس میں بہت سے مرے ہوئے گھوڑوں کے پاس امدادی کارکنوں کو کھڑا دکھایا گیا تھا۔

امریکی ریاست اور یگون اور نیواڈا تک اس زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گیے تھے۔ ادھر اس زلزلے نے سان فرانسسکو شہر میں بجلی کا نظام بھی مکمل طور پر تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ دو سے تین لاکھ افراد بے گھر ہوجانے کی وجہ سے شہر کے پارکوں میں خیموں کی بستیاں آباد ہوگئیں اور بہت سے انسان کھلے آسمان تلے رہنے پر مجبور ہوگئے۔

جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اتنی بڑی قدرتی آفت کے بعد باقی زندہ بچنے والے افراد وبائی امراض کا شکار ہوجاتے ہیں۔ سان فرانسسکو میں گلٹی دار طاعون کی وباء ایک محدود پیمانے پر پھیل گئی اور اس سے تقریباً150افراد ہلاک ہوگئے۔ اس قدرتی آفت اور آگ لگنے سے ہونے والی اموات کی کل تعداد3000 سے زائد تھی۔ ایک چشم دید گواہ کے مطابق زلزلے کے جھٹکوں کے دوران شہر کی گلیاں اور شاہراہیں پانی کی لہروں کی طرح ہلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ زلزلے کے بعد گلیوں میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور ہر طرف انسانی خون پھیل گیا۔ پچکی ہوئی کھوپڑیاں، کٹے ہوئے اعضا اور خون میں لتھڑے ہوئے انسانی لاشے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے مگر ان حالات میں بھی کچھ انسانی درندگی پر اتر آئے اور شہر میں زلزلے اور آگ کی قیامت ٹوٹنے کے بعد لوٹ مار کرنے لگے۔ شہر کے میئر کو مجبوراً پولیس کے افسروں کو یہ اختیار دینا پڑا کہ لوٹ مار یا کسی دوسرے جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو بے دریغ گولی مار دی جائے۔

اس قدرتی آفت کے بعد شہر کی تعمیر میں تین سال صرف ہوئے۔ دراصل امریکہ کا یہ شہر زلزلوں کی آماجگاہ چھ سو میل طویل سان اینڈریاس ٹالٹ پر واقع ہے۔ اس مقام پر ارضیاتی پرتیں مستقل طور پر متحرک رہتی ہیں اور اکثر بڑے زلزلوں کا سبب بن جاتی ہیں۔

1906ء.....کوریئرز،کوئلے کی کان میں دھماکہ

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں شمالی فرانس کے قصبے کوریئرزCourriers کی آبادی4ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ سب لوگ اپنے بال بچوں کے لیے روزی کوئلے کی کان میں کام کرکے کماتے تھے۔ہفتہ 10مارچ کی صبح1800جوان اور درمیانی عمر کے لوگ کان میں کام کے لیے نیچے اترے۔ابھی صبح کے 6:30بجے تھے، جیسے تین پنجرے ان لوگوں سے بھرے ہوئے کان کی تہہ میں اترے تو ایک بہت شدید دھماکہ ہوا جس سے کان کے آس پاس کی عمارتیں تک منہدم ہوگئیں۔

کان کنوں نے سر پر ایک بھاری ہیٹ پہنا ہوا ہوتا ہے تا کہ حادثات میں سر کو نقصان نہ پہنچے۔10مارچ کی صبح کو کان کنی کے لیے نیچے سرنگوں میں اترنے والی افراد میں سے کسی کو بھی خیال نہیں گزرا تھا کہ آج کا دن ان کی زندگی کا آخری دن ہے۔ پھر اچانک کان کے داخلی راستے پر پڑے ہوئے کوئلے کی برادے میں زبردست دھماکہ ہوا۔ اس دھماکے کے کچھ دیر بعد4زخمی کان کن سطح پر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ انسانوں اور باربردار گھوڑوں کے مردہ اجسام کو پھلانگ کر اوپر آنے والی رسیوں تک پہنچے تھے۔ابھی یہ لوگ نکالے ہی جارہے تھے کہ کان کے دہانے سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔

کان کنوں کی بیویاں اور بچے اور احباب ہزاروں کی تعداد میں کان کے دہانے کے قریب جمع ہوگئے۔ان میں سے ہر شخص اپنے عزیز کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ پولیس ان لوگوں کو پیچھے دھکیل رہی تھی ۔ایسے میں ایک شخص بے قابو ہوکر پولیس کی رکاوٹ کو عبور کرکے اپنے بھائی کو تلاش کرنے کے لیے کان میں اتر پڑا مگر وہ خود بھی پھر کبھی باہر نہ آسکا۔ وہ اور اس کا کان کن بھائی دونوں اس حادثے کی نذر ہوگئے۔

تاہم امدادی جماعتیں کان میں انتہائی بہادری کے ساتھ اتریں۔ اور650ایسے افراد کی زندگیاں بچانے میں کامیاب ہوگئیں جو دھماکے کے مقام سے فاصلے پر کام کررہے تھے۔مگر دھماکے کے مقام سے صرف لاشیں ہی اوپر لائی جاسکیں تھیں جنہیں دیکھ کر ان کے اقرباء کی چیخیں نکل گئیں ۔ یہ منظر پاگل کردینے والا تھا۔عزیز واقارب اپنے متوفیوں کے غم میں تڑپ رہے تھے۔

کان میں دھماکہ کس وجہ سے ہوا تھا اس کا جواب ایک سو سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود

نہیں مل سکا۔ بعض کے نزدیک یہ دھماکہ بجلی کے شارٹ سرکٹ سے ہوا تھا یا شاید کوئی سلگتی ہوئی چنگاری کوئلے برادے میں جا گری تھی اور دھماکے کا سبب بن گئی تھی۔ یہ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ اس نے کوئلہ کھینچنے والی بھاری ٹرالیوں اور دیگر آلات تک کو کان کے دہانے پر اڑا دیا تھا۔ دھماکے کے فوراً بعد کان میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور کان کی ایک سرنگ کی چھت بھی اڑ گئی تھی ان اڑتی ہوئی اشیاء کے سامنے آنے والا ہر شخص یا گھوڑا مارا گیا تھا۔ کان میں 98 گھوڑے بھی مارے گئے تھے شاید ان جانوروں کو انسان سے وفاداری کرنے کی یہ سزا ملی تھی۔

حادثے کے بعد کان کی کھدائی فوراً شروع ہوگئی تھی۔ اس کھدائی کے راستے میں کاربن مانو آکسائیڈ جیسی زہریلی گیس حائل تھی جس کی وجہ سے کھدائی کا کام خاصا سست تھا۔ مگر اس کے باوجود 735 افراد زندہ بچا لیے گئے مگر باقی ایک ہزار سے زائد افراد ہلاک ہوگئے تھے۔

کان میں دھماکے کے بعد پھیلی ہوئی مہلک گیس کاربن مانو آکسائیڈ ایک انتہائی زہریلی گیس ہوتی ہے۔ یہ سانس کے راستے آکسیجن کی جگہ خون میں جذب ہو کر نقصان پہنچاتی ہے۔ اگر ایسے انسان کو آکسیجن نہ دی جائے تا کھلی فضا میں نہ لٹایا جائے تو ہلاک ہو جاتا ہے۔ کاربن مونو آکسائیڈ سے متاثر انسان اگر تازہ ہوا میں لٹا دیا جائے تو اس کا جسم آکسیجن کو دوبارہ جذب کر لیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ آرام سے لیٹا رہے اور حرکت نہ کرے۔ کانوں میں ایسے متاثرہ افراد کی جان بچانے کا بنیادی اصول یہی ہے کہ انہیں کام سے روک دیا جاتا ہے اور چلنے پھرنے تک نہیں دیا جاتا۔

کوریئرز میں کوئلے کی کانیں بیلجیئم اور جرمنی کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کوریئرز کی کان میں دھماکہ فرانس کی تاریخ کا بدترین سانحہ تھا جس میں ایک ہزار ننانوے (1099) افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔ انہیں دھماکوں کی وجہ سے کوئلے کی کانوں میں کان کنی کرنا انسانی تاریخ کا سب سے دشوار ترین اور خطرناک کام رہا ہے۔ کان میں کام کرتے ہوئے کسی وقت بھی انسان خطرے سے باہر نہیں رہتا تھا۔

1907ء.....مونونگاہ کوئلے کی کان میں دھماکہ

کوئلے کی کانوں سے کام کرنے والے کان کنوں کے سر پر ہمیشہ سے خطرے کی تلوار لٹکتی رہی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ٹیکنالوجی میں ترقی کے باوجود بھی کانوں میں کام کرنا انتہائی خطرناک تھا مگر کوئلے کی دولت جدید زمانے کی انتہائی ضروریات میں شامل تھی اور تمام دنیا میں اس کی کانیں موجود تھیں۔ ویسٹ ورجینیا اور پنسلوانیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کوئلہ پیدا کرنے والے سب سے اہم علاقے تھے۔ مونو نگاہ ویسٹ ورجینیا کی کان میں 6دسمبر 1907ء کو جب 363 کان کن کام کرنے کے لیے نیچے اترے ان363لوگوں میں سے صرف ایک کان کن نہیں تھا وہ ایک انشورنس سلیز مین تھا۔ کان میں کام صبح پانچ بجے سے بھی پہلے شروع ہوگیا۔ کوئلے کا برادہ انتہائی آتش گیر مادہ ہوتا ہے۔ اگر اسے پانی سے مرطوب نہ کیا جائے تو یہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے۔ کوئلے کا برادہ ہی اس کان میں ہر طرف بکھرا ہوا تھا۔ کان کے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے بیسویں صدی کے آغاز تک کھلے شعلے والا کاربائیڈ لیمپ استعمال ہوتا تھا جو اس کام کو مزید خطرناک بنا دیتا تھا اور اکثر اس لیمپ کے استعمال سے کوئلے کا برادہ آگ پکڑ کر دھماکہ خیز بن جاتا تھا۔ 6دسمبر کو کان نمبر6 میں کام شروع ہوئے ابھی صرف پانچ گھنٹے ہی گزرے تھے کہ ایک شدید دھماکہ کی آواز سنائی دی۔ پھر اس کے ساتھ ہی کان نمبر8 میں بھی دھماکہ ہوا۔

ان دھماکوں کی شدت کی وجہ سے کانوں کے آس پاس 8مربع میل تک زمین لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اس علاقے میں کوئی بڑا بھونچال آ گیا ہو۔ اس علاقے میں موجود تمام عمارتیں لرز کر رہ گئیں اور انہیں شدید نقصان پہنچا جو لوگ اپنے گھوڑوں پر سوار تھے وہ زمین پر آ گرے۔ کان نمبر6اور کان نمبر8اس زمانے میں جدید ترین کانیں تصور کی جاتی تھیں اور یہ دونوں زیر زمین آپس میں باہم مربوط تھیں۔ ان کانوں میں کوئلہ کاٹنے کے لیے بجلی کی طاقت سے کام لیا جاتا تھا جبکہ کوئلے کو لاد کر اوپر لانے کے لیے لوکوموٹو انجن استعمال کیے جاتے تھے۔ کانوں سے کاربن مونو آکسائیڈ کے اخراج کے لیے مکینیکل پنکھوں سے کام لیا جاتا تھا۔

دھماکوں کے بعد کان کے باہر اور اندر ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ اس حادثے کی نوعیت کے معلوم ہونے تک کچھ کہنا مشکل تھا۔ اس کا بھی پتا نہیں چل سکا تھا کہ دھماکوں کے بعد کانوں کے اندر آگ

بھڑک اٹھی ہے یا کاربن مونو آکسائیڈ گیس بھر گئی ہے۔ ان دھماکوں کے کچھ دیر بعد چار کان کن ہ
میں کامیاب ہوئے۔ وہ اتنے حواس باختہ تھے کہ نیچے کان میں پھنسے ہوئے دیگر کے بارے میں
بتانے سے قاصر تھے۔ اگرچہ وہ خود زخمی ہوئے تھے مگر انہیں کوئی سنگین نقصان نہیں پہنچا تھا۔

امدادی کارکنوں نے کان کے داخلی راستے سے ملبہ ہٹایا اور کان میں اتر گئے مگر وہ خود بھی کان
پھیلی ہوئی زہریلی کاربن مونو آکسائیڈ گیس سے متاثر ہوگئے اور خود انہیں دیگر رضاکار نکال کر
لائے۔

ان دھماکوں کی وجہ سے کان سے زہریلی گیس خارج کرنے کے پنکھے بھی کام کرنا چھوڑ گئے تھے
کی وجہ سے دھماکوں کے بعد کانوں میں ہر طرف زہریلی گیس پھیل گئی جس کی وجہ سے کسی انسان کا
کانوں میں زندہ بچنا مشکل ہوگیا۔ ادھر کوئلے کی دم گھونٹ دینے والی گرد اور دیگر ٹوٹے پھوٹے آلات
کے ڈھیروں نے کان میں امدادی جماعتوں کا آگے بڑھنا مشکل کردیا۔

4 بجے دن ایک کراپ ہول کے قریب انسانوں کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک امدادی
کارکن اس کے فوراً بعد رسے کے ذریعے کان میں اترا تو اس نے دیکھا کہ ایک کان کن اپنے بھائی کی
لاش کے قریب بیٹھا رو رہا ہے۔ وہ 362 کان کنوں میں سے زندہ بچنے والا پہلا اور آخری انسان تھا۔

کئی دنوں کے بعد جب امدادی جماعتیں کان میں 3000 فٹ کی گہرائی تک پہنچنے میں کامیاب
ہوئیں تو انہیں کان کنوں کی لاشیں ملبے میں دبی ہوئی ملیں۔ کانوں کے اندر کی فضا سخت گرم تھی اور لاشوں
سے اٹھنے والے تعفن نے اسے ناقابل برداشت بنا دیا تھا۔ تاہم امدادی جماعتیں اس خیال سے کانوں
میں آگے بڑھتی گئیں کہ شاید کوئی انسان زندہ ہو مگر ایسا نہ ہوا۔

لاشوں کے نکالے جانے کے بعد ایک قریبی بینک کو مردہ خانے میں تبدیل کردیا گیا اور متوفیان کی
تجہیز و تکفین شروع ہوگئی۔ مقامی گرجا گھروں میں دن میں کئی کئی بار ماتمی سروسز ہوئیں اور قریبی پہاڑی
علاقے میں سینکڑوں قبریں کھودی گئیں۔

یہ حادثہ ایک کوئلہ لادنے والی ٹرین کے ڈبے سے اس سے الگ ہو کر کان کی پاور لائن سے ٹکرانے
کی وجہ سے شارٹ سرکٹ کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس حادثے میں 362 افراد کے ہلاک ہوجانے سے
1000 عورتیں اور بچے متاثر ہوئے تھے۔

1908ء.....میسینا، سسلی کا ہولناک زلزلہ

28 دسمبر 1908ء کو اطالوی جزیرے سسلی کے شہر میسینا Messina میں صبح پانچ بج کر پچیس منٹ پر ایک ہولناک زلزلہ آیا۔ اس زلزلے کا مرکز جزیرہ نما اٹلی کو جزیرہ سسلی سے الگ کرنے والی پتلی سی آبنائے میسینا کی تہہ میں تھا اور زلزلے کا آغاز آبنائے کے پانیوں کے نیچے سے ہوا تھا۔ لندن کا رہنے والا ایک جہاز توڑنے والا انجینئر مسینیا کی بندرگاہ کے قریب واقع ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق زلزلے کے پہلے شدید جھٹکے نے جب میسینا کے در و بام کو جھنجھوڑا تو اس کی آنکھ کھل گئی اور اسے اندھیرے میں محسوس ہوا جیسے میں خلا کی پہنائیوں میں گرتا جارہا ہوں۔ پھر جب اس نے ماچس کی تیلی جلا کر روشنی کی تو پتا چلا کہ اس کا بیڈ ہوٹل کے کمرے کی بجائے کسی گہری گھاٹی کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ اس نے بستر کی چادریں ایک دوسرے سے باندھ کر گھاٹی میں اُترنے کی کوشش کی جبکہ اس کے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے دیگر مہمانوں نے ہوٹل کی کھڑکیوں سے چھلانگ لگا کر اس قدرتی آفت سے بچنے کی کوشش کی مگر بلندی کی وجہ سے جاں بحق ہوگئے۔ ایک اور مہمان کی آنکھ اس وقت کھلی جب ہوٹل کی چھت اس پر آ گری تھی۔ وہ ملبے میں اس قدر دب چکا تھا کہ اپنے ہاتھ پاؤں تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ مگر اس ملبے کے ایک سوراخ سے وہ سانس لے سکتا تھا۔ اس نے چلانے کی کوشش کی تا کہ امدادی کارکن اسے بچالیں۔ مگر اس کا چلانا صدا بصحرا ثابت ہوا۔

زلزلے کے پہلے شدید جھٹکے کے بعد کئی اور شدید جھٹکے آئے جن میں سے ہر جھٹکا آدھا منٹ تک جاری رہا۔ زمین کے بری طرح ہلنے کی وجہ سے شہر کی عمارات یکے بعد دیگرے اس طرح گرنے لگیں جیسے کوئی ڈائنامیٹ کا سوئچ دبا کر ہر منٹ کے بعد انہیں گرا رہا ہو۔ ابھی ان شدید جھٹکوں سے شہری سنبھل نہ پائے تھے کہ پچاس فٹ بلند سونامی کی لہر نے جس کی رفتار پانچ سو میل فی گھنٹہ تھی شہر کو آلیا اور واپسی میں انسانوں سمیت ہر شے کو گھسیٹ کر سمندر میں لے گئی۔ ادھر زلزلے کے بعد شہر میں گیس اور پانی کے پائپ لائین پھٹ گئیں جس کے بعد شہر میں جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھی اور ہر طرف انسانی لاشیں بکھر گئیں۔

آبنائے میسینا کی اٹلی والی سمت میں یہ زلزلہ بہت سی ساحلی بستیوں کو تباہ و برباد کرکے شمال کی سمت میں کوسینزا تک تباہی مچاتا ہوا چلا گیا۔ جبکہ سسلی کی سمت میں اس نے میسینا اور اس کے ہمسائے ہیٹی کو تباہ

کر دیا اور جنوب میں پیلوٹو وتوریا اور دیگر آبادیوں کو برباد کرتا چلا گیا۔

میسینا کا قدیم کیتھیڈرل اور ایک فوجی ہسپتال اس زلزلے سے دیگر عمارتوں کے ساتھ منہدم ہوئے فوجیوں کی بیرکیں گرنے کی وجہ سے تقریباً800 فوجی ہلاک ہوگئے۔ ریلوے اسٹیشن منہدم ہونے سے 40 ریلوے ورکر مارے گئے۔ میسینا کی ایک جیل کی عمارت کی دیواریں گرنے کی وجہ سے 1000 قیدی جاں بحق ہوگئے۔ سسلی میں اکثر زلزلوں کی آمد کی وجہ سے یہاں عمارتیں ہلکی پھلکی اور زلزلے سے بچاؤ کی تدابیر کے ساتھ تعمیر کی جاتی تھیں مگر امراء کے محل ان احتیاطی تدابیر سے ماورا تھے۔ ایک امریکی رپورٹ کے مطابق امراء کے محل میسینا میں موت کے پھندے ثابت ہوئے اور محلات کے گرنے سے بہت سی عمارات بھی منہدم ہوگئیں۔

موقع پرستی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اسی وجہ سے زلزلے، آتشزدگی اور سیلاب کے بعد لٹیرے میسینا میں دوکانوں، گوداموں اور گھروں پر پل پڑے۔ لاشوں کی جیبوں سے قیمتی اشیاء چرانے کرنے لگے۔ دوسری طرف قانون پسند شہری بھی کھانے کی تلاش میں چوریاں کرنے لگے۔

زلزلے کی آمد کے ایک دن بعد آبنائے میسینا سے گزرنے والے تین روسی بحری جنگی جہاز میسینا کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئے اور ان کے عملے نے شہر میں امدادی کارروائیاں انجام دیں۔600 کے قریب روسی فوجی جہازوں سے اتر کر شہر میں داخل ہوگئے اور انہوں نے شہر میں نظم وضبط اور امن بحال کیا۔ صرف زخمیوں کو بچایا اور طبی امداد پہنچائی بلکہ لٹیروں اور چوروں کو بھی گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دی۔ روسیوں کی آمد کے کئے گھنٹے بعد پانچ برطانوی جنگی بحری جہاز بھی میسینا پہنچے اور روسیوں کے ساتھ امدادی کارروائیوں میں شریک ہوگئے اور ہنگامی ہسپتال اور بے گھروں کے لیے عارضی رہائشی کیمپ قائم کردیے گئے۔تاہم آبنائے میں موجود امریکی بحری جہازوں نے اس امدادی کارروائی میں شرکت نہیں کی کیونکہ پچھلے سال بحیرہ کیریبین کے علاقے میں آنے والے ایک زلزلے کے بعد کنگسٹن اور جمیکا کے گورنروں نے امریکہ کی امدادی پیش کش کو مسترد کردیا تھا اس کے بعد امریکی حکام نے یہ پالیسی اختیار کی کہ اگر کوئی انہیں امداد کی درخواست کرے گا تو وہ اس کی مدد کریں گے بصورت دیگر وہ شریک نہیں ہوں گے۔ اس کے باوجود امریکہ نے اٹلی کو زلزلہ سے متاثر لوگوں کے لیے کروڑوں ڈالر کی امداد بہم پہنچائی۔ میسینا میں ہونے والی امدادی کارروائیوں میں بعد ازاں اٹلی کے بادشاہ وکٹر عما نویل نے بنفس نفیس شرکت کی اور کئی گھنٹے تک لوگوں کو ملبے سے نکالا تھا۔

1912ء.....ٹائی ٹینک کے آئس برگ سے ٹکرانے کا المیہ

بحر شمالی اوقیانوس میں سینٹ جان ،نیوفاؤنڈ لینڈ کے 400 میل جنوب میں اور نیو یارک کے 800 میل مشرق میں ،ناقابل غرقابی بحری جہاز ٹائی ٹینک اچانک ایک آئس برگ سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔ اس حادثے میں اس جہاز کے ناقابل غرقابی ہونے کی وجہ سے جان بچانے والی کشتیاں بہت کم رکھی گئی تھیں۔ اس وجہ اور دیگر وجوہات کی بنا پر 1490 انسان لقمہ اجل بن گئے اور یہ بیسویں صدی کے الم ناک حادثوں میں ایک بڑا حادثہ بن گیا۔

1894ء میں ضابطہ تحریر میں لائے جانے والے بحری قوانین کے تحت کوئی مسافر بردار بحری جہاز جس کا وزن 10 ہزار ٹن سے زائد ہو۔ اس پر لازم تھا کہ وہ 16 جان بچانے والی کشتیاں ساتھ رکھے۔ ادھر ٹائی ٹینک کا ڈیزائن تیار کرنے والے انجینئرز کو علم تھا کہ اگر اس جہاز کے 16 واٹر پروف کمپارٹمنٹوں میں سے چار میں پانی بھر جائے تو یہ جہاز تیرتا رہے گا۔ مگر اگر پانچویں کمپارٹمنٹ میں بھی پانی بھر جائے تو پھر اس ناقابل غرقابی جہاز کا پانی کی سطح پر رہنا ممکن نہیں رہے گا مگر اس امکانی غرقابی کے باوجود اس جہاز میں جان بچانے والی کشتیاں کم ہی رکھی گئی تھیں۔

10 اپریل 1912ء کو ٹائی ٹینک ساؤتھمپٹن سے نیو یارک کے لیے اپنے اولین سفر پر روانہ ہوا۔ روانگی کے اگلے دن ہی جہاز کے کپتان کو ایک ریڈیائی پیغام وصول ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ جہاز کے راستے میں کئی بڑے بڑے آئس برگ اپنے مقام سے بہت آگے جنوبی سمت میں بڑھ آئے ہیں جن سے بچ کر چلنا بہت ضروری ہے ۔ٹائی ٹینک کے کپتان اوسمتھ نے جہاز کا راستہ تبدیل کردیا اور 22 ناٹ Knot فی گھنٹہ کے حساب سے سفر جاری رکھا جو ایک انتہائی رفتار تھی۔

ٹائی ٹینک اپنے اس اولین سفر میں ساؤتھمپٹن سے نیو یارک جاتے ہوئے 15 اپریل 1912ء کو صبح 3 بجے کے قریب ہیلی فیکس، کینیڈا سے 800 میل کی دوری پر ایک آئس برگ سے ٹکرا گیا جس کے صرف ایک منٹ بعد اس جہاز کے زیریں حصے میں ایک 300 فٹ طویل شگاف پڑ گیا۔ ایک گھنٹے بعد ٹائی ٹینک ایک پہلو پر جھک گیا۔ کپتان نے اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے عملے کو حکم دیا کہ تمام مسافروں کو لائف بوٹ میں سوار کرادیا جائے مگر حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ لائف بوٹس کا اہتمام صرف آدھے مسافروں کے

لیے تھا جبکہ جہاز میں 2227 مسافر سوار تھے۔ ان میں سے 1490 مسافر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو
جنگ عظیم اول سے قبل کے سالوں میں یورپ اور امریکہ کے درمیان بحری جہازوں کی بڑی
تعداد سفر کرتی تھی اور یورپ سے امریکہ نقل مکانی کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ امریکہ کی بڑھتی ہوئی
کاری میں یورپی تاجروں کی دلچسپی کا سامان تھا۔ اسی بحری ٹریفک کو دیکھتے ہوئے جہاز ران کمپنیاں
اور تیز رفتار بحری جہاز بنانے کے لیے کوشاں تھیں۔ 1911ء میں 31 مئی کو اسی سلسلے میں ٹائی ٹینک
میں اتارا گیا۔ اپنے پانی میں اتارے جانے کے وقت سے جہاز کی تشہیر ایک ناقابل غرقابی جہاز
پر کی گئی۔ ٹائی ٹینک 46000 ٹن وزنی ایک گیارہ منزلہ جہاز تھا اور 16 واٹر ٹائیٹ کمپارٹمنٹوں میں تقسیم
گیا تھا۔ اس جہاز کی ایک اور خوبی 1912ء میں نیا نیا متعارف کرایا گیا ریڈیو وائرلیس سسٹم تھا جو
اس زمانے تک بہت کم بحری جہاز لیس ہوتے تھے۔ مگر تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ جدید تحقیق سے
ہے کہ یہ جہاز بہت سی خامیوں کا بھی مرقع تھا۔ اس میں استعمال کیا گیا اسٹیل اس دور کے معیار
مطابق بھی انتہائی گھٹیا درجے کا تھا۔ ٹائی ٹینک کی پلیٹوں کو باہم جوڑنے کے لیے جو بولٹ استعمال
گئے تھے وہ بھی ناقص اسٹیل سے تیار کیے گئے تھے۔ ایک محقق کے مطابق اس کے کمپارٹمنٹوں کو تقسیم
والی دیواروں کا کم بلند ہونا بھی اس جہاز کے بنیادی نقائص میں شامل تھا۔ اگر یہ دیواریں چھت تک
گئی ہوتیں تو شاید ٹائی ٹینک کبھی بھی نہیں ڈوبتا اور پانی اگلے کمپارٹمنٹوں تک کبھی بھی نہ پہنچ سکتا تھا۔

14 اپریل کو آدھی رات کے بعد بحر اوقیانوس کے جنوبی حصے مین سفر کرتے ہوئے جہاز کے
اچانک ایک آئس برگ نظر آیا یہ 16 فٹ پانی کی سطح کے اوپر تھا جبکہ اس کا بڑا حصہ زیر سطح آب
چونکہ جہاز اور اس آئس برگ میں بہت کم فاصلہ تھا۔ اس لیے کیپٹن نے انجن بند کردینے کا حکم دیا
چونکہ جہاز پوری رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا اس لیے اس حکم کو دینے میں تاخیر ہوگئی۔ ادھر جب کپتان
اس آئس برگ سے بچنے کے لیے جہاز کی سمت تبدیل کی تو جہاز کا زیریں حصہ اس آئس برگ
ٹکرا گیا۔ جہاز کے عملے نے اس ٹکراؤ کے دوران دھچکا محسوس کیا اور رگڑ کی آواز سنی اور اندازہ لگایا
شاید جہاز کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچا مگر فرسٹ آفیسر نے احتیاطاً تمام واٹر ٹائٹ کمپارٹمنٹس کے دروازے
بند کرادیے کہ پانی داخل ہونے کی صورت میں زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ یہ ساری کارروائی صرف
منٹ میں کی گئی۔

آئس برگ کی سخت برف نے جہاز کے زیرین حصے میں بہت بڑا شگاف ڈال دیا تھا جس
انتہائی تیزی سے پانی جہاز میں بھرنے لگا تھا۔ صرف چند منٹ میں جہاز میں 14 فٹ بلند پانی جہاز
اگلے حصوں میں بھر چکا تھا۔ تمام واٹر ٹائٹ کمپارٹمنٹس پانی سے بھر چکے تھے۔ اگلے دس منٹ میں پانی

سطح جہاز کے پیندے سے 24 فٹ بلند ہو چکی تھی۔ کیپٹن اسمتھ اور جہاز تعمیر کرنے والی کمپنی کا ڈائریکٹر جو بدقسمتی سے اس پہلے سفر میں جہاز پر سوار تھا عرشے پر کھڑا جہاز کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ لگا رہا تھا۔ ڈائریکٹر جانتا تھا کہ جہاز اب زیادہ دیر تک پانی کی سطح پر تیرتا ہوا نہیں رہے گا اگر اس کے پانچوں واٹر ٹائٹ کمپارٹمنٹس پانی سے بھر گئے۔ کیپٹن اسمتھ نے یہ جاننے کے فوراً بعد ایمرجنسی طور پر مسافروں کو اس جہاز سے لائف بوٹس میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا اور لائف بوٹس سمندر میں اتاری جانے لگیں۔ کیپٹن اس راز سے بھی آشنا تھا کہ ٹائی ٹینک پر موجود لائف بوٹس 2227 مسافروں میں سے صرف 1178 افراد کے لیے پوری ہیں مگر وہ لوگوں میں خوف وہراس پھیلانا نہیں چاہتا تھا۔ ان حالات میں 1178 افراد کی جان بچانا بھی دشوار ہو جانا تھا۔ جہاز سے راکٹ فائر کیے گئے تا کہ قریب سفر کرنے والے بحری جہاز مدد کے لیے پہنچیں۔ ایک جہاز کیلی فورنین کے کپتان نے ان راکٹوں کو بلند ہوتے ہوئے بھی دیکھا مگر اس پر نیند کا غلبہ تھا اور وہ سو گیا۔

آئس برگ سے ٹکرانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد پہلی لائف بوٹ سمندر میں اُتاری گئی اس بوٹ میں 65 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی مگر غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے اس کشتی میں 28 افراد بیٹھ سکے۔ اسی طرح دیگر لائف بوٹس کے ساتھ بھی ہوا۔ دوسرے لوگ رات کے وقت کھلے سمندر میں چھوٹی سی کشتیوں میں اترنے سے خوفزدہ تھے اس لیے جہاز پر ہی رہے۔ کچھ کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ ٹائی ٹینک ڈوب بھی سکتا ہے۔

آئس برگ سے ٹکرانے کے دو گھنٹے بعد ٹائی ٹینک ایک طرف پانی میں جھک گیا جس کی وجہ سے جہاز کے عرشے پر کھڑے ہوئے لوگ متوازن نہ رہ سکے اور گرنے لگے۔ ان مسافروں کو صحیح حالات کا علم ہوا تو ان پر خوف وہراس سوار ہو گیا۔ اس وقت آخری کشتیوں میں سے ایک سمندر میں اتاری جا رہی تھی اور اس میں مزید بیٹھنے کی گنجائش باقی نہیں تھی مگر کئی خوفزدہ مسافروں نے عرشے سے چھلانگ لگا کر اس بوٹ میں سوار ہونے کی کوشش کی جس پر اس بوٹ میں سوار آفیسروں کو لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے ہوائی فائر کرنا پڑے۔ پھر آخری بوٹ میں صرف خواتین اور بچوں کو سوار کیا گیا۔ کیپٹن اسمتھ نے اپنے عملے کا اس کی کارکردگی پر شکریہ ادا کیا اور آخری لمحات میں وہ جہاز کے ڈوبتے ہوئے حصے میں چلا گیا تا کہ جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں اتر سکے۔

یہ ایک روایت تھی کہ ڈوبتے ہوئے جہاز کے کپتان بھی اپنے جہاز کے ساتھ ہی خود کو بھی ڈبو دیتے تھے۔ پھر انہیں آخری لمحات میں بہت سے لوگوں نے جہاز سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ کچھ نے جہاز سے گرنے والی اشیاء کو تھام کر جان بچائی اور کچھ کو لائف بوٹس پر سوار کر لیا گیا۔

ٹائی ٹینک کے غرقاب ہونے کے بعد تقریباً صبح 4 بجے کارپاتھیا نامی جہاز اس مقام پر پہنچا جہاں ٹینک ڈوبا تھا۔ اس جہاز نے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے اور لائف بوٹس میں سوار 711 افراد کو بچائی اور انہیں نیو یارک لے گیا۔ جہاز پر سوار چودہ سو نوے افراد اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے والوں میں بہت سے ایسے افراد بھی شامل تھے جو ڈوبتے ہوئے جہاز سے تو اتر گئے مگر سمندر کے حرارت اور سخت سردی کا مقابلہ نہ کر سکے۔ کینیڈا کی بندرگاہ ہیلی فیکس سے کچھ بحری جہاز لاشوں کے لیے بھیجے گئے وہ صرف 190 افراد کی لاشیں ڈھونڈھ سکے جنہیں ہیلی فیکس کی ایک قبرستان میں گیا۔ ان دفنائے جانے والے لوگوں کی شناخت کہیں جا کر 2001ء میں DNA ٹیسٹ کے ذریعے گئی۔

اس حادثے کی تفتیش کے بعد اس حادثے کا ذمہ دار کیپٹن اسمتھ اور اس کے عملے کی غفلت دیا جنہوں نے آئس برگ راستے میں ہونے کے انتباہ کو موصول کرنے کے باوجود بھی لازمی احتیاط برتی۔ جس کے نتیجے میں یہ جہاز آئس برگ سے ٹکرا گیا۔ کارپاتھیا کے کیپٹن کو اس کی بے مثال اور جرات اور انسانی جانوں کو بچانے پر برطانوی اور امریکی دونوں حکام نے صراحا اور انعامات زندہ بچنے والے سات سو گیارہ افراد کی داستانیں کئی دن تک دنیا کے اخبارات کی شہ سرخیاں بنی رہیں

ٹائی ٹینک کی باقیات 1985ء میں رابرٹ بیلرڈ نامی شخص نے دریافت کیں۔ اس دریافت بعد ایک بین الاقوامی کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ چونکہ اس جہاز کی حیثیت ایک قبرستان کی ہے اور اس زیریں حصوں میں انسانی باقیات بھی محفوظ ہیں۔ اس لیے اس جہاز کے عرشے یا اندرونی حصوں سے شے نہیں نکالی جائے گی۔ اس فیصلے پر عمل درآمد کرنے کے لیے اس جہاز پر کیمرے نصب کر دیے گئے

ہالی ووڈ کے ایک شہرت یافتہ ہدایت کار جیمز کیمرون نے ٹائی ٹینک کی غرقابی پر ایک فیچر فلم 1997 میں بنائی جس نے باکس آفس پر شاندار کامیابی حاصل کی اور اس فلم نے ٹائی ٹینک کو پیش آنے والے اس حادثے کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ کر دی تھی۔

1913ء.....اوماہا،نیبرا سکا میں بگولے دار طوفان

اتوار23مارچ1913ء کو ایسٹر کی شام کو ایک بگولے دار طوفانTornado Storm امریکی ریاست نیبراسکا کے شہر اوماہاOmahaسے ٹکرایا۔ اس طوفان کا بگولہ تقریباً آدھا میل چوڑائی کا حامل تھا اور چالیس میل کے دائرے میں پھیلا ہوا تھا۔ موسم کی خرابی کے اعتبار سے یہ دن نیبراسکا کی تاریخ میں سیاہ ترین دن تھا۔ بگولے دار طوفان سارپیSarpy نامی کاؤنٹی سے اٹھا اور شمال مشرقی سمت میں راستہ بناتا ہوا رالسٹن Ralston سے گزرا اور بڑھتا چلا گیا۔ رالسٹن مین اس طوفان کے ہاتھوں سات افراد ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد یہ گھومتا ہوا بگولہ اوماہا سے گزرا اور 96افراد ہلاک اور چھ گھروں کو تباہ کرتا چلا گیا اور 1100 مزید مکانات کو شدید نقصان پہنچا۔ یہ طوفان شہر میں لٹل پیپلن کھاڑی Little Paplion Carees کے راستے سے داخل ہوا۔ اس کے بعد مسوری پیسفک ریلوے روڈ کے ساتھ ساتھ شہر کے مغربی گوشے کی طرف بڑھا اور راستے میں آنے والی ہر چیز کا صفایا کرتا چلا گیا اس سمت میں لگی ہوئی بہت سی مزدوروں کی جھگیاں تباہ ہوگئیں۔ یہ طوفان اتنا شدید تھا کہ فولاد سے بنی ہوئی ریل کاروں کو لکڑی کے وہ ٹکڑے چیرتے ہوئے چلے گئے جو اس طوفان نے مختلف گھروں کو تباہ کرکے بگولے میں اٹھا لیے تھے۔

1913ء کے ایسٹر کے اس اتوار کو اوماہا میں مطلع ابر آلود تھا ہر طرف آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش ہونے کا قوی امکان تھا مگر اس دن بارش نہ ہوئی۔ دوپہر تک ان بادلوں میں سورج جھانکنے لگا مگر دوپہر کے بعد آسمان ایک بار پھر سیاہ پڑ گیا اس بار آسمان کا سیاہ پڑنا معربی نیبراسکا کی سمت سے اٹھنے والے ایک طوفان کی وجہ سے تھا۔ شام5:45 پر اس بگولے دار طوفان نے کریمر کے مقام پر زمین کو چھوا اور6بجے تک یہ طوفان اوماہا کے مضافات تک پہنچ چکا تھا۔ پھر جب قیف نما بادل شہر کے ڈیوی ایونیوDevey Avenue پہنچا تو یہ شہر کے پانچ بلاکوں جتنا وسیع ہوچکا تھا۔ فرن بام ہل کے علاقہ میں بڑے بڑے مکانات بھی اس طوفان کی شدت کا سامنا نہ کرسکے اور ہوا کی تندی نے انہیں تنکوں کی طرح بکھیر دیا تھا گھر ایسی حالت میں پائے گئے کہ انہیں درمیان میں سے طوفان نے قطعہ کرکے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ان مکانات کے ستون اور پائپ درمیان میں معلق رہ گئے۔ شہر کی 24thلیک سٹریٹ میں لوگوں کی بڑی تعداد ٹائمنڈ موونگ پکچر تھیٹر میں فلم بینی میں مصروف تھی ،ٹارنیڈو نے تھیٹر کی عمارت کو زمین بوس کردیا

اور فلم بینوں کی بڑی تعداد جاں بحق ہوگئی۔

اس علاقے میں اینٹوں سے تعمیر کردہ تمام عمارتوں کا یہی حشر ہوا۔ شہر کے اسی علاقے میں سب سے زیادہ اموات واقع ہوئیں۔ 24th سٹریت میں یہ طوفان ایک چلتی ہوئی سٹریٹ کار سے ٹکرایا تو سٹریٹ کار آپریٹر کی مہارت کام آئی اور تمام مسافر زندہ وسلامت بچ گئے مگر سٹریٹ کار کی یہ حالت ہوئی کہ اسے بعد ازاں دیکھنے والوں نے ''موت کی سٹریٹ کار'' کا نام دیا کہ انہیں یقین تھا کہ اس کار کے تمام مسافر مارے گئے ہوں گے کیونکہ اس کار کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں بچی تھی۔

1917ء.....ہیلی فیکس، کینیڈا کی بندرگاہ میں دھماکہ

انسان کے ہاتھوں ہونے والے 1945ء میں ہیروشیما کے ایٹمی دھماکے سے پہلے انسان کے ہاتھوں ہونے والا سب سے بڑا اور دنیا کا سب سے شدید دھماکہ فرانسیسی جنگی بحری جہاز ''ماؤنٹ بلانک'' پر ہوا تھا جو اس وقت کینیڈا کے شہر ہیلی فیکس کی بندرگاہ میں داخل ہو رہا تھا اور اس بندرگاہ سے یورپ جانے والے جہاز ایمو سے ٹکرا گیا تھا۔ جمعرات 6 دسمبر 1917ء کو ہیلی فیکس کی چھ میل طویل بندرگاہ میں ماؤنٹ بلانک نامی فرانسیسی جنگی بحری جہاز داخل ہوا۔ یہ جہاز نیویارک کی بندرگاہ سے انتہائی دھماکہ خیز مواد جس میں 35 ٹن آتش گیر سیال مادہ سیرین اور 2 اور 3 سو ٹن مرطوب اور خشک پکرک ایسڈ (جو بموں کو تیار کرنے میں کام آتا ہے) 200 ٹن ٹی این ٹی، دس کاٹن اور 300 بم بھی شامل تھے لے کر برطانوی جنگی بحری جہاز فائر کو پہنچانے کے لیے ہیلی فیکس آیا تھا۔ منصوبہ بندی یہ تھی کہ ماؤنٹ بلانک اور فلائر ہیلی فیکس سے یورپ کا رخ کریں گے جہاں فرانسیسی فوجیوں کو اس دھماکہ خیز مواد کی سخت ضرورت تھی۔ ہیلی فیکس کی بندرگاہ کا چینل ایک میل چوڑا تھا۔ اس چینل میں سفر کرتے ہوئے ماؤنٹ بلانک نے نصف میل تک سفر کیا۔ عین اسی وقت بلجیم کا ایک امدادی جہاز ایمو IMO اسی چینل کے راستے بندرگاہ سے یورپ جانے کے لیے نکل رہا تھا چونکہ بندرگاہ پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس لیے ماؤنٹ بلانک کے کیپٹن کو ایمو اس وقت نظر آیا جب وہ اس کے کافی نزدیک پہنچ چکا تھا۔ ایمو کا رخ سیدھا ماؤنٹ بلانک کی طرف تھا۔ خطرہ تھا کہ گولہ بارود سے لدے ہوئے اس جہاز سے ٹکرا نہ جائے۔ اس لیے ماؤنٹ بلانک کے کیپٹن نے ایمو کے کیپٹن کو خبردار کرنے کے لیے ہارن بجایا جس کے جواب میں ایمو کے کیپٹن نے اشارہ دیا کہ وہ بائیں طرف مڑنا چاہتا ہے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ ماؤنٹ بلانک کی لین میں رہنا چاہتا تھا۔ ماؤنٹ بلانک کے کیپٹن نے سمجھا کہ شاید ایمو کے کیپٹن نے غلطی سے یہ سگنل دیا ہے مگر ایسا نہیں تھا بلکہ ایمو کا کیپٹن شاید جہاز سمیت خودکشی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس لیے ایمو ماؤنٹ بلانک کی طرف بڑھتا ہی آیا۔ ماؤنٹ بلانک کے کیپٹن نے اس کی تدبیر کو ناکام بنا دیا وہ شاید اس دھماکہ خیز مواد سے لدے ہوئے جہاز سے بالضرور ٹکرانا چاہتا تھا۔ ماؤنٹ بلانک کے کپتان نے جب اس تصادم کو ناگزیر دیکھا تو آہستگی سے اپنے جہاز کا رُخ تبدیل کرنے کی ایک اور کوشش کی تاکہ اگر دونوں جہازوں میں یہ تصادم ہو بھی جائے تو ایمو اس

کے اس حصے سے نہ ٹکرائے جس میں دھماکہ خیز مواد لدا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی یہ تدبیر کامیاب رہی اور وہ
ٹی این ٹی والے حصے سے تو نہ ٹکرایا مگر وہ اس سے زیادہ دھماکہ خیز مواد بینزین اور پکرک ایسڈ والے حصے
سے ٹکرا گیا جس سے بینزین کے بیرل ٹوٹ کر بینزین پکرک ایسڈ سے مل گئی ۔ جس سے جہاز کے
حصے میں آگ لگ گئی۔ عملے نے اپنی سی کوشش کی کہ اس آگ پر قابو پالیا جائے مگر آتش گیر اور دھماکہ
خیز مواد میں لگی اس آگ پر قابو نہ پایا جاسکا اور کیپٹن نے بالآخر عملے کو جہاز چھوڑنے کا حکم دیا۔ عملے کے
ارکان لائف بوٹس میں بیٹھ کر ساحل کی طرف روانہ ہوگئے ۔ اس دوران ماؤنٹ بلانک چلتا ہوا چینل میں
ادھر ادھر ڈولتا رہا پھر لکڑی کے پشتے سے ٹکرا گیا۔ ایمو اس ٹکر کے بعد شمالی ساحل پر واقع شہر ڈارماؤتھ کی
طرف بڑھتا رہا۔ ہیلی فیکس فائر ڈیپارٹمنٹ کو اس کی خبر دی گئی تو آگ بجھانے والا عملہ فوراً ماؤنٹ بلانک
کے نزدیک پہنچ گیا۔ مگر آگ ،آگ کے شور کو سن کر ہیلی فیکس کے بہت سے شہری بندرگاہ میں امڈ پڑے
اور ماؤنٹ بلانک کو جلتے ہوئے دیکھنے لگے۔ یہ ایک خطرناک غلطی تھی تاہم ہجوم پر قابو نہ پایا جاسکتا۔

ایمو سے ٹکرانے کے صرف 20 منٹ بعد 9:45 پر صبح کے وقت دھماکہ ہوگیا۔ یہ دھماکہ اتنا شدید تھا
کہ قریبی علاقے رچمنڈ میں رہنے والا ہر شخص ہلاک ہوگیا۔ 1600 سے زائد لوگ آناً فاناً موت کے
ہمکنار ہوگئے۔ 325 ایکٹر میں پھیلا ہوا رہائشی علاقہ اس طرح نابود ہوگیا جیسے یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔
اُڑتے ہوئے شیشے کے کچرے نے تقریباً ایک ہزار سے زائد افراد کو اندھا کردیا۔ ہزاروں مزید افراد
شدید زخمی ہوگئے اور ہیلی فیکس کے قریبی علاقوں میں ہر طرف آگ بھڑک اٹھی۔ ماؤنٹ بلانک پر نصب
ایک توپ جہاز سے اڑ کر تین میل دور جا گری۔ ہیلی فیکس کی بندرگاہ میں مزید جتنے جہاز کھڑے تھے ان
کا ایک تہائی عملہ ہلاک ہوگیا مگر خود ماؤنٹ بلانک کا عملہ سارا بچ گیا اس عملے میں صرف ایک شخص ہلاک
ہوا۔ اس دھماکے کی آواز ساٹھ میل دور تک سنی گئی اور اتنے دور دراز کے علاقوں کی بلڈنگوں کی کھڑکیوں
کے شیشے ٹوٹ گئے ۔ دھماکے کے فوراً بعد امدادی کام شروع ہوگیا اور بڑی دنیا سے امدادی سامان ہیلی
فیکس بھیجا گیا۔

1918ء.....انفلوایزا۔ایک عالمگیر قاتل وباء

انفلوایزا ایک بہت ہی تیزی سے پھیلنے والا وبائی مرض ہے اس وبائی مرض نے جنگ عظیم اول کے آخری سال میں خود جنگ عظیم اول سے زائد افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور یہ وبا پوری انسانی تاریخ کی خطرناک ترین وبا ثابت ہوئی تھی۔ اس وبا نے ازمنہ وسطی کے یورپ میں پھیلنے والی وباء ''سیاہ موت'' سے بھی زائد افراد کو ہلاک کردیا تھا۔

1918ء میں چھ ماہ سے بھی کم مدت میں چھ کروڑ سے زائد افراد اس وباء کے پھیلنے سے ہلاک ہوگئے تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں اس وباء کے پھیلنے سے ہلاک ہوگئے تھے۔اتنی بڑی تعداد میں مرنے والے انسانوں میں زیادہ نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔بعض مورخین کا خیال ہے کہ مرنے والوں کی تعداد 6 کروڑ سے بھی زائد تھی یہ صرف سرکاری ریکارڈ ہے۔اس مرض کے پھیلنے کی رفتار بڑی تیز تھی۔ اس مرض کی علامت شدید کھانسی جس کے ساتھ ہی مریض کے جسم سے مختلف مقامات سے خون جاری ہوجاتا تھا۔جلد نیلی پڑ جاتی تھی جو مریض کے پھیپھڑوں میں آکسیجن کی کمی سے نمودار ہوتی تھی۔ اس کے چوبیس گھنٹے کے بعد عموماً مریض کی موت واقع ہوجاتی تھی۔

کئی مورخین کا خیال ہے کہ یہ وباء پہلے پہل انگلستان میں 1485ء میں The Sweat کے نام سے پھیلی تھی جس کی علامتیں بخار، شدید پیاس، سر درد اور جوڑوں کے درد کے ساتھ ساتھ کبھی مریض کے پیٹ میں بھی درد ہونے لگتا اور وہ قے کرنے لگتا تھا جس کے چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کی موت واقع ہوجاتی تھی۔ یا پھر مرض شدت اختیار کر لیتا اور مریض کئی دن کے لیے بیمار پڑا رہتا تھا۔ سولہویں صدی میں بھی کئی مرتبہ ایسی وبائیں پھیلیں تھیں جن میں سے ایک میں ملکہ این بولین بھی جاں بحق ہوگئی تھی۔

مگر وبائی مرض کے طور پر یہ پہلی مرتبہ 1580ء میں نمودار ہوا تھا جب اس کے وائرس نے ایشیا اور افریقہ میں سے سفر کرتے ہوئے یورپ پہنچ کر اٹلی، جرمنی اور اسپین میں بہت سے لوگوں کو ہلاک کردیا۔اسی زمانے میں اس مرض کا نام انفلوایزا رکھا گیا۔ یہ اطالوی لفظ Enfluenc سے مشتق ہے۔ اس زمانے کے اطالوی اطباء کے نزدیک یہ بیماری ستاروں کے بد اثرات کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی۔ سترھویں صدی میں یہ کئی بار یورپ میں پھیلی اور پھر نئی دنیا امریکہ تک جا پہنچی۔ 7 دسمبر 1889ء میں یہ روس کے

دارالحکومت سینٹ پیٹر برگ میں پھیلی۔ اگلے سال مارچ تک اس بیماری نے یورپ میں پھیل کر 250000 لوگوں کی جان لے لی، جبکہ دنیا بھر میں اس وباء کے پھیلنے سے 750000 لوگوں کی جان گئی۔

مگر اس وباء کا سب سے بڑا حملہ دنیا پر اس وقت ہوا جب یورپ میں پہلی عالمگیر جنگ لڑی جارہی تھی جتنے لوگ 1914ء سے 1918ء تک اس عالمگیر جنگ میں مارے گئے اس سے کہیں زیادہ صرف چھ مہینوں میں اس وباء کے ہاتھوں ہلاک ہوگئے تھے۔ فروری 1918ء میں 3 دن کا بخار نامی بیماری نے اسپین میں 1600000 لوگ ہلاک کردیے۔ ان مرنے والوں میں خود اسپین کا بادشاہ الفانسو سہ ازدہم XIII بھی شامل تھا۔ اس وباء نے میڈرڈ کی ایک تہائی آبادی کو تہس نہس کرکے رکھ دیا۔ اس بیماری کے شکار لوگوں کو پہلے 40 درجہ کا بخار ہوتا پھر آنکھوں کے پیچھے درد محسوس کرتے، پھر کانوں اور دوسرے اعضاء میں آخر مریض کا ریشہ ریشہ درد کرنے لگتا۔ اسپین میں نمودار ہونے کی وجہ سے اس بیماری کو ''ہسپانوی فلو'' Spinish Flue کا نام دیا گیا۔ اگرچہ کئی ایک محققوں کے نزدیک یہ بیماری پہلے جنگ عظیم اول کے محاذوں پر لڑتے ہوئے فوجیوں کو خصوصاً امریکی کیمپ میں لاحق ہوئی تھی اور وہاں سے براعظم یورپ میں پھیلی تھی۔ مگر اس وباء کے پھیلنے کی خبر دبا دی گئی تھی۔ کیونکہ یہ دشمن کے حق میں مفید تھی۔ تاہم اسپین جو اس جنگ میں ایک غیر وابستہ ملک تھا وہاں اس وبائی مرض کے پھیلنے کی خبر کو نہیں دبایا گیا۔ عین موسم بہار 1918ء میں فلو ایک وبائی مرض کے طور پر امریکی ریاست کنساس میں پھیلا اور اس نے 46 افراد کی جان لے لی جبکہ ہزاروں دیگر افراد شدید بیماری میں مبتلا ہوگئے پھر یہ وباء اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنی تیزی سے پھیلی کہ اس کو راز رکھنا پڑا کہ کہیں دنیا میں دہشت نہ پھیل جائے۔ مئی کے پہلے 12 دنوں میں برطانیہ کے گرینڈ بحری بیڑے پر 10 ہزار افراد اس بیماری میں اتنے شدید طور پر مبتلا ہوگئے کہ انہیں سمندر پر نہیں بھیجا جاسکا۔

اخبار ''دی ٹائمز'' نے لکھا کہ جو لوگ صبح دس بجے اپنے آپ کو بالکل صحت مند سمجھ کر اپنے اپنے کام پر گئے وہ دوپہر تک بستر پر دراز ہوگئے۔ اس وباء کے پھیلنے کا سبب جو بھی تھا مگر جلد ہی برطانیہ، فرانس، جرمنی، اطالیہ، مصر، آسٹریا، اور ناروے اور پھر ہندوستان، چین اور بہت سے جنوبی امریکی ممالک اس کی لپیٹ میں آگئے۔ یورپ میں مغربی محاذ پر جو فوجیں لڑ رہی تھیں وہ اس مہلک مرض میں مبتلا ہوگئیں۔ امریکہ جنرل پرشنگ نے اتحادیوں کو خبردار کیا کہ امریکہ میں فلو کے پھیلنے کی وجہ سے مزید کمک یورپ کو نہیں بھیجی جائے گی۔

موسم بہار میں پھیلنے والا یہ مرض شروع میں زیادہ مہلک نہیں تھا اور اس کی وجہ سے معدودے چند

اموات واقع ہوئیں مگر موسم خزاں تک اس کی ہلاکت خیزی بہت بڑھ چکی تھی اور اس میں مبتلا افراد اکثر مہلک نمونیا میں مبتلا ہو جاتے اور پھر تیزی سے مر جانے لگے۔

ایک یورپی طبیب نے دریافت کیا کہ اس مرض میں مبتلا ہونے والے مریض سانس لینے میں دشواری پیدا ہو جانے کی وجہ سے دم گھٹنے سے مر جاتے تھے۔ ایک اور طبیب نے بتایا کہ اس بیماری میں مبتلا بدقسمت افراد کی سانس کی نالیوں میں خون جیسا ایک ناصاف مادہ پھنس جاتا ہے اور اکثر مریضوں کے دم توڑتے وقت ان کی ناک سے بہنے لگتا ہے۔

یورپی دنیا میں ہلاکتیں پھیلانے والی یہ وباء 1918ء کے موسم خزاں میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی 18 ریاستوں میں پھیل چکی تھی۔ یہاں تک کہ کئی امریکی شہروں میں حکومت کی طرف سے اشتہار آویزاں کیے گئے کہ کھانسنا اور سر عام چھینکنا ایک غیر قانونی عمل ہے اور سر عام ایسا کرنے والے کو 500 دالر جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ ایک امریکی ڈاکٹر نوبل بی بیرنز نے لکھا ہے کہ چھینکنے اور کھانسنے سے انفلوانیزا پھیلتا ہے اس لیے کھانسنے اور چھینکنے والے کو سزا لازم طور پر دینا چاہئے یا پھر انہیں اس وقت تک ماسک استعمال کرنا چاہئے جب تک کہ وہ صحت یاب نہیں ہو جاتے۔

ہزاروں لوگ اپنے گھروں بلکہ شہروں کی گلیوں میں اس نہ نظر آنے والے وائرس سے ہلاک ہو گئے۔ میدان جنگ میں سامنے نظر آنے والے دشمن کا مقابلہ کرنا آسان تھا مگر اس غیر مرئی دشمن کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ اس لیے امریکی محکمہ صحت اور شہری دفاع کے لوگ مایوس ہو گئے۔ اس لیے شہروں میں ایسے اشتہار بھی لگائے گئے جن پر لکھا گیا تھا کہ ''یہ مرض انتہائی سرعت سے پھیلتا ہے.....اس سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے'' ایسے اشتہاروں میں حفاظتی ماسک پہننے کا طریقہ بھی بتایا جاتا تھا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پھیلنے والی یہ مہلک وباء دو لہروں کی شکل میں پھیلی تھی۔ ابتدا میں ایک لہر 1918ء کے موسم بہار میں آئی جبکہ دوسری اور شدید لہر 1918ء کے موسم گرما میں اس بیماری کے وائرس میں تبدیلی کے بعد موسم خزاں میں پھیلی۔

جیسا کہ پہلے ذکر آیا کہ یہ مرض سب سے پہلے اسپین میں ایک سرحدی قصبے سان سباشیان San Sabatian میں پھیلا تھا۔ اس مرض کا باعث ایک نہ نظر آنے والا وائرس تھا یہ ہسپانوی قصبہ چونکہ فرانس سے صرف 20 میل کے فاصلے پر تھا اس لیے اس راستے سے یہ وباء تیزی سے پورے براعظم یورپ میں پھیل گئی اور پھر اوقیانوس عبور کر کے براعظم امریکہ میں پہنچ گئی۔ ستمبر 1918ء میں امریکہ میں اس بیماری سے 387 افراد روزانہ کی شرح سے مر رہے تھے۔ ایک ماہ میں مجموعی ہلاکتوں کی تعداد 12000 تک پہنچی۔

اکتوبر میں اس وباء نے مزید شدت اختیار کی اور امریکہ میں روزانہ مرنے والوں کی تعداد سرکاری

طور پر 6300 ہوگئی۔ یعنی ایک ماہ میں تقریباً دو لاکھ افراد ہلاک ہونے لگے۔ 1918ء میں امریکہ کی آبادی ایک کروڑ سے کچھ ہی زیادہ تھی مگر اس سال ہونے والی اموات کی شرح 2000ء میں 28 کروڑ آبادی کے حامل امریکہ کی شرح اموات کے برابر تھی۔ امریکہ کے دور دراز کے گوشوں تک انفلوائنزا کا پھیل جانا بھی حیران کن تھا۔ امریکہ کے دور افتادہ قصبوں میں اس وباء نے شدید جانی نقصان پہنچایا۔ تاہم آج تک اس سوال کا جواب تسلی بخش طور پر نہیں دیا جاسکا کہ انفلوائنزا کا وائرس اتنی دور تک کیسے پہنچا تھا۔

انفلوائنزا کی یہ عالمگیر ہلاکت خیز وباء 1920ء کے شروع میں ختم ہوئی اور اس کا وائرس بھی غائب ہوگیا۔ بلکہ آج تک پھر دوبارہ نمودار نہ ہوا تاہم انفلوایئزا کی بیماری آج بھی موجود ہے مگر اب یہ قابل علاج بیماریوں میں شمار کی جاتی ہے۔ مگر وائرس کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے خطرہ ہے کہ ہسپانوی انفلوایئزا کے وائرس جیسا کوئی اور وائرس نمودار نہ ہوجائے جیسا کہ ماضی قریب میں برڈ فلو کی شکل میں نمودار ہوچکا ہے۔

1923ء..... زلزلے کے ہاتھوں ٹوکیوں کی تباہی

یکم ستمبر 1923 کو جاپان کے دار الحکومت ٹوکیو میں ایک شدید زلزلہ آیا جو ریکٹر اسکیل پر 7.8 ...ہ کا زلزلہ تھا جس کی قوت ایک میگاٹن کے ایٹمی دھماکے کے برابر تھی۔ اس زلزلہ کا مرکز ٹوکیو کے جنوب ...ں واقع تھا۔ اس زمانے میں ٹوکیو کی آبادی 46 لاکھ تھی اور وہ دنیا کا پانچواں گنجان آباد شہر تھا۔ ٹوکیو کے ...ھ بھی ویسا ہی پیش آیا جیسا 17 سال پہلے امریکی شہر سان فرانسسکو کے ساتھ ہوا تھا یعنی زلزلے کے ...ٹوکیو کو بھی آتش زدگی کے ہاتھوں شدید نقصان پہنچا۔ ٹوکیو کے باورچی خانوں میں زلزلے کے دوران ...ے کی کھی انگیٹھیوں میں کھانا پکایا جا رہا تھا۔ یہ دہکتے ہوئے کوئلے انگیٹھیوں سے نکل کر باورچی خانوں ...ے چوبی فرش پر گرے اور شہر میں آگ بھڑک اٹھی جب شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تو پانی کے ...پ زلزلے کی وجہ سے پھٹ جانے کی وجہ سے شہر میں آگ بجھانے کے لیے پانی میسر نہ آسکا یوں ...روں مکانوں میں یکبارگی آگ بھڑک اٹھی اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ٹوکیو میں آگ کا طوفان اُمڈ آیا ...سارا شہر جہنم زار بن گیا۔ ٹوکیو کی گلیاں انتہائی تنگ تھیں اس وجہ سے اس آگ کو ایک گلی سے دوسری گلی ...پھیلنے میں زیادہ دیر نہ لگی ٹوکیو کے اکثر مکانات لکڑی سے تعمیر کیے گئے تھے اس لیے وہ سب آگ ...لیے عمدہ ایندھن ثابت ہوئے۔ جب آخر کار یہ آگ بجھی تو ٹوکیو اور اس کے آس پاس کے علاقوں ...150000 انسان سے زائد لقمہ اجل بن چکے تھے اور تقریباً 20 لاکھ افراد بے گھر ہو چکے تھے۔ چین ...طرح جاپان بھی زلزلوں کی سرزمین ہے اور ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں زمین کی دو مختلف ارضیاتی ...ں Tectonic plates آپس میں ملتی ہیں۔ یہ بحیرہ فلپائن اور شمالی امریکہ کی ارضیاتی پرتیں ہیں۔ ...170ء کے آخری دنوں میں جب ٹوکیو ایڈو Edo کہلاتا تھا، ایک شدید زلزلہ آیا تھا جس میں اس کے ...م چوبی مکانات زمین بوس ہوگئے تھے۔ اور ان تباہ شدہ مکانات کے ملبے میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ...ں کے بعد ایک خوفناک سیلاب نے ٹوکیو کے بچے کھچے شہریوں کو آگھیرا تھا۔ اس زلزلے، آگ اور ...لاب سے بھی مورخین کے مطابق 150000 انسان ہلاک ہوگئے تھے یعنی ماضی میں بھی تباہی بڑے ...لنے پر پھیلی تھی۔

ہفتہ یکم ستمبر 1923 کو دوپہر سے ذرا پہلے تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور ٹوکیو کے در و بام ایک

بار پھر ہلنے لگے۔ 50 میل دور خلیج سیگا می Sagami کی تہہ میں زمین کھسکنے لگی۔ زلزلے کے
تقریباً 5 منٹ تک جاری رہے۔ اس کے بعد مزید دو اور جھٹکے آئے۔ ٹوکیو کی گلیوں میں گڑھے
پڑ گئے کہ انسان بلکہ ٹرامیں تک ان گڑھوں میں دھنس گئیں۔ بجلی کے تار بری طرح ٹوٹ کر
آس پاس سے گزرنے والے بدقسمت افراد کو ہلاک کرنے لگے۔ بجلی کے تاروں کے ٹوٹ کر
گرنے سے اس ٹرام میں سفر کرنے والے تمام مسافر ہلاک ہوگئے۔ ٹرام کے ان مسافروں میں
خاتون بھی تھی جس نے مرنے کے بعد بھی اپنے ہاتھ میں سکہ تھاما ہوا تھا جیسے وہ ٹرام کا کرایہ ادا
ہو۔

زلزلے کے ابتدائی جھٹکوں نے ٹوکیو کی 75 فی صد عمارات کو تباہ کر دیا۔ اسی طرح ایک اور نزدیکی
یوکو ہاما کی 20 فی صد عمارات بھی تباہ ہوگئیں۔ زلزلے کے فوراً بعد جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھی اور جلد ہی
آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اہل جاپان میں سے بہت سے لوگوں نے سوچا کہ شاید آج ان پر
نے جہنم کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اس آگ سے بچنے کے لیے 75 ہزار سے زائد لوگ دریا
میڈا کے کنارے واقع ایک پارک میں جمع ہوگئے کہ شاید وہ اس کھلی فضا میں آگ سے محفوظ رہیں
انہوں نے آگ کی شدت کا اندازہ کم لگایا تھا۔ اس آگ نے جلد ہی انہیں اس پارک میں بھی آگھیرا
آگ کے اس طوفان نے پارک میں موجود ہر شخص کو بھسم کر ڈالا ٹوکیو اور یوکو ہاما دو دن تک آگ کے
دریا میں جلتے رہے آگ نے شہر میں موجود ہر نظام کو تباہ کر ڈالا، ذرائع مواصلات آب رسانی کا
خوراک کے گودام اور بجلی کی لائنیں سب کچھ جل کر خاکستر ہوگیا۔

اس زلزلے سے جاپان کے اس علاقے میں جو ارضیاتی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ حیران کن تھیں
ساگامی میں سمندر کی تہہ 300 سے 600 فٹ تک بیٹھ گئی جبکہ خلیج کے سروں پر سمندر کی گہرائی کم ہوگئی
سمندر کی تہہ 75 فٹ تک بلند ہوگئی۔

زلزلے اور آتش زدگی کے بعد جب امدادی جماعتیں میدان میں اتریں تو انہیں ہر طرف ادھ
انسانی لاشوں کے ڈھیروں کا سامنا کرنا پڑا۔ زندہ بچ جانے والے انتہائی بے خوراکی کے عالم میں
آسمان کے نیچے پڑے تھے انہیں امدادی کیمپوں میں پہنچایا گیا۔ امدادی اسٹیشنوں میں خوراک
ذخیرے کو فوج نے اپنی تلواریں چوروں اور لٹیروں کے خلاف بے نیام کر کے بچایا اور تباہی کے بعد ہونے
والے جرائم پر بھی قابو پایا گیا۔

1925.....ٹرائی اسٹیٹ ٹورنیڈو

امریکہ میں آنیوالے مہلک ترین طوفانوں میں سے ایک سب سے بڑا اور طاقتور ترین بگولے دار طوفان ٹرائی اسٹیٹ ٹورنیڈو کو تسلیم کیا جاتا ہے یہ طوفان 18 مارچ 1925ء کو امریکی ریاست مسوری کے شہر پلنگٹن میں آیا تھا۔ اس طوفان کی رفتار 70 میل فی گھنٹہ تھی۔ اس طوفان سے ہونے والی ہلاکتیں 689 تھیں اور اس نے شہر کا تقریباً 90فی صد حصہ تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بگولے کا محیط تقریباً ایک میل تھا اور اس نے اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو زمین بوس کر دیا۔ صرف ریاست مسوری میں کم از کم گیارہ افراد اس طوفان کی لپیٹ میں آکر ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد یہ طوفان دریائے مسسپی عبور کر کے ریاست الی نوائے میں داخل ہوگیا اور اس نے گورہام Gorham کے قصبے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اور اس قصبے میں 34افراد ہلاک ہوگئے۔ 73 میل فی گھنٹہ کی رفتار پر سفر کرتا ہوا یہ طوفان اس کے بعد مرفی سوبرو Murphy sobro میں داخل ہوا اور اس نے وہاں 234افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ امریکہ کی تاریخ میں کسی طوفان میں گھر کر مرنے والے افراد کی کسی ایک شہر میں سب سے بڑی تعداد تھی۔ اس قصبے میں 1200 مکانات منہدم ہو جانے کے بعد اس قصبے کی تقریباً آدھی آبادی بے گھر ہوگئی۔ ڈی سوٹو Desoto میں شہر کے تمام بلاک اس طوفان سے متاثر ہوئے اور اس شہر کا 30فیصد حصہ تباہ ہوگیا۔ اس قصبے میں 100افراد ہلاک ہوگئے۔ اس شہر کے ایک بینک کے منیجر نے ایک تہہ خانے میں پناہ لی جس کے بعد پوری عمارت منہدم ہو جانے کے باوجود وہ بچ گیا، جبکہ ایک سکول کی عمارت گر جانے کی وجہ 35 بچے ہلاک ہوگئے تھے۔ مندرجہ بالا دونوں قصبوں میں طوفان کے گزرنے کے بعد آگ جگہ جگہ بھڑک اٹھی جس سے مزید جانی و مالی نقصان پہنچ گیا۔ ویسٹ فرینکفرٹ کا قصبہ مکمل طور پر بکھر کر رہ گیا۔ جبکہ ہورٹ بش صفحہ ہستی سے معدوم ہوگیا۔ دیہاتی علاقوں میں بھی بڑی تباہی مچی۔ جنوبی گرین فیلڈ کے علاقے میں ایک مسافروں سے بھری ہوئی ٹرین الٹ گئی اور بہت سے مسافر مارے گئے۔ الی نوائے میں تقریباً 613افراد جاں بحق ہوگئے جو کسی امریکی ریاست میں طوفان کے ہاتھوں پہنچنے والا سب سے شدید جانی نقصان تھا۔ ویسٹ فرینکفرٹ میں ایک کوئلے کی کان بھی تباہ ہوگئی۔ پھر اس طوفان ریاست انڈیانا میں گرفن کے قصبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ گرفن کے کے مضافات

میں اس طوفان نے وسیع پیمانے پر تباہی مچائی اور 85 فارموں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ تاہم انڈیانا
کی سمت میں بڑھتے ہوئے اس طوفان کا زور ٹوٹ گیا اور اس شہر میں کسی قسم کا کوئی جانی و مالی نقصان
واقع نہیں ہوا۔ اس طوفان کے راستے میں آنے والے تمام شہروں اور قصبوں میں رسل و رسائل مکمل طور
تباہ ہوگئی، جگہ جگہ پانی کی پائپ لائنیں پھٹ گئیں اور بجلی کی ترسیل منقطع ہوگئی امدادی کاروائیاں تاخیر
شروع ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ جو ملبے میں دب گئے تھے وہ دم توڑ گئے۔ طوفان گزرنے کے بعد
اکثر مقامات پر آگ بھڑک اٹھی جس پر مشکل سے قابو پایا گیا۔

چونکہ 1925 میں موسمیاتی پیشین گوئیاں اتنی موثر نہیں تھیں جتنی آج کل ہیں۔ اس لیے طوفان کے
پیٹ میں آنے والے علاقے کے باشندوں کو طوفان کی آمد سے پہلے کوئی اطلاع اس طوفان کے بارے
میں نہیں مل سکی تھی اس لیے احتیاطی تدابیر اختیار نہیں کی جاسکیں تھیں اس وجہ سے نقصانات پر قابو نہیں
جاسکا تھا۔ اس لیے میں کمیونی کیشن کا مسئلہ کھڑا ہوگیا تھا اور اسی وجہ سے امدادی کاروائیاں تاخیر سے
شروع ہوئی تھیں اور بعض مقامات تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ بہت سی انسانی لاشوں کے لواحقین کو اطلاع
مل سکی اور بہت سے مرنے والوں کے عزیز و اقارب بھی ان کے ساتھ ہی ہلاک ہوگئے تھے سکول کی
عمارت گر جانے کی وجہ سے مرنے والے بچوں کی لاشیں کسی نے وصول نہیں کیں جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ
ان بچوں کے والدین بھی ان کے ساتھ اس طوفان کی نذر ہوگئے تھے۔

ٹرائی اسٹیٹ ٹارینڈو نے صرف 40 منٹ کے اندر اندر امریکہ کی تین ریاستوں میں تباہی مچادی تھی
اور ناقابل تلافی جانی و مالی نقصان پہنچایا تھا۔ اس طوفان سے پہنچنے والے مالی نقصانات کا اندازہ تقریباً
50 کروڑ ڈالر بتایا گیا تھا جبکہ 689 اموات واقع ہوئیں تھیں۔

1926.....فلوریڈا ہری کین

18 ستمبر 1926ء کی رات فورٹ لاوڈر ڈیل Fortlauderdale میامی اور دیگر کئی نزدیکی ساحلی مقامات کو ایک 60 میل چوڑے ہری کین نے گھیر لیا۔ اس کے ساتھ 150 میل فی گھنٹہ چلنے والی طوفانی ہوائیں بھی سنسناتی ہوئیں چلنے لگیں۔ ساحل پر تعمیر کئے گئے بہت سے ہوٹلوں کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے اور ان عمارتوں میں 4 فٹ گہرا پانی چڑھ آیا۔ عمارتوں کا حال اتنا برا تھا کہ ایک بلڈنگ انسپکٹر نے ایک عمارت کی دیواریں منہدم ہو جانے کے خطرے کی وجہ سے اس کو خالی کرنے اور اس کے مکینوں کو دوسری محفوظ عمارتوں میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا۔

امریکی محکمہ موسمیات کی میامی شاخ نے ایک خصوصی بلیٹن میں بتایا کہ گذشتہ تاریخ میں کسی طوفان نے پراپرٹی کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا اس بدترین طوفان نے پہنچایا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 325 سے 800 افراد ہلاک ہوگئے۔

17 ستمبر کی علی الصبح امریکی محکمہ موسمیات کے حکام نے ایک پریس ریلیز جاری کیا کہ ایک شدید ترین طوفان (ہری کین فلوریڈا کی سمت میں بڑھ رہا ہے امریکی اخبارات نے محکمہ موسمیات کی اس پیشین گوئی کو اپنے صفحات میں خصوصی جگہ دی مگر قارئین نے محکمہ موسمیات کی دیگر پیشین گوئیوں کی طرح اس پر بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی اور اس کو سیریس طور پر نہیں لیا۔ اسی شام محکمہ موسمیات نے دوبارہ ایک شدید ہری کین کی آمد سے خبردار کیا مگر لوگوں نے اس انتباہ کو بھی سنجیدگی سے قبول نہیں کیا۔ یاد رہے 1926ء میں لوگوں کو مطلع کرنے کے لیے بہت کم ذرائع ابلاغ موجود تھے۔ براڈ کاسٹنگ ریڈیو اسٹیشن وجود میں آچکے تھے مگر ابھی بہت کم لوگوں کے پاس ریڈیو سیٹ موجود تھے۔ اگرچہ اس شام اور رات کے اوقات میں ہوا ناپنے کے آلات Berometers کی سوئیاں مسلسل نیچے کی طرف گرتی رہیں مگر سیلابی ریلے ساحلی مقامات پر چڑھ آئے اور شدید آندھی پورے ساحلی مقامات میں چلتی رہی۔ پھر 18 ستمبر کو آدھی رات گذرنے کے بعد ہری کین نے پورے شداید کے ساتھ ان علاقوں کو آلیا۔ پورے علاقے میں بجلی کی سپلائی منقطع ہوگئی اور بہت سی عمارات منہدم ہوگئیں۔ لوگ اندھیرے میں امدادی جماعتوں کے پہنچنے کا انتظار کرتے رہے۔ ہوٹلوں کی بالکونیاں اور سکائی لائٹس ٹوٹ کر بکھر گئیں اور 4 فٹ بلند پانی ان عمارتوں

میں در آیا۔ ایک ہوٹل کی عمارت کی دیواروں کے بیٹھ جانے کے خطرے کی وجہ سے ایک بلڈنگ آفیسر
اس عمارت کو خالی کرنے کا حکم دیدیا اور اس کے مکینوں کو دوسری عمارت میں منتقل کر دیا گیا جو ساحل
کچھ دور واقع تھی۔ یہ ہری کین 6 ستمبر 1926ء کو براعظم افریقہ کے ساحل سے پرے واقع جزائر
ورڈی Capeverde islands کے قریب سے پیدا ہوا تھا۔ بحر اوقیانوس میں سفر کرتا ہوا یہ پہلے
کیریبین میں پہنچا اور 14 ستمبر کو اس کے سینٹ کٹس St.kitts کے قریب سے گزرنے کی اطلاعات
موصول ہوئیں۔ دو دن بعد یہ جزائر بہاماس Bahamas پہنچ چکا تھا اور 17 ستمبر تک اس نے فلوریڈا کے
جنوبی علاقوں کو گھیر لیا اور 18 ستمبر کی صبح تک اس نے ان علاقوں میں شدید تباہی مچا دی۔

میامی کے علاقے میں جیسے ہی یہ ہری کین مدھم پڑا لوگ اپنی اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل آئے اور
انہوں نے خیال کیا کہ طوفان تھم گیا ہے عین اسی لمحے اس طوفان کا بقایا حصہ دھاڑتا ہوا اس قصبہ پر حملہ
آور ہوا اور درجنوں افراد اس طوفان میں بہتے ہوئے سمندر میں جا گرے۔ فلوریڈا کے بعد اس طوفان نے
ریاست الباما کا رخ کیا ابھی تک یہ ایک شدید طوفان تھا اور اس کی شدت کیٹیگری 53 تھی۔ الباما کے
ساحلی مقامات سے بھی لوگوں کو ہری کین کی متوقع آمد کے باوجود نکالا نہیں گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس شہر
میں آباد ہونے والے نئے لوگ ایک ہری کین کی تباہ کاریوں اور شدائد سے پوری طرح باخبر نہیں تھے۔
کچھ لوگوں نے طوفان کے ذرا تھمنے کے بعد بیریر آئی لینڈ سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی وہ لوگ پل
عبور کر رہے تھے کہ طوفان نے دوبارہ شدت اختیار کر لی جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ پل سے پرے
سمندر میں جا گرے۔ ایک قریبی جھیل اوکی چوبی Oreechobee میں تلاطم پیدا ہونے کی وجہ سے اس کا
ایک حفاظتی پشتہ ٹوٹ گیا جس سے مورہیون Moorehaven نامی قصبے میں سیلاب آ گیا اور بہت سے
افراد اس سیلابی پانی کی نذر ہو گئے۔ دو سال پہلے اسی جھیل میں آنے والے ایک تلاطم خیز ہری کین سے
تقریباً دو ہزار افراد مارے گئے تھے۔ فلوریڈا میں آباد ہونے والے اکثر نئے لوگ اس علاقے میں آنے
والے ہری کینوں کی تباہ کاریوں سے ناواقف تھے 1926ء میں آنے والے اس ہری کین کا نام فلوریڈا
کے جنوبی علاقے کے نام پر ''بگ بلو'' Big Blow رکھا گیا تھا یہ اس کے 60 سال بعد آنیوالے ہری
کین اینڈریو کی آمد تک اس علاقے میں آنے والا بدترین طوفان سمجھا جاتا تھا۔

1928ء جوزف سٹالن کے مظالم

جنوری 1923ء میں جب لینن، بانی سوویت یونین کو دوسری مرتبہ دل کا دورہ پڑا تو اس نے اپنے قریبی ساتھیوں پر زور دیا کہ سوویت کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل جوزف سٹالن کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اسٹالن اپریل میں ہونے والی پارٹی کانگریس میں اس پر حملہ کرے گا۔ مگر لینن کا یہ حکم کبھی عملی جامہ نہ پہن سکا کہ 9 مارچ کو لینن کو تیسری مرتبہ دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا تاہم 9 ماہ تک بستر علالت پر دراز رہنے کے بعد وہ جنوری 1924 میں چل بسا۔ لینن کے بعد لیون ٹراٹسکی اہم شخصیت تھی جسے اقتدار حاصل ہونا تھا مگر چونکہ اس کے دو مخالفوں نے لینن کی وصیت کو منظر عام پر نہ آنے دیا اس لیے سٹالن برسر اقتدار آ گیا اور جیسے ہی اس کی حیثیت مستحکم ہوئی اس نے ٹراٹسکی کے ساتھ ساتھ اس کے مخالفوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔

جوزف سٹالن روس کی ریاست جارجیا کا رہائشی تھا۔ جارجیا کی روایات میں مخالفین کا خون بہانا شامل تھا۔ اسی وجہ سے اپنے مخالفوں کا خون بہانے میں سٹالن کبھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ دوسری طرف وہ طبعی طور پر جرائم پسند تھا۔ 1913ء تک وہ انقلابی کاروائیاں کرتا ہوا سات سے زائد مرتبہ زار کی پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو چکا تھا اور کئی مرتبہ اسے سزائے قید یا جلاوطنی کی سزا بھی ہو چکی تھی اور وہ پارٹی کو مضبوط کرنے کے لیے بنک ڈکیتی کی وارداتوں میں بھی ملوث تھا۔ لیون ٹراٹسکی اور زینفیوف جیسے رقیبان سیاست کو اپنے راستے سے ہٹانے کے بعد وہ لینن کا جانشین بن گیا اور اگلے 25 سال تک سوویٹ یونین میں مطلق العنانیت کا مظاہرہ کرتا رہا۔

1928ء میں پہلے پنجسالہ منصوبے کے تحت سٹالن نے زراعت کو کمیونسٹ اصولوں کے تحت نئی شکل دینا چاہی۔ اس منصوبے کا مطلب یہ تھا کہ 5 کروڑ کسان اپنے گھر بار، زمین اور مال مویشی بلا قیمت ریاست کے حوالے کر دیں اور خود اشتراکی زراعت کے کارکن بن جائیں۔ خیال تھا کہ ٹریکٹروں کے استعمال ذریعے غلہ کی پیداوار دوگناہ ہو جائے گی اور ہر روسی کو پہلے سے کہیں زیادہ دودھ، مکھن اور پنیر کھانے کو میسر آئے گا۔ اور کسان زرعی قصبوں میں بلند و بالا عمارتوں میں رہیں گے اور کھانا بھی اشتراکی ڈائننگ روموں میں مشترکہ طور پر کھائیں گے مگر ایسا نہ ہوا اور بہت سے روسی کسان حکومت کی مشترکہ

کاشت کاری کے منصوبے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں گن پوائنٹ پر اشتراکی کاشت کاری
گھسیٹا گیا جس پر انہوں نے اپنے زرعی آلات توڑ دیئے اور اپنے مویشی ہلاک کر دیئے تاکہ
حوالے نہیں کئے اس کا پتہ اس اعداد و شمار سے چلتا ہے 1929ء میں روس میں 6 کروڑ کے قریب گائے
موجود تھے جبکہ 1933 میں اس سے آدھے بھی موجود نہیں رہے تھے۔ یہی حال بھیڑ بکریوں کا ہوا
کہ صرف ایک چوتھائی بچ گئیں۔ کسانوں کے اس باغیانہ رویئے کی سزا سٹالن نے یہ دی کہ تقریباً
کسانوں کو سائیریا کے سرد خانے میں جلاوطن کر دیا ان میں سے 20فی صد کسان مویشیوں کے
بھر کر سائیریا جاتے ہوئے جاں بحق ہوگئے۔ کسانوں کے خلاف یہ کاروائی زیادہ تر یوکرین میں
آئی جہاں اس کے نتیجے میں شدید قحط بھی پڑ گیا اور لاکھوں افراد بھوکوں مر گئے۔ جنوری 1933
103000 افراد ریاستی گوداموں سے غلہ چوری کرنے کے الزام میں گرفتار ہوئے اور 5000 کو
موت دی گئی جبکہ 26000 کو دس سال بامشقت قید کی سزا دی گئی، بالشویک حکومت نے پہلے تو غیر
صحافیوں کو قحط پڑنے کی خبر دینے سے انکار کر دیا اور یوکرین میں قحط سالی سے حالت یہ ہوگئی کہ
گوشت فروخت کیا جانے لگا اور لوگ اپنے بچوں تک کو مار کر کھانے پر مجبور ہوگئے اس پہلے پنجسالہ
منصوبے سے صرف زرعی شعبہ ہی نہیں بلکہ صنعتی شعبہ بھی متاثر ہوا جس کا الزام مختلف لوگوں پر لگا کر انہیں
قربانی کا بکرا بنا دیا گیا۔ بہت سے صنعت کاروں سے زبردستی ان کے مدعی جرائم کا اقرار کروا کر انہیں
پھانسی کی سزائیں دی گئیں۔ دوسرے شعبوں میں بھی سٹالن کی سختیاں رنگ لائیں۔ ریڈ آرمی سے
1000 آفیسروں کو نکال دیا گیا اور 20لاکھ لوگوں کو کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا۔

کمیونسٹ پارٹی کی اعلیٰ قیادت سے چونکہ سٹالن کو خطرہ رہتا تھا اسی لیے 1934ء میں منعقد
17ویں پارٹی کانگریس میں 1108 نمائندوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ یکم دسمبر 1934 کو روسی پولٹ بیورو کا ایک
طاقتور رکن سرجی کیرون لینن گراڈ میں قتل کر دیا گیا بعد ازاں اس کے قتل کی منصوبہ بندی کے الزام میں
زینونیف Zinoviev اور کامینیف Kamenev جیسے کمیونسٹ لیڈروں کو سزائے قید دے کر سٹالن نے
اپنے راستے کے روڑے مزید صاف کر دیئے۔

آرمی کے 80 ہزار آفیسروں میں سے 20 ہزار کو فوج سے نکال دیا گیا اور ان میں بہت سوں کو گولی
بھی مروا دی گئی۔ ٹراٹسکی جیسے مخالف کو پہلے جلاوطن کیا گیا۔ پھر 1940ء میں میکسکو میں کرائے کا قاتل
بھیج کر قتل کروا دیا گیا۔

1929ء..... وال اسٹریٹ نیویارک کا مالیاتی دھماکہ

دنیا کی مالیاتی تاریخ میں جمعرات 24 اکتوبر 1929 کو "سیاہ جمعرات Black Thursday کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دن وہ دن تھا جب نیویارک سٹاک ایکسچینج بیٹھنا شروع ہوگئی تھی، یہ دنیا کا بدترین مالیاتی حادثہ تھا۔

وال اسٹریٹ نیویارک کو بیسویں صدی کے آغاز سے ہی دنیا کے مالیاتی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وال اسٹریٹ میں نا صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کا سب سے بڑا اسٹاک ایکسچینج واقع ہے۔ جہاں روزانہ لاکھوں حصص کی لین دین ہوتی ہے۔ ان حصص کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے ساری دنیا کی معیشت براہ راست متاثر ہوتی ہے۔

24 اکتوبر 1929 کو وال اسٹریٹ اسٹاک ایکسچینج میں کل ایک کروڑ تیس لاکھ حصص کا کاروبار ہوا۔ مندی کے رجحان کی وجہ سے بروکر حضرات اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ جو بھی حصص ان کے پاس ہیں ان سے کسی قیمت پر بھی چھٹکارا پا لیا جائے بروکر حضرات کے اس رویئے کی وجہ سے وال اسٹریٹ ایکسچینج پر تباہی آگئی اور یہ مالیاتی طور پر کرش ہوگیا۔ حصص کی قیمتیں اسی تیزی سے گرنے لگیں کہ منافع کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لیے بینکوں نے بے حساب حصص خریدنا شروع کر دیئے۔ یوں حصص کی قیمتیں اس تیزی سے گریں کہ ماہرین مالیات کے اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اسی مالیاتی کرش سے 1929ء کے موسم خزاں میں دنیا کا سب سے بڑا کساد شروع ہوگیا۔

ہزاروں امریکی حصص کی قیمتیں گرنے کے نتیجے میں اپنی عمر بھر کی کمائی جو ان حصص میں لگی ہوئی تھی اس سے محروم ہوگئے اور دیوالیہ ہو جانے کے صدمے سے گیارہ افراد نے خودکشی کر لی۔

دنیا کے اس سب سے بڑے مالی کساد نے دنیا بھر کے اکثر ملکوں کے لیے مالی مشکلات و مصائب کھڑے کر دیئے لیکن اس کساد نے جو حالت جمہوریہ امریکہ میں پیدا کی وہ دنیا میں اور کسی جگہ پیش نہ آئی اس کا سرسری اندازہ صرف اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے اوائل میں ایک کروڑ بیس لاکھ امریکی بے روزگار ہوگئے۔ یہ لوگ امریکی قوم کی قوت کار کا کم از کم ایک تہائی حصہ تھے۔ جس شے کو ماہرین اقتصادیات مجموعی قومی پیداوار کہتے ہیں۔ امریکہ کے محکمہ تجارت نے اس کی

مقدار 1929ء میں ایک کھرب تین ارب بیاسی کروڑ اسی لاکھ ڈالر رکھی تھی اور 1933ء میں کساد کے دوران یہ گھٹ کر یہ پچپن ارب چھہتر کروڑ ڈالر رہ گئی۔ یعنی قومی پیداوار 1929ء کے مقابلے میں گھٹ کر نصف سے بھی کم رہ گئی۔

30 اکتوبر کی صبح شائع ہونے والے اخبارات نے اسٹاک مارکیٹ کے اس ''کرش'' کی خبر اپنی سرخیوں میں شائع کی اور بتایا کہ کروڑوں ڈالر کے حصص کی قیمت کم ہو کر لاکھوں میں رہ گئی ہے یوں وال اسٹریٹ کی مالیاتی تاریخ کا سب سے ناخوشگوار دن ثابت ہوا بالفاظ دیگر ''سیاہ جمعرات'' دنیا کی مالیاتی تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا جس سے پوری دنیا متاثر ہو کر رہی اور کساد کا شکار ہوگئی۔

دنیا کے ماہرین اقتصادیات آج بھی اس پر متفق نہیں کہ سرمایہ دار معاشرہ اتار چڑھاؤ کا شکار نہیں ہوسکتا۔ ان کے نزدیک سرمایہ دار معاشرے میں کاروباری اتار چڑھاؤ ایک لازمی امر ہے۔ کبھی انتہائی کاروباری خوشحالی کا دور شروع ہو جاتا ہے اور کبھی سخت ترین مالی بدحالی شروع ہو جاتی ہے۔ ان مالیاتی چکروں کی معیاد بھی مختلف ہوتی ہے بعض کافی طویل المدت ہوتے ہیں اور بعض کم مدت کے۔

دنیا کے اس بدترین مالیاتی حادثے کے بعد سب سے زیادہ نقصان امریکی معیشت کو پہنچا۔ امریکہ اگلے کئی سالوں تک عظیم کساد کا شکار رہا اور اس بحران سے نکالنے کے لیے صدر روز ویلٹ کو نئی معاشی پالیسیاں ترتیب دینا پڑیں، اگلے صرف تین سال میں امریکہ میں بے روزگاری کی شرح میں اضافہ ہوا اور بے روزگاروں کی تعداد 70 لاکھ سے بڑھ کر ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہوگئی اور امریکہ کی معاشی ترقی رک گئی۔ اس کساد سے نکلنے میں امریکی معیشت کو دس سال لگے۔ اس کساد یا مندے کے اثرات یورپی ممالک اور دیگر دنیا پر بھی مرتب ہوئے۔ صرف امریکہ میں وال سٹریٹ کے مالیاتی حادثے کی وجہ سے 4 ہزار بینک دیوالیہ ہوئے تھے۔ اور اس سے پہنچنے والے مالی نقصانات کا اندازہ 30 ارب ڈالر تھا۔

1932ء..... یوکرین میں آفت ناگہانی

نومبر 1932ء میں کمیونسٹ روسی راہنما جوزف سٹالن نے یوکرین کے کسانوں کے خلاف مہم چلائی کہ وہ نجی ملکیت کے کھیت و کھلیان چھوڑ کر اجتماعی زراعت Collective farming کے سسٹم میں شمولیت اختیار کریں۔ وہ کسان جو چھوٹی چھوٹی زمینوں کے مالک تھے انہیں کولاک Kulaks کہا جاتا تھا۔ انہوں نے حکومت کے ''اجتماعی زراعت'' کے منصوبے کی مخالفت کی تو سٹالن نے انہیں بھوکوں مارنے کا فیصلہ کیا اور ان سے ان کے غلے کے ذخائر چھین لیے گئے۔ دوسرے لفظوں میں کولاکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا اور روس میں ہر طرح سے انفرادی کاشتکاری ختم کر دی گئی کمیونسٹ حکومت کے خزانے میں نہ اتنا روپیہ تھا اور نہ اتنی ساکھ تھی کہ غذائی جنسوں کی درآمد کی جاسکے۔ مزید یہ کہ حکومت کی مشینری کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ کسانوں سے چھپائی ہوئی فصلیں باہر نکلوا سکے۔ لہٰذا حکومت نے کولاکوں کو اپنا طرفدار بنالیا، قرار یہ پایا کہ اگر چھوٹے کسان یا کولاک بڑے کسانوں کی اجناس کا سراغ لگا دیں تو انہیں اجتماعی زراعت میں شامل کر لیا جائے گا اور اس زراعت میں بڑے کسانوں کی زمینیں اور زرعی آلات بھی ان کے استعمال میں دے دیئے جائیں گے۔ اغلب یہ ہے کہ بہت سے چھوٹے کسانوں نے اس موقع کا خیر مقدم کیا۔ ابتدا میں اجتماعی کاشتکاری کی اس طرح حوصلہ افزائی ہوئی تو سٹالن انتہائی اقدام اٹھانے کے لیے تیار ہوگیا 1939ء کے اواخر میں اس نے اعلان کر دیا کہ بڑے کسانوں کو ایک طبقے کی حیثیت سے ختم کر دیا جائے گا۔ ان کے گھرانے اس وقت 20 لاکھ تھے اور پوری تعداد لگ بھگ ایک کروڑ کے قریب پہنچتی تھی۔ ان کی تمام املاک پر قبضہ کرلیا جائے گا اور ان کے لیے نئی اجتماعی زراعت میں شرکت ممنوع قرار دی گئی۔ چونکہ ان کے لیے کوئی الگ انتظام نہیں کیا گیا تھا، اس لیے اجتماعی زراعت نے ایک اذیت کی شکل اختیار کرلی۔

اب ان کسانوں کو اسلحہ کے زور پر یہ حکم ماننے پر مجبور کیا گیا۔ بہت سے بڑے کسان جلاوطن کر دیئے گئے یا انہیں سائبریا کے بیگار کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔ ادھر کسانوں نے اجتماعی زراعت کے خلاف بغاوت کر دی اور اپنی کوڑی فصلیں جلا دیں اپنے لہلہاتے کھیتوں کو نذر آتش کر دیا، اپنے ہل اور دیگر آلات زراعت توڑ دیئے اور اپنے مویشی حکومت کے حوالے کرنے کے بجائے مار ڈالے۔ چنانچہ روس کے نصف

گھوڑے، پچاسی فی صد مویشی اور دو تہائی بھیڑیں اور بکریاں اس موقع پر ذبح کر دیں گئیں۔ مویشیوں کے اس نقصان کی تلافی کئی دہائیوں تک ممکن نہ ہو سکی جو اجتماعی زراعت کے موقع پر حکومت کی سختیوں کے خلاف ہوا تھا۔ ان سالوں میں زمین بھی بلا کاشت پڑی رہی۔ اس کے نتیجے میں یوکرائنا اور دوسری کئی ریاستوں میں قحط بھی بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گیا لوگ بھوکوں مرنے لگے شہروں میں فاقہ کشی تک نوبت آ گئی جس سے سٹالن کی صنعتی ترقی کے خواب بکھرنے لگے۔ سٹالن نے 1929 اور 1930ء میں 4 کروڑ سے زائد افراد صنعتی شعبے میں بھرتی کئے تھے۔ تاکہ روس میں صنعت کاری کو ترقی دی جا سکے وہ سب بھی بھوکوں مرنے لگے۔

ان حالات میں سٹالن نے یوکرین کے کسانوں کے خلاف انتہائی اقدام اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ یوکرین اور روس میں تناؤ کی تاریخ بڑی قدیم ہے۔ تاریخی طور پر یہ دونوں الگ الگ ملک تھے۔ 1917 کے کمیونسٹ انقلاب کے بعد لینن نے اس بات کی یقین دہانی چاہی کہ یوکرین کے لوگ ماسکو کی نئی ڈکٹیٹر شپ کی حمایت کریں جس کے نتیجے میں 1918ء میں ہی یوکرین کے کسانوں سے جھگڑے کی ابتدا ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی یوکرین کے کسانوں کو انتہائی بے رحمی سے کچل دیا گیا تھا۔ 100 کے قریب امیر ترین یوکرینین بڑے کسان پھانسی پر لٹکا دیئے گئے تھے۔

نومبر 1932ء میں کمیونسٹ انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر یوکرینی کسانوں کے خلاف جو اقدام کیا گیا اس کی مخالفت سٹالن کی جواں سال بیوی Nadezhda alliluyeva نے کی سٹالن کی بیوی نے اس کی پالیسی کی مخالفت اس لیے کی تھی کہ یوکرین سے واپس آنے والے طالب علموں نے الیوفا کو وہاں کے حالات سے آگاہ کیا تھا۔ قحط کی وجہ سے یوکرین میں لوگ آدم خوری تک پر اتر آئے تھے۔ ایک روسی طالب علم نے جو سرکاری خدمات انجام دینے کے لیے یوکرین بھیجا گیا تھا کہ واپسی پر بتایا کہ اس نے یوکرین میں ایسے اشخاص کو گرفتار کیا جو انسانی لاشے فروخت کرتے تھے۔ الیوفا نے یہ احوال سن کر کوشش کی کہ یوکرین کے لوگوں کی مدد کرے مگر جب اسے اس کا خاوند سٹالن اس بات پر رضامند نظر نہ آیا تو اس نے اس پر تنقید کی۔ الیوفا کو شاید اس بات کی خبر نہیں تھی کہ سٹالن یوکرین کے حالات سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ اور اسی کے احکامات کی وجہ سے وہاں ایسا ہو رہا تھا۔ سٹالن نے یوکرین کے حالات سدھارنے کی بجائے ان تمام طالب علموں کو قتل کروا دیا جو یوکرین سے واپسی پر وہاں کے برے حالات کی خبریں روس کے بقایا حصوں میں پہنچا رہے تھے ادھر خود سٹالن کی یہ جواں سال بیوی بھی اپنی خوابگاہ میں مردہ پائی گئی۔ کیونکہ سٹالن کسی طور پر بھی اپنی مخالفت پسند نہیں کرتا تھا۔

1932ء میں نیویارک ٹائمز کے ماسکو کے رپورٹر نے جو رپورٹیں نیویارک ٹائمز میں شائع کرائیں

ان کو دیکھ کر لوگ چونک اٹھے۔ سٹالن کے حکم پر یوکرین کے گاؤں در گاؤں سڑکیں اور پل تک اکھیڑ دیئے گئے یہ سٹالن کے یوکرینی مخالفوں کو تباہ کرنے کے لیے تھا۔ گرجا گھروں کو نذر آتش کر دیا گیا کیونکہ وہ پرانے روس کے ماضی کی نشانیاں تھیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے بیوروکریٹس کو بڑے بڑے فارموں کا انچارج بنا دیا گیا۔ وہی یوکرین کی زراعت کے سیاہ وسفید کے مالک ہوگئے۔ اور کاشتکاری رک گئی۔

جس کے نتیجے میں لوگ بھوک اور دہشت کا شکار ہوگئے۔ حکومتی کارندوں نے ذرا سی بغاوت کی اطلاع ملنے پر پورے پورے گاؤں اجاڑ کر رکھ دیئے اور ان کے باسیوں کو گولی مار دی لاکھوں لوگ سائبیریا کے برف خانے کی طرف جلاوطن کر دیئے گئے جہاں ان سے کان کنی اور دوسری بیگار لی گئیں۔ سٹالن کی یہ پالیسی کسی طرح بھی یوکرین میں نسل کشی سے کم نہ تھی۔ کیونکہ سٹالن کے نزدیک یوکرینی نسل کے لوگ ماسکو کی حکومت کے باغی تھے۔ قریباً ایک کروڑ افراد فاقہ کشی سے ہلاک ہوگئے۔ سٹالن کا یوکرین کے لوگوں سے رویہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے نازیوں اور ہٹلر کا یہودیوں سے تھا۔ یوکرین تک کسی غیر ملکی نامہ نگار کو رسائی حاصل نہیں تھی۔ سٹالن صرف ایسے غیر ملکیوں کو یوکرین کے دورے کی اجازت دیتا تھا جو کمیونزم کی حمایت کرتے تھے۔ ان میں ایک برطانوی ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شا تھا جس نے یوکرین کے دورے کے بعد بیان دیا تھا کہ جبراً اجتماعی زراعت کا تضاد اور فاقہ زدگی کی تمام خبریں ''نان سنسز'' nonsens ہیں۔ مگر حقیقت وہی بھی جو نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار نے انہی رپورٹوں میں بھجوائی تھی۔

1934..... برطانوی ہند کے صوبہ بہار میں زلزلہ

1934 میں برطانوی ہند کے صوبہ بہار اور نیپال میں ریکٹر اسکیل پر 8.1 درجے کا ایک شدید زلزلہ آیا جس سے 12000 افراد ہلاک ہوگئے۔ اس زلزلے کا مرکز نیپال میں تھا اور ماؤنٹ ایورسٹ سے اس کا فاصلہ تقریباً 6 میل تھا۔ یہ ان دونوں ملکوں میں آنے والا بدترین زلزلہ تھا۔ اس زلزلے سے پڑنے والی زمینی شگاف تقریباً 1200 میل طویل تھا۔ زمین پھٹنے سے کئی اور بد اثرات بھی مرتب ہوئے کئی مقامات پر زمین بیٹھ گئی اور زمین سے چشمے پھوٹنے سے زیریں علاقوں میں سیلاب آگئے۔ یہ زلزلہ قبل از دوپہر اس وقت آیا جب لوگ دفتروں اور کام پر جانے کے لیے گھروں سے نکلے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے 12000 افراد جاں بحق ہوگئے۔ اگر یہ زلزلہ رات کے وقت آتا اور لوگ اپنے گھروں میں محو استراحت ہوتے تو جانی نقصان اس سے کہیں زیادہ ہوتا۔ زیادہ تر نقصانات نیپال کھٹمنڈو کی وادی میں ہوئے جبکہ ہندوستان کے صوبے بہار کے مشرقی میدانی علاقے زلزلے سے ہونے والے نقصانات کی زد میں آئے۔ ان علاقوں میں 80000 سے زائد مکانات کو شدید نقصان پہنچا۔

صوبہ آسام کے مغرب میں واقع سلسلہ کوہ ہمالیہ میں پچھلے ایک سو سال میں 4 شدید زلزلے آئے ہیں۔ ان زلزلوں میں ہر ایک کی شدت کم سے کم درجے (ریکٹر اسکیل پر) تھی۔ اس کے علاوہ ماضی میں اس سے شدید زلزلے بھی آتے رہیں ہیں۔ ارضیاتی سروے اور زلزلوں کے متعلق شواہد سے پتا چلا ہے کہ اب بھی اندرونی دباؤ بڑھ رہا ہے۔ مستقبل میں یا آئندہ اس ہمالیاتی خطے میں شدید زلزلے آنے کا امکان موجود ہے۔ کھٹمنڈو کے مغرب میں واقع علاقے میں پچھلے تین سو سال سے زلزلے آتے رہے ہیں اور آئندہ بھی اس علاقہ کے شدید زلزلوں کی آماجگاہ بننے کے امکانات موجود ہیں۔ ہندوستان کا شعبہ کان کنی اور ارضیات دنیا بھر کے کئی اہم سائنسدانوں کے ساتھ مل کر ان زلزلوں کی آمد کے اسباب جاننے اور ان سے پہنچنے والے نقصانات سے نمٹنے میں مصروف ہے۔

ارضیاتی شواہد کے مطابق تقریباً دو کروڑ سال پہلے ایک بڑے سمندر نے حائل ہو کر ہندوستان کو اس وقت کے براعظم یوراشیا Eurasia سے الگ کر دیا تھا۔ یہ سمندر بعد ازاں خشک ہوگیا اور خطہ تبت کے نیچے موجود سمندر کی خشک تہہ میں بدل گیا۔ پھر تقریباً ایک کروڑ سال پہلے یہ جغرافیائی تبدیلی واقع ہوئی کہ

ہندوستان کی ارضیاتی پرت براعظم یوراشیا کی ارضیاتی پرت سے ٹکرائی۔ یہ ٹکراؤ اس مقام پر ہوا جہاں آج کل دریائے سندھ کی وادی واقع ہے۔ نیپال جغرافیائی طور پر اس خطے میں واقع ہے جہاں کوہ ہمالیہ کا پہاڑوں کی آماجگاہ یا زلزلیاتی طور پر بیدار علاقہ واقع ہے۔ ہندوستان کی ارضیاتی پرت کا شمالی سمت میں 4 سنٹی میٹر سالانہ مسلسل سرکاؤ وسیع پیمانے پر ارضیاتی بگاڑ کا باعث بنتا ہے اور دنیا کے بلند ترین سلسلہ کوہ یعنی ہمالیہ کی چوٹیوں کو مسلسل بلند کرتا ہے۔ اور ہمالیہ خطے میں زلزلوں کی پیدائش کا سبب بھی بنتا ہے۔

1934ء کا زلزلہ اور اس سے تقریباً ایک سو سال پہلے آنے والا 1833ء کا زلزلہ ریکٹر اسکیل پر یکساں درجہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان دونوں زلزلوں کا مرکز بھی ایک تھا اور یہ ہندوستانی اور یوراشیائی ارضیاتی پرتوں کے مسلسل ٹکراؤ کی وجہ سے بھی آئے تھے۔ 1833ء کا زلزلہ جو 26 اگست 1833ء کو آیا تھا، شمالی ہندوستان کے ایک وسیع علاقے میں محسوس کیا گیا تھا، اس کے علاوہ تبت و نیپال میں بھی اس زلزلے نے تقریباً 10 لاکھ مربع میل کے علاقے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس زلزلے سے تودے اور چٹانیں گرنے کے واقعات بھی رونما ہوئے اور شرح اموات کافی تھی تقریباً 500 افراد جاں بحق ہوئے۔ یہ بات یقینی تھی کہ جانی نقصانات اس سے کہیں زیادہ ہوتے اگر زلزلے کے بڑے جھٹکے آنے سے پہلے ابتدائی طور پر 5 گھنٹے پہلے کچھ ہلکے جھٹکے نہ آئے ہوتے۔ ان چھوٹے جھٹکوں سے خبردار ہو کر لوگ عمارتوں سے باہر کھلے مقامات پر نکل آئے جس کی وجہ سے جانی نقصانات بہت کم رہے۔ تاہم اس زلزلے سے 4600 مکانات اور کئی ایک مندر منہدم ہوگئے۔ اس زلزلے کے بڑے جھٹکے مغرب میں دہلی، پاکستان اور مشرق میں چٹانگ تک محسوس کیے گئے 1934ء کے زلزلے نے بھی اسی وسیع پیمانے پر تباہی مچائی تھی مگر 1833ء کے زلزلے کے بعد سیلاب بھی آگیا تھا تاہم 1934ء بھی ایسا نہ ہوا۔

1934ء کے زلزلے میں کھٹمنڈو کے علاقے میں تقریباً 60 فی صد عمارات منہدم ہوگئیں اور بہت سی عمارات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اس علاقے میں موجود تقریباً آدھے پل منہدم ہوگئے اور پختہ سڑکوں کے 10 فی صد حصے کو بھی شدید نقصان پہنچا اور مختلف مقام پر شاہراہوں میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئیں۔ اس زمانے میں صرف کھٹمنڈو میں نیپال کا اکلوتا ہوائی اڈہ موجود تھا وہ ناقابل رسائی ہوگیا۔ شہر میں بچھائے گئے پانی کے پائپوں میں سے 90 فی صد بے کار ہوگئے جبکہ اس زمانے میں موجود مواصلات کا اکلوتا ذریعہ ٹیلی فون تھا، ٹیلی فون کی جتنی لائنیں اس علاقے میں بچھائی گئیں تھیں وہ سب تباہ ہوگئیں۔ اسی طرح بجلی کا نظام بھی بری طرح متاثر ہوا اور بجلی کے آدھے تار ٹوٹ کر گر گئے۔ جبکہ 22000 اموات واقع ہوئیں اور 25000 افراد شدید زخمی ہوگئے۔

1934-1945 یہودیوں پر ایڈولف ہٹلر کے مظالم کا طوفان

جنگ عظیم اول کے آخری دنوں میں ایک انتیس سالہ جرمن فوجی کارپورل ایڈولف ہٹلر کو آئرن کراس درجہ اول برائے بہادری کا تمغہ جنگ میں اس کی اعلیٰ کارکردگی پر دیا گیا۔ یہ تمغہ اسے ایک یہودی کیپٹن ہیوگوگوٹ مین کی سفارش پر دیا گیا تھا۔ یہ بات اور ہے کہ بعد کے زمانے میں ہٹلر یہودیوں کا سب سے بڑا دشمن ثابت ہوا۔

ایڈولف ہٹلر آسٹریا میں 1905ء میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن سے وہ ایک آرٹسٹ بننا چاہتا تھا۔ مگر اس کا یہ خواب کبھی پورا نہ ہوسکا۔ ایام جوانی میں وہ جرمنی کے شہر میونخ گیا اور وہاں نیشنل سوشلسٹ پارٹی، نازی پارٹی کا رکن بن گیا اس پارٹی میں اسے پروپیگنڈا انچارج کا عہدہ دیا گیا۔ نازی پروپیگنڈہ انچارج کی حیثیت سے اس نے لکھا تھا کہ اس کی زندگی کا آخری مقصد جرمنی سے یہودیوں کا اخراج ہے۔ جو اس کے نزدیک دنیا کی سب سے بے ایمان اور گھٹیا قوم تھی۔

1932ء میں نازی پارٹی جرمنی کی پارلیمنٹ ریش ٹیگ Reichstag میں سب سے بڑی اور طاقتور پارٹی کی حیثیت سے ابھری اور جنوری 1933ء میں ہٹلر کو چانسلر بنا دیا گیا۔ برسر اقتدار آتے ہی ہٹلر نے بیگار کیمپ بنائے جن میں 1933 کے آخر تک کم از کم ایک لاکھ مخالفین کو قید کر دیا۔ کچھ کو جرمن خفیہ پولیس گستاپو کی جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ قید کیے جانے والے جرمن سوشل ڈیموکریٹ پارٹی اور کمیونسٹ کے ورکر تھے ان سب کا صرف ایک جرم تھا وہ ہٹلر کی یہود مخالف پالیسی کی مخالفت کرتے تھے۔ ہٹلر کے اگلے اقدام کے طور پر جلد ہی جرمنی کی شاہراہوں پر یہود مخالفت نعروں کے بینر لہرانے لگے جن پر لکھا تھا ''یہودیوں کی ضرورت نہیں ہے۔'' 1934 میں جب نازی طوفانی دستوں Nazi stormtroopers نے گنزن ہاسن gunzen hausen نامی ایک جرمن گاؤں پر پیش قدمی کی تو اس گاؤں میں انیس یہودی خاندان آباد تھے۔ ان خاندانوں کے سربراہ کو گرفتار کر لیا گیا اور یہود عورتوں کو بالوں سے پکڑ کر اس گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹ کر ان کی تذلیل کی گئی اور انہیں بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ اگلے دن ایک 75 سالہ یہودی چاقوؤں سے قتل کیا ہوا ملا جبکہ دوسرے کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔

اگست 1934ء میں ہٹلر نے فیوہر Fuhrer کا لقب اختیار کیا جس کے معنی جرمن زبان میں راہنما

ہے ہیں۔ اس کے ساتھ جرمن دیہاتوں کو یہودیوں سے پاک کرنے کا حکم دیا گیا۔ ستمبر 1935ء تک یہودی آبادی کا چوتھائی حصہ ان کے دفتروں اور کاموں سے نکال دیا گیا اسی مہینے میں نورمبرگ کے قوانین کے نام سے ایک ضابطہ قوانین مرتب کیا گیا جن کی رو سے یہودی جرمن شہریت سے محروم کر دیئے گئے۔ اور انہیں جرمنوں کے ساتھ شادی بیاہ کرنے اور جنسی تعلقات قائم کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں مشہور یہودی النسل ایٹمی سائنسداں آئن سٹائن پہلے ہی ملک چھوڑ کر امریکہ جا چکا تھا۔ اسی سائنسدان نے جرمنی کے دشمن اتحادیوں کو ایٹم بم بنانے کا مشورہ دیا تھا تاکہ جرمنی کی شوریدہ سری پر قابو پایا جاسکے۔ ہٹلر کو آئرن کراس کا تمغہ دینے والا یہودی کیپٹن ہیوگوگوٹ مان 3 مرتبہ جیل کی ہوا کھانے کے بعد جرمنی چھوڑنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ صرف جرمنی ہی میں یہود مخالف پالیسی جاری نہیں تھی بلکہ ان دنوں پولینڈ میں بھی یہودیوں کو عتاب کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔

جب 1938 میں ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کیا تو وہاں کے یہودیوں کو ان کے تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ وہ نہ تو آسٹریا میں اب جائداد رکھ سکتے تھے اور نہ ہی کہیں کام کرسکتے تھے۔ 30 ہزار آسٹروی یہودیوں کو جرمن بیگار کیمپوں میں بھیج دیا گیا جبکہ کہا جاتا ہے کہ 100000 یہودیوں نے خودکشی کرلی۔ پھر 28 اکتوبر کو 17000 یہودی جن کا تعلق پولینڈ سے تھا اور وہ ساکن جرمنی تھے گرفتار کر لئے گئے اور انہیں اپنے گھروں سے صرف وہ سامان اٹھانے کی اجازت ملی جو وہ ساتھ لے جاسکتے تھے نازی ان پولش یہودیوں کو اس دریا پر لے گئے جو پولینڈ اور جرمنی کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔ پھر انہیں حکم دیا گیا کہ وہ یہ دریا عبور کریں تاہم پولینڈ کے سرحدی محافظ فوج کے دستوں نے انہیں واپسی دھکیل دیا۔ یہ آنا جانا مسلسل بارش کے باوجود لگا رہا یہاں تک کہ پولینڈ کی حکومت نے انہیں یہودی مہاجر کیمپوں میں بھیج دیا جہاں صورتحال پہلے ہی بہت دگرگوں تھی اس لیے یہودیوں نے یہاں سے فرار ہوکر واپس جرمنی میں داخل ہونا چاہا جہاں انہیں گولی مار دی گئی۔ جرمن سے نکالے گئے ان یہودیوں مین سے ایک کا بیٹا جس کا نام ہرشل گرنز پان تھا، پیرس میں زیر تعلیم تھا اسے جب اپنے والدین کے مارے جانے کی خبر ہوئی تو اس نے پیرس میں جرمنی کے سفارتخانے کے سامنے احتجاج کیا جب اس کی شنوائی نہ ہوئی تو اس نے جرمن تھرڈ سیکرٹری کو گولی مار کر زخمی کر دیا۔ جس پر ہٹلر نے انتقامی کاروائی کرتے ہوئے۔ جرمن یہودیوں کے گھروں اور معبدوں پر ایک بڑا حملہ کروا دیا جسے kristalincht یا ''ٹوٹے ہوئے شیشوں کی رات'' کا نام دیا گیا۔ اس حملے میں 100 سے زائد یہودی مارے گئے اور اگلے چند دن میں 20 ہزار یہودی گرفتار کر لیے گئے اور انہیں بیگار کیمپوں میں ٹھونس دیا گیا، اس کے بعد نازی حکومت نے ضعیف العمر یہودیوں کو ضعیف گھروں اور ہسپتالوں سے نکال دیا اور انہیں کسی عوامی جگہ پر نہ رہنے دیا۔ مگر اس شدید ظلم اور جرمنی

کی حکومت کے ان اقدامات پر کسی غیر ملکی حکومت نے احتجاج نہ کیا۔

پولینڈ میں تقریباً 40 لاکھ یہودی آباد تھے۔ جب جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کیا تو ہر جرمن فوجی افسر کے ساتھ ایک سویلین افسر بھی تھا جس کا کام یہودیوں کی نسل کشی کرنا تھا۔ حملے کے پہلے دن پولینڈ کے سرحدی قصبے wieruzow میں 20 یہودی اس نسل کش پروگرام کے تحت ہلاک کر دیئے گئے۔ مگر ناریں کے پروگرام پولینڈ کے یہودیوں کی نسل کشی سے بھی زیادہ وسیع تر تھے۔ ایک جرمن فوجی اعلیٰ افسر سے ملاقات کے بعد اپنی ڈائری میں لکھا کہ گوئرنگ اور فیوہرر دونوں پوری پولش قوم کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔ پولینڈ میں جنگ کے دوران 25000 سے زائد پولش شہری اور بہت سے کیتھولک پادری ہلاک کر دیئے گئے تھے۔

اسی دوران جرمنی میں 20 ستمبر کو ہٹلر نے ایک خفیہ حکم نامہ پر دستخط کئے جس کی رو سے ہر ناقابل علاج جرمن شہری کو گولی مار دینے کی اجازت دے دی گئی۔ اگلے دو سال میں 100000 کے قریب بیمار دودھ پیتے بچے اور ناقابل علاج بیماریوں کے حامل جرمن اس حکم نامہ کی زد میں آ گئے۔ اسی طرح کی حکمت عملیاں مقبوضہ پولینڈ میں اختیار کی گئیں جہاں پولینڈ کے یہودی دانشوروں سمیت دیگر لیڈروں کو بھی قتل کر دیا گیا۔

پولینڈ میں ہٹلر کے حکم پر کئے جانے والے مظالم سے خود کئی جرمن بھی شرمندہ تھے۔ ایک جرمن میجر جنرل نے پولینڈ سے اپنے گھر خط میں لکھا کہ مجھے اپنے جرمن ہونے پر شرم آتی ہے۔ میجر جنرل فریڈرک میتھ جو فرسٹ جرمن آرمی کے چیف آف سٹاف تھے۔ انہوں نے SS دستوں کی طرف سے وسیع پیمانے پر سزائے موت دیئے جانے پر احتجاج کیا اور کہا کہ یہ جرمنی کے لیے باعث بدنامی ہے۔ جس کے نتیجے میں سزا کے طور پر اسے معطل کر دیا گیا۔ اسی جنرل نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ ہم 50 لاکھ یہودیوں کو نہ تو شوٹ کر سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں زہر دے سکتے ہیں، ہاں ہم انہیں اپنے ملک سے نکالنے کے اقدامات ضرور اٹھا سکتے ہیں۔ 1941ء میں 15000 انسان (یہودی) وارسا اور لاڈز LODZ کی اقلیتی بستیوں میں فاقہ کشی سے ہلاک ہو گئے تھے۔ ان بستیوں میں رہنے والے یہودیوں پر پابندی تھی کہ وہ اگر ان بستیوں سے خوراک کے حصول کے لیے بھی باہر نکلیں گے تو انہیں گولی مار دی جائے گی۔

جون 1940ء سے جرمن وزارت داخلہ نے ذہنی مریضوں کو زہریلی گیس سے آرام دہ موت سے مارنے کی کوششیں شروع کر دیں تھیں۔ ذہنی مریضوں کو ''شاور روم'' میں بینچ پر بٹھا دیا جاتا اور پانی کے پائپوں سے زہریلی گیس اس شاور روم میں چھوڑ دی جاتی۔ موبائل گیس وین بلغراد میں سربیائی یہودیوں کو قتل کرنے کے لیے استعمال کی گئیں تھیں۔ دانستہ طور پر مریضوں کو آرام کی نیند سلانے کے اس پروگرام

نے جرمنی میں آخر کار اتنی ہلچل مچا دی کہ اسے ترک کرنا پڑا، تاہم 31 جولائی 1941ء کو ہرمان گورنگ نے یہودیوں کو گیس سنگھا کر ہلاک کرنے کی تجویز سکیورٹی سروس کو پیش کی۔ اس کی آزمائش سوویت جنگی قیدیوں پر Auschwitz میں کی گئی یہ جنگی کیمپ پولینڈ کے قیدیوں کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس طریقے میں صرف دس منٹ میں موت واقع ہو جانے کی گارنٹی دی گئی تھی۔ دسمبر 1940ء تک شیلمنو، پولینڈ میں جس سے آرام کی نیند سلانے کا پہلا کیمپ وجود میں آ گیا تھا، اس کیمپ میں یہودیوں کے ساتھ ساتھ ہزاروں جپسی بھی ہلاک کیے گئے تھے۔ جپسیوں کے متعلق نازیوں کی رائے تھی کہ یہ بیماریاں پھیلاتے ہیں اور ناقابل اعتماد لوگ ہیں جو کسی کام میں بھی نہیں لگائے جا سکتے۔ اس کیمپ کے کمانڈر کے مطابق اس کیمپ میں 1000 افراد روزانہ ہلاک کیے جاتے تھے اور تقریباً 3 لاکھ افراد کو گیس چیمبروں میں ہلاک کیا گیا تھا۔ جرمن ہلاک کیے جانے والوں کی ہر قیمتی شے یہاں تک کہ اگر اس نے دانت پر سونے کا خول چڑھایا ہوتا تو وہ بھی اس کے منہ سے نکال لیتے تھے۔

20 جنوری 1942 کو جرمن سینئر حکام برلن کے قریب ایک مقام پر ایک کانفرنس میں بلائے گئے تاکہ ''یہودیوں کے مسئلے کے تابوت بلکہ خود یہودیوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جا سکے۔ اس کانفرنس میں نازی SS دستوں کے کمانڈر نے بتایا تھا کہ لتھوانیا یہودیوں سے فارغ کر دیا گیا ہے اور اسٹونیا میں یہودیوں کی آبادی 135000 سے کم ہو کر صرف 34000 رہ گئی ہے۔ پولینڈ کے یہودیوں کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ انہیں مشرق وسطیٰ میں آباد کیا جائے گا مگر دراصل انہیں موت کے کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا۔ یورپ بھر سے مویشیوں کے ٹرکوں میں یہودیوں کو بھر کر آشوٹز کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ اسی کیمپ میں 1944ء کے پہلے چھ ہفتوں میں 5 لاکھ ہنگرین یہودیوں کو گیس چیمبرز میں موت سے ہمکنار کر دیا گیا۔ کہیں جا کر جب اتحادی افواج جرمنی اور اس کے زیر انتداب ملکوں میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئیں تو یہودیوں کو اس نسل کش قتل عام سے نجات ملی تھی۔

1935ء..... کوئٹہ کا تباہ کن زلزلہ

پاکستان کا شہر کوئٹہ سطح سمندر سے تقریباً 5500 فٹ بلند ہے اور افغانستان کی سرحد سے صرف چند میل دور ایک پہاڑی علاقے میں پاکستان کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ 31 مئی 1935ء کو پونے تین بجے جب کوئٹہ کے شہری ابھی اپنے اپنے بستروں میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے تو ان پر اچانک ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ ریکٹر اسکیل پر 7.7 درجے کے ایک شدید زلزلے نے کوئٹہ شہر کو تہہ و بالا کر رکھ دیا۔ شہر کی ہر عمارت زمین بوس ہوگئی اور پورا شہر ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ اس شہر اور مضافاتی علاقوں میں تقریباً 30 ہزار افراد جاں بحق ہوگئے۔ کوئٹہ 1935ء میں برطانوی ہند کا ایک حصہ تھا اور یہاں برطانوی حکومت قائم تھی۔ برطانوی فوج کے افسروں نے زخمیوں تک ایمبولینس سروس بحال کرنے کے لیے انتہائی تیزی سے ملبے کے ڈھیر صاف کر کے راستہ بنوایا اور ملبے سے زخمیوں کو نکال کر ایمرجنسی طور پر قائم کردہ طبی امداد کے کیمپوں تک پہنچایا۔ فوجی جوانوں نے بڑی جانفشانی سے ملبے کے ڈھیروں کو ہٹا کر زخمیوں کو اور لاشوں کو نکالا۔ اس زمانے کے مطابق کوئٹہ کا دنیا سے رابطہ صرف ٹیلی گراف سے تھا۔ شہر کا ٹیلی گراف سنٹر تباہ ہونے کی وجہ سے شہر کا رابطہ دنیا بھر سے ٹوٹ گیا اور شہر میں آنے والی اس قدرتی آفت کا مقابلہ کوئٹہ کو اکیلے ہی کرنا پڑا کوئٹہ 1876ء سے نارتھ ویسٹ فرنٹیئر کے علاقے میں برطانوی فوج کی گیرژن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس گیرژن میں 12000 سپاہی مقامی سرداروں سے سرحدی تنازعات سے نمٹنے کے لیے متعین تھے۔ ''کوئٹہ'' ایک مقامی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''قلعے'' کے ہیں۔ برطانوی فوجی دستوں کی رہائش کے لیے یہاں کئی منزلہ عمارات تعمیر کی گئیں تھیں۔ رات کے آخری پہر جب یہ زلزلہ آیا تو چھاؤنی کی یہ عمارات بھی زمین بوس ہوگئیں جس کی وجہ سے بہت سے فوجی بھی جاں بحق ہوگئے اسی وجہ سے آئندہ زلزلوں کی آمد کے امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے جب شہر کی بحالی اور تعمیر نو کا کام شروع کیا گیا تو صرف ایک منزلہ عمارات تعمیر کی گئیں اور کئی منزلہ عمارات کی تعمیر کو ممنوع قرار دیدیا گیا۔ کوئٹہ گیرژن کے آفیسر انچارج سر لیفٹیننٹ جنرل ہنری کرسلاک تھے وہ سرحدی معاملات میں غیر معمولی تجربہ رکھتے تھے۔ اس نے امدادی کاروائیاں بھی انتہائی سرعت سے مکمل کروائیں جبکہ تعمیر کے کام کو بھی بڑی تیزی سے مکمل کرایا جس کی وجہ سے زلزلے جیسی آفتوں کے بعد عموماً پھیلنے والے

امراض کی روک تھام ہوگئی۔ اس کے علاوہ مئی چونکہ کوئٹہ میں بھی ایک گرم مہینہ تھا اس لیے لاشوں کو بھی جلد از جلد دفنایا گیا تاکہ تعفن نہ پھیلے۔

31 مئی کو 3:AM پر زلزلہ آنے کے صرف تین گھنٹوں کے اندر یعنی صبح 6 بجے تک جنرل کرسلاک نے شہر کے تباہ شدہ علاقے کو کئی سیکشنوں میں منقسم کرکے ہر سیکشن میں امدادی کاروائی فوجیوں کے ایک گروپ کے ذمہ لگا دی اور انہیں حکم دیا کہ ہر قیمت پر انسانی جانیں بچائی جائیں اور زخمیوں کی مدد کی جائے۔ ان فوجی گروپوں نے نہ صرف ملبے کے ڈھیر ہٹا کر زخمیوں کو نکالا اور ان کی جان بچائی اور طبی امداد دینے کے لیے ہنگامی بنیادوں پر کیمپ لگائے۔ اس کے علاوہ بے گھر ہو جانے والے افراد کے لیے بھی مہاجر کیمپ تشکیل دیئے۔ اس طرح صبح ہونے سے پہلے ہی بہت سی امدادی کاروائیاں مکمل کرلی گئیں۔ جو لاشیں شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں بکھری پڑی تھیں ان کو گاڑیوں میں ڈال کر تدفین کے لیے لے جایا گیا۔

کوئٹہ کی منہدم ہو جانے والی اہم عمارات میں سنڈیمن ہال، سول ہسپتال اور جیل کی عمارات قابل ذکر تھیں۔ اس زلزلے میں ایک مورخ کے اندازے کے مطابق سرکاری اعداد و شمار سے کہیں زیادہ اموات واقع ہوئیں تھیں جن کا اندازہ ساٹھ ہزار کے لگ بھگ بھی بتایا جاتا ہے۔ کوئٹہ میں اس سے قبل دسمبر 1892ء، مارچ 1902 اور 1931ء میں بھی شدید زلزلے آئے تھے تاہم ان میں سے کوئی بھی 1935 کے زلزلے جیسا ہولناک نہ تھا۔

امدادی کارکن 31 مئی کے دن شام تک مسلسل مصروف کار رہے، کوئٹہ میں یہ دن موسم گرما کا ایک گرم ترین دن تھا، اس لیے یہ لوگ بری طرح پسینے میں شرابور ہوگئے اور بے طرح تھک گئے۔ امدادی کارکنوں سے بہت سے لوگوں نے دن بھر کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا اور وہ حفاظتی طبی نقاب بھی پہنے ہوئے تھے تاکہ لاشوں سے پھیلنے والی بدبو سے پھیلنے والی بیماریوں کے خطرے سے بچاؤ کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ ملبے میں پھنسے ہوئے زخمی افراد کے کراہنے کی آوازیں اور لاشیں نکالنے کے کام سے یہ لوگ اعصابی دباؤ کا شکار ہوگئے تھے۔ عیسائیوں کو مسیحی قبرستانوں میں اور مسلمانوں کو ان سے علیحدہ مقامات پر دفن کیا گیا۔ ایک مسئلہ یہ ابھرا کہ ہندوؤں کی لاشوں کو کینٹ کے علاقے کے شمشان گھاٹ میں لے جا کر جلایا گیا دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ مویشیوں اور جانوروں کے ساتھ کیا کیا جائے۔ ان دنوں کوئٹہ میں بھینسیں اور گائیں بڑی تعداد میں بچھڑوں کے ساتھ موجود تھیں۔ لیفٹیننٹ جنرل کارسلاک کو مجبوراً زخمی جانوروں کو گولی مارنا پڑی۔

زلزلے کی آمد کے بعد پہلے دو دنوں میں جب شہر میں ہر شے درہم برہم تھی کچھ قبائلی نوجوان اس

غرض سے کوئٹہ میں آدھمکے کہ ملبے اور اینٹوں کے ڈھیروں تلے ہزاروں روپے اور دیگر قیمتی
ہوئیں تھیں۔ اس زمانے تک کوئٹہ کے لوگ بینکوں میں روپیہ جمع کرانے کی بجائے اپنے بستروں
اور صندوقوں میں روپیہ پیسہ رکھتے تھے اور اس راز سے قبائلی لوگ بخوبی آگاہ تھے۔ اس صورتحال
کے لیے شہر میں مارشل لاء لگا دیا گیا جو پاکستان کے اس علاقے کی تاریخ کا پہلا مارشل تھا۔ مارشل
قوانین کے مطابق لٹیروں کو دیکھتے ہی گولی ماری جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ کوئٹہ میں کئی مقامات
دستے متعین کر دیئے گئے، تاکہ چوروں اور لٹیروں سے بچاؤ کیا جاسکے۔

12 جون تک کوئٹہ سے تمام برطانوی خواتین اور بچے اور ہزاروں کی تعداد میں بے گھر شہری
تقریباً دس ہزار زخمیوں کے ساتھ محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا گیا، ان میں سے کچھ کو ہوائی جہاز سے
بقایا کو ریل گاڑی کے ذریعے کوئٹہ سے نکالا گیا۔

گذشتہ واقعات پر نظر رکھتے ہوئے کوئٹہ میں آنے والا 1935 کا ہولناک زلزلہ برطانوی ہندوستان
کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی زلزلے کے بعد کی جانے والی تعمیرات کو پہلی بار
زلزلہ پروف رکھا جانے لگا تھا اور تعمیرات میں کنکریٹ کو اہمیت دی جانے لگی تھی۔ اس کے علاوہ کوئٹہ
زلزلے بعد ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی زلزلوں کے نقصانات بچنے کے لیے حفاظتی اقدامات
جانے لگے تھے۔

1937ء نانکنگ کا قتل عام

13 دسمبر 1937ء کو جاپانی فوج چین پر حملے کے بعد بین الاقوامی معاہدات امن کو پامال کرتے ہوئے اس وقت کے چین کے دارالحکومت نانکنگ میں داخل ہوگئی۔ اور اس نے شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ چین کے فوجی جنہوں نے ہتھیار نہ ڈالے انہیں یا تو گولی مار دی گئی یا بندوقوں کی سنگینوں سے ذبح کر دیا گیا۔ شہر میں لوگوں کے گھروں کو جاپانی فوج نے اپنے بڑے افسروں کی موجودگی میں لوٹا اور خواتین کی عزتوں سے کھیلتی رہی۔ نانکنگ پر جاپانیوں کا حملہ اتنا بے رحمانہ تھا کہ اس حملے میں ہونے والے قتل عام کو بیسویں صدی کے بڑے حادثات میں شمار کیا جاتا ہے۔

جنگ عظیم دوم کے آغاز سے پہلے جاپان براعظم ایشیا میں اپنی ایک عظیم سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا آغاز اس نے 1931 میں چین کے علاقے منچوریا پر حملے سے کیا تھا۔ اگلے سال جاپانیوں نے چین کے ایک بڑے شہر شنگھائی پر بم برسائے اور ہزاروں بے گناہ شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس پر پوری دنیا میں جاپان کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ اگست 1937ء میں جاپان نے شنگھائی پر قبضہ کرلیا۔ شنگھائی کے ایک مضافاتی علاقے میں جس کی آبادی ایک لاکھ افراد تھی۔ ایک برطانوی صحافی کے بیان کے مطابق اس علاقے میں کوئی ایسی عمارت نہیں بچی تھی جس کو آگ نہ لگائی گئی ہو۔ اس برطانوی صحافی نے اس علاقے میں صرف پانچ ضعیف العمر لوگوں کو زندہ دیکھا تھا جو ایک گرجا کے صحن میں پناہ لئے ہوئے تھے اس کے علاوہ اس علاقے میں انسانی لاشوں پر پلے ہوئے موٹے تازے کتے گھومتے ہوئے اس نے دیکھے تھے۔ کئی دوسرے چینی شہروں بشمول نانکنگ پر شدید بمباری کی گئی جس چینی شہر یا قصبے میں جاپانی داخل ہوئے وہاں کے باشندوں سے انہوں نے انتہائی وحشیانہ سلوک روا رکھا، جبکہ پسپا ہوتی ہوئی چینی فوج نے کھیتوں اور کھلیانوں کو آگ لگا دی تاکہ جاپانیوں کو کھانے کی کوئی چیز نہ مل سکے مگر اس سے خود چینی عوام زیادہ متاثر ہوئی اور لاکھوں افراد بھوکوں مر گئے، 19 نومبر 1937ء کو جاپانیوں نے قدیم چینی شہر سچاؤ Suchou پر قبضہ کر لیا۔ سچاؤ کو چین کا وینس بھی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ اس شہر میں نہروں کا جال بچھا ہوا تھا اور ان نہروں پر وینس کے پلوں کی طرح کئی خوبصورت پل تعمیر کئے گئے تھے۔ کئی دن تک جاپانی اس شہر میں لوٹ مار کرتے رہے ۔ ہزاروں خواتین کی عصمت دری کرکے انہیں قتل کر دیا گیا۔ ''چائنا

ویکلی ریویو' نامی ہفتہ وار میگزین کے مطابق اس شہر کی آبادی ساڑھے تین لاکھ افراد سے کم ہو کر
500 افراد رہ گئی۔ پھر جیسے ہی جاپانی افواج قوم پرست چین کے دارالحکومت نانکنگ کے قریب
انہوں نے راستے میں نظر آنے والے ہر ذی روح کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

9 دسمبر کو جاپانی ہوائی جہازوں نے نانکنگ میں پمفلٹ پھینکے جن میں لکھا ہوا تھا کہ چینی
جاپانیوں کے خلاف مزاحمت کرے گا جاپانی اس پر کسی طور رحم نہیں کریں گے اور انتہائی سختی سے پیش آئیں
گے جبکہ معصوم شہریوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور نہ جاپانی ان چینی فوجیوں پر کوئی سختی کریں گے
جو ہتھیار ڈال دیں گے اور شہر کو ان کے حوالے کر دیں گے۔ تاہم چینی فوج یا عوام نے جاپانیوں کے اس
پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی وہ شہر کو جاپانیوں کو حوالے کرنے کے لیے شہر سے باہر نکلے۔ اس پر
تلملا کر جاپانیوں نے دو دن تک شہر پر فضائی بمباری کی اور توپوں سے بھی گولے برسائے۔ اس پر بہت
سے چینی فوجی شہر کو چھوڑ کر بھاگ گئے جاپانیوں کے لئے یہ بڑا شرمناک اقدام تھا۔ جب جاپانی 13 دسمبر
1937ء کو شہر میں داخل ہوئے تو قوم پرست راہنما چیانگ کائی شیک اور نانکنگ گورنمنٹ شہر چھوڑ کر جا
جا چکے تھے۔ شہر میں 7 لاکھ افراد بشمول ڈیڑھ لاکھ فوجیوں کے موجود تھے جن میں بہت سپاہیوں نے شہری
دوکانوں سے چرا کر شہری لباس پہن رکھا تھا۔ نانکنگ پر حملہ کرنے والا جاپانی کمانڈر جنرل میتھیو
Matsui اگرچہ ٹی بی کے مرض میں مبتلا اپنے بستر پر دراز تھا تاہم اس نے اپنے نائب کو اپنے بستر پر بلایا
اور حکم دیا کہ جاپانی افواج کا چینی مفتوحین سے سلوک دنیا دیکھے گی اس لیے کوئی جاپانی سپاہی غیر منظمانہ
طور پر شہر میں داخل نہ ہو۔ انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ فوجی دستوں کو شہر میں داخل کرو اور اس کے بعد شہر کی
بری طرح لوٹو اور نذر آتش کر دو۔ ہر چینی کو اس کے کیے کی بھرپور سزا دو۔

جاپانیوں کے مظالم کے متعلق دنیا کو شاید بہت کم علم ہوتا کیونکہ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ نے اتنی
ترقی نہیں کی تھی تاہم نانکنگ میں موجود غیر ملکیوں نے نانکنگ میں جاپانیوں کے کیے گئے قتل عام کی
تفصیلات دنیا کو مہیا کر دیں۔ اگر جاپانیوں کا شہر میں قتل عام کرنے کا منصوبہ نہیں تھا تو پھر وہ شاید کسی طور
انتقامی جذبات سے مغلوب ہو گئے۔ جیسے ہی جاپانی شہر میں داخل ہوئے کچھ چینیوں نے جاپانی جھنڈا لہرا کر
اور خوشی کا اظہار کیا اور یہ یقین کر لیا کہ ان کی حکومت خود چینیوں کو چھوڑ کر فرار ہو گئی ہے تاہم حملہ آور
فوجیوں نے اچانک نہتے چینی عوام پر اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اور معمر خواتین اور معصوم
بچوں کو بھی نہ چھوڑا اور بھاگتے ہوئے ان کی پشت میں گولیاں ماری یہاں تک کہ نانکنگ کی گلیاں اور
شاہراہیں معصوم شہریوں کے خون سے سرخ ہو گئیں۔ پھر چینی مغرور فوجیوں کی تلاش میں جاپانی فوج نے
گھر گھر تلاشی لینا شروع کی تو اور زیادہ منضبط انداز میں لوگوں کو قتل کرنے لگے انہوں نے شہر کے

بازاروں میں چینی دوکانداروں کو دوکانیں کھولنے کا حکم دیا اور پھر انہیں گولیاں مار کر دوکانیں لوٹ لیں جس شے کی جاپانیوں کو ضرورت نہیں تھی اس کو بے دریغ نذر آتش کر دیا گیا۔ اگلے مرحلے میں جاپانیوں نے گرفتار کیے ہوئے تمام چینی جنگی قیدیوں کا قتل عام کیا۔ نہ صرف انہیں مشین گنوں سے نشانہ بنایا گیا، پٹرول چھڑک کر نذرِ آتش کیا گیا اور سنگینوں سے ذبح کر دیا گیا بہت سے جاپانی افسروں کا خیال تھا کہ چینی بے یارومددگار قیدیوں کو سنگینوں سے چھیدنے سے ان کے سپاہیوں کو تقویت ملتی ہے۔ ایک جاپانی سپاہی جس نے اپنی تلوار سے ایک چینی قیدی کو قتل کر دیا تھا اس کا کہنا تھا کہ جیسے ہی اس نے اپنی تلوار سے اس چینی قیدی کا کام تمام کیا نہ جانے کہاں سے اس کے بازوؤں میں قوت بھر آئی تھی۔ قیدیوں کے قتل عام کے ایک چشم دید گواہ کے مطابق قیدیوں کو قطاروں میں کھڑا کیا گیا پھر پہلی قطار والے قیدیوں کی گردنیں مار دی گئیں اور دوسری قطار میں کھڑے قیدیوں کو پہلے مجبور کیا گیا کہ وہ پہلی قطار کے مردہ لوگوں کی لاشیں دریا برد کر کے پھر قطار میں کھڑے ہوں جس کے بعد ان کی گردنیں بھی مار دیں گئیں اور تیسری قطار والوں سے ان کی لاشیں دریا برد کرائیں گئیں۔ یہ سلسلہ صبح سے رات تک بغیر رکے چلتا رہا مگر اس کے باوجود جاپانی صرف 2000 چینوں کو قتل کر سکے۔ دوسرے دن تلواروں سے گردن مارنے کے طریقے سے اکتا کر جاپانیوں نے مشین گن استعمال کیں جس کے بعد موقع پر موجود جاپانی افسران نے اس طریقے سے قتل کیے گئے لوگوں کی تعداد 20000 بتائی تھی۔

ایک جاپانی اخبار رپورٹر کے مطابق اس نے 100 چینی نوجوانوں کو لاشوں کے انبار سے لاشیں دریائے یانگٹز میں پھینکتے ہوئے دیکھا ان لاشوں کے انباروں میں زندہ لوگ بھی تھے جو کراہ رہے تھے مگر ان کو بھی لاشوں کے ساتھ دریا میں پھینک دیا گیا۔ جیسے یہ 100 چینی نوجوان لاشوں کو ٹھکانے لگا چکے تو پھر انہیں بھی قطار بنوا کر مشین گنوں سے شوٹ کر دیا گیا اور ان کے لاشے اٹھانے کے لیے ان کی جگہ مزید چینی قیدیوں کو بلا کر لایا گیا۔ جاپانی افسران چینی قیدیوں کو قتل کرنے کے نئے نئے اسلوب تلاش کرتے رہتے تھے۔ چینیوں کو نہ صرف زندہ دفن کیا گیا، زندہ بھونا گیا اور ان کے اعضا کاٹ کر بھی قتل کیا گیا؛ زبانوں میں ہک ڈال کر لٹکایا گیا اور آدھے زمین میں گاڑ کر ان کو کتوں سے چروایا گیا۔ اکثر ان ظالمانہ قتلوں کی تصویریں بھی کھینچی گئیں اور ان کے پکچر پوسٹ کارڈ بنوا کر جاپانی فوجیوں کے گھروں میں بھجوا دیئے گئے۔

ہزاروں بچوں کو قتل کیا گیا۔ چین میں متعین ایک امریکی سرجن نے اپنے گھر والوں کو خط میں لکھا کہ جاپانی فوجی اکثر کم سن چینی بچوں کو اپنی سنگینیوں کا نشانہ بناتے اور ان کے زخم سینے کے لیے میرے پاس بھجوا دیتے تھے۔ میں ابھی ایک چینی بچے کے زخم سی رہا ہوتا کہ دوسرا سنگینوں سے زخمی کیا گیا بچہ

میرے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض بچوں کے سنگینوں سے پیٹ چاک بھی کر دیئے جاتے تھے
ایک آٹھ سالہ چینی بچی نے اپنے والدین اور اپنے بڑے بھائی بہنوں کو مشین گن سے شوٹ کئے جاتے
ہوئے دیکھا پھر اسے بھی سنگین گھونپ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا مگر وہ زندہ بچ گئی۔ چینیوں کو بھی
بکریوں کی طرح ہانک کر گڑھوں کے کناروں پر لے جایا جاتا جن میں پہلے بھی لاشیں بھری ہوتی تھیں۔
ایک چینی نوجوان نے ایسے ایک گڑھے میں چھلانگ لگانا چاہی مگر دیکھا کہ جاپانیوں کے کتے لاشوں کو
بھنبھوڑ رہے تھے۔ گڑھے کے کناروں پر کھڑا کر کے چینی قیدیوں کے سر اڑا دیے جاتے تھے یا پھر انہیں
گولیوں سے بھون دیا جاتا تھا۔ ایک جاپانی سپاہی نے ایک حاملہ چینی عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا تو
اس چینی عورت نے مزاحمت کی جس کی سزا کے طور پر اس عورت کے پیٹ میں سنگین گھونپ دی گئی۔

ایک جاپانی نامہ نگار نے لکھا کہ اس طرح کی ظالمانہ کاروائیاں جاپانی فوجیوں کے لیے باعث شرم
نہیں تھیں بلکہ ان کے نزدیک یہ وہ سلوک تھا جو ہر فاتح قوم اپنی مفتوح قوم کے ساتھ روا رکھتی ہے۔

17 دسمبر کو جب جاپانی جنرل میٹسوئی نانکنگ پہنچا تو اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ چینیوں کے ساتھ
ہونے والے ان مظالم سے آگاہ نہیں تھا۔ اس نے انتہائی جذباتی انداز میں 20 لاکھ چینی مقتولین سے
ہمدردی ظاہر کی اور نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار کو بتایا کہ اس وقت جاپانی فوج دنیا بھر کی بے نظم ترین فوج
ہے ایک جاپانی ہلاک ہونے والے فوجی کی تدفین پر جنرل میسٹوئی نے کھلے عام تین سو سے زائد فوجی
افسروں کو جھڑکا۔ اس جاپانی جنرل کو جنگ عظیم دوم کے بعد انسانیت کے خلاف کئے جانے والے
اقدامات کی سزا کے طور پر 1948ء میں پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔

1939-45..... جنگ عظیم دوم کے مصائب

یکم نومبر 1911 کو ایک اطالوی لیفٹننٹ گیلیو کاووٹی Gaulio cavotti نے اپنے مونوپلین ہوائی جہاز سے طرابلس، لیبیا کے قریب واقع ایک صحرائی نخلستان، تیجورا کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے ایک ہینڈ گرنیڈ نیچے گرایا یہ دنیا کا پہلا بم تھا جو کسی ہوائی جہاز سے پہلی مرتبہ گرایا گیا تھا۔ اطالوی لیبیا میں عثمانیہ سلطنت کی افریقہ میں آخری چوکی فتح کرنا چاہتے تھے اور انہیں ان کی سوچ سے زیادہ سخت مزاحمت کا سامنا تھا تو انہوں نے پہلا فضائی حملہ کیا تھا۔ اگلے تیس سال میں فضائی حملے بے گناہ شہریوں کو قتل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئے پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور جرمنی نے ایک دوسرے کے شہروں پر فضائی حملوں کے دوران ہزاروں ٹن بم برسائے تاہم برطانیہ میں جرمنی کے فضائی حملوں سے صرف 1400 افراد ہلاک ہوئے۔ اس کے کچھ سال بعد برطانیہ کے آگ کی روک تھام کرنے والے شعبے کی ایک کمیٹی نے دنیا کو متنبہ کیا کہ دنیا میں آئندہ لڑی جانے والی جنگ میں شہروں پر بغیر کسی انتباہ کے بم باری کی جائے گی اور مستقبل کے یہ فضائی حملے ماضی میں کیے گئے فضائی حملوں سے کہیں زیادہ ہولناک ہوں گے اس کے بعد سپین میں ہونے والی خانہ جنگی کے دوران فضائی حملوں کی اس ہولنا کی کی پہلی جھلک نظر آئی۔ 26 اپریل 1937ء کو سپین کے صوبے باسک Basque کے ایک قصبے گوئرنیکا Guernica پر جنرل فرانکو کی قوم پرست حکومت کے اتحادیوں، جرمنی اور اٹلی کے طیاروں نے خوفناک بمباری کی جس کے نتیجے میں ایک لاکھ آبادی کے اس قصبے کے 1500 نفوس جاں بحق ہوگئے۔

پھر اس دن جب ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کیا۔ 40 جرمن طیاروں نے پولینڈ کے دارالحکومت وارسا پر شدید بمباری کی جس میں تقریباً 100 شہری ہلاک ہوگئے۔ ایک پولش کم سن لڑکے کو اس کے والد نے فضائی حملوں سے بچانے کے لیے ایک چھوٹے سے گاؤں میں وارسا سے باہر منتقل کر دیا مگر جلدی ہی طیاروں کی گھن گرج وہاں بھی سنائی دینے لگی۔ اور جرمن طیاروں نے اس گاؤں پر آتش افروز بم برسانے شروع کر دیئے۔ صرف چند لمحوں کے بعد یہ خوبصورت گاؤں آگ کے شعلوں میں گھر گیا۔ اس گاؤں کے لوگ اپنے کپڑوں میں آگ لگ جانے کے بعد گاؤں سے باہر ایک جنگل میں پناہ لینے کے لیے بھاگے مگر مشاق نشانہ باز ہوا بازوں نے اپنے طیاروں کی مشین گنوں سے فائر کر کے راستے ہی میں ڈھیر

کر دیا۔ 4 ستمبر 1939ء کو برطانیہ کے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کے اگلے دن رائل ایئر فورس کے طیاروں نے نہر کیل Kiil سے گذرتے ہوئے ایک جرمن جنگی بحری جہاز پر بمباری کی۔ اس بمباری کے دوران 4 بم ڈنمارک کے قصبے Esbjerg پر گرے جو نہر سے ایک سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس بمباری میں شہری کی جان لے گئے۔ جنگ عظیم دوم کے آغاز میں برطانیہ کے وزیر خزانہ نے فوجی نشانوں پر بمباری کرنے والے طیاروں کی بمباری کی مخالفت کی اور شہروں اور قصبوں پر بم باری کو انسانیت سوز قرار دیا اور کہا کہ اس سے بہت سے بے گناہ بچے اور عورتیں ہلاک ہو جائیں گے مگر دونوں ملک فضائی جنگ کے جنون میں مبتلا تھے اس لیے فضائی بمباری معصوم شہریوں کے مالی جانی نقصان کا سبب بن گئی۔ جنگ عظیم دوم میں اولین شہری اموات 30 اپریل 1940ء کو اس وقت واقع ہوئیں جب ایک جرمن طیارہ جو بارودی سرنگیں گرا رہا تھا خود گر کر تباہ ہوگیا۔ اس طیارے کے گرنے سے کلیکٹن اون سی Clacton-on-sea میں دو شہری ہلاک ہوگئے اس کے دس دن بعد دس برطانوی بمبار طیاروں نے جرمنی کے شہر MOENCHENGLADBACH پر بمباری کی جس سے چار شہری مارے گئے جن میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ جب ہٹلر نے غیر وابستہ ملک ہالینڈ پر بمباری کرائی تو اسے توقع سے زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے 14 مئی کو جرمن ایئر فورس لفت واف Luftwaffe کو رائن ایٹ روٹرڈیم پر بم برسانے کا حکم دیا۔ جرمن طیاروں سے برسائے گئے بہت سے بم نشانے سے چوک کر شہر کے مرکز میں جا گرے پورے ایک مربع میل کے علاقے کو زمین بوس کرنے کا سبب بن گئے۔ اس اتفاقیہ بمباری میں 800 شہری مارے گئے۔ جرمن طیارے مسلسل بیلجیم میں واقع مہاجر کیمپوں پر بم برساتے تھے۔ ایک آدمی جو ان فضائی حملوں کے خطرے سے بچنے کے لیے اپنے بچوں سمیت فرار ہوگیا تھا اس کے بچوں کی آنکھوں کے عین سامنے بمباری سے کئی اور بچوں کے چیتھڑے اڑ گئے پھر ہوائی جہاز مسلسل منڈلا منڈلا کر اپنی مشین گنوں سے زمین پر موجود ہر ذی روح کو نشانہ بنانے لگے مگر بہت کم ہلاکتیں واقع ہوئیں۔ مگر اسی رات 130 برطانوی بمبار طیاروں نے ہیمبرگ جرمنی میں تیل صاف کرنے کے کارخانوں اور ریلوے یارڈز پر بم برسائے اور ہیمبرگ کے مرکزی شہری علاقوں کو بھی نہ چھوڑا۔ اس برطانوی بمباری سے 34 شہری ہلاک ہوگئے۔ ہٹلر نے اس برطانوی بمباری کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کا حکم دیا تو اگست کے وسط تک لفت واف کی بمباریوں سے 700 برطانوی شہری ہلاک ہوگئے۔ اب چرچل نے رائل ایئر فورس کو جرمنی پر بے دریغ بم برسانے کا حکم جاری کر دیا کہ اس کے نزدیک جرمنی کو فتح کرنے کا یہی ایک واحد راستہ تھا۔ مگر اس طریقے پر عمل کرنے سے ہزاروں بے گناہ انسان مارے گئے۔

24 اگست کی رات کو دو جرمن طیاروں نے لندن شہر پر بم گرائے جس سے نو شہری ہلاک ہوئے۔ یہ

ہمارے لندن میں تیل کے ذخیروں پر بم برسانے کے لیے آئے تھے مگر چوک گئے اور انہوں نے شہری علاقوں کو نشانہ بنا دیا۔ اس کے جواب میں چرچل نے برلن پر فضائی حملوں کی ایک پوری سیریز کا حکم دیدیا۔ تاہم ان فضائی حملوں سے بہت کم جانی نقصان ہوا۔ صرف ایک فضائی حملے سے ایک ریلوے سٹیشن کے قریب 10 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ 4 ستمبر کو ہٹلر نے برطانوی فضائی حملوں کا خوفناک انتقام لینے کی دھمکی دی اور اس کو صرف تین دن بعد پورا کر دکھایا۔ لندن دنیا کا واحد شہر تھا جس پر 350 جرمن بمبار طیاروں نے حملہ کیا ان کی مدد کے لیے 600 فائٹر طیارے بھی ساتھ تھے۔ ایک خوبصورت دوپہر کے بعد 4 بجے سہ پہر لندن میں فضائی حملے کے سائرن بجنے لگے۔ منظم جرمن طیاروں نے جلد ہی لندن کو شعلوں میں نہلا کر رکھ دیا۔ لندن کا فائر ڈیپارٹمنٹ آگ بجھا بجھا کر پاگل ہوگیا۔ اس جرمن فضائی حملے میں 430 لوگ مارے گئے اور 1600 سے زائد زخمی ہوئے۔ اس وجہ سے یہ لندن کی تاریخ میں سیاہ ہفتہ Black satureday کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جرمنوں کے Blitz حملوں کا آغاز تھا۔ اگلے دو دنوں میں جرمن بمباروں نے برطانوی دارالحکومت کے اتنے شہریوں کو ہلاک کر دیا جتنے جنگ عظیم اول میں کل لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ اگلی 76 راتوں تک مسلسل جرمن ہوا باز لندن کی گلیوں شاہراہوں اور عمارتوں پر بمباری کرتے رہے۔ ان 76 راتوں میں صرف ایک رات پر امن گذری تھی کیونکہ اس دن لندن میں مطلع ابر آلود تھا اور موسم انتہائی خراب۔

اکتوبر 1940 کے آخر تک برطانیہ کے 6400 شہری جرمن فضائی حملوں میں لندن کے علاوہ دوسرے شہروں سمیت ہلاک ہو چکے تھے۔ اب تک RAF کے کئے گئے جرمنی پر فضائی حملے کم ہلاکت خیز رہے تھے تاہم 9 ستمبر کی رات کو برطانوی طیاروں سے گرائے جانے والا ایک بم گوئبلز کی رہائش گاہ کے باغ میں گرا اور نومبر میں میونخ کے ایک ہال میں ہٹلر کو تقریر کرنے کا پروگرام برطانوی فضائی حملے سے بچنے کے لیے تبدیل کرنا پڑا۔ اس کے جواب میں ہٹلر نے 14 نومبر کو Coventry پر ایک وحشیانہ فضائی حملہ کروایا اور اس برطانوی تاریخی شہر کا ایک سو ایکڑ رقبہ تباہ و برباد کر دیا اور 554 شہری ہلاک کر دیئے۔ اس جنگ میں انسانی جانوں کا بھاری اتلاف اس وقت ہوا جب بمباری سے آگ کا ایک طوفان اٹھ آیا اور آتشی ہوا 150 میل فی گھنٹہ سے چلنے لگی۔ کوونٹری میں جنگی صنعتوں کو بھی بھاری نقصان پہنچا۔ مورس انجن فیکٹری کی چھت اس فضائی حملے میں اڑ گئی ہیں مگر برطانوی مزدوروں نے بلا چھت کی اس فیکٹری میں بھی کام جاری رکھا۔

1942 تک 15000 برطانوی شہری ہلاک ہو چکے تھے جبکہ رائل ایرفورس کے حملوں سے 1000 جرمن ہلاک ہوئے تھے۔ کوونٹری پر حملے کے جواب میں برطانوی فضائیہ نے جرمنی کے شہر ہیمبرگ پر حملہ

کیا اور 233 شہریوں کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد ہٹلر نے لندن پر مزید خوفناک فضائی حملے شروع کر دیئے۔ اور برطانوی دارالعلوام کی عمارت کو بھی شدید نقصان پہنچایا اور 1400 افراد ہلاک کر دیئے۔ جنگ عظیم دوم کے آخری سالوں میں جرمنوں نے دو نئے جنگی ہتھیار متعارف کرائے تھے۔ ان میں سے ایک VI میزائل تھا اور دوسرا V2 تھا۔ انہیں اس زمانے میں فلائنگ بم کا نام دیا گیا تھا۔ یہ کروز میزائلوں کی اولین شکل تھی۔ ان فلائنگ بموں سے جون 1944 میں ڈی دے کے بعد لندن پر حملہ کیا گیا۔ VI بموں کے حملے میں 119 افراد اتوار کے دن گرجا گھر میں مذہبی عبادات میں مصروف مارے گئے۔ ایک زندہ بچنے والے کے مطابق اس بم کے گرنے سے پہلے شدید شور اور گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر اس بم کے لگنے سے پورے گرجا گھر کی عمارت زمین بوس ہوگئی۔ اگست 1944 کے وسط تک VI کے حملوں میں 2000 سے زائد برطانوی شہری ہلاک ہو چکے تھے۔ ستمبر میں V2 فلائنگ بموں کے حملے شروع ہوگئے۔ V2 راکٹ VI سے دوگنی رفتار پر پرواز کرتا تھا۔ نومبر میں جنوبی لندن پر V2 کے ایک حملے میں 168 افراد ٹائم شاپنگ کرتے ہوئے مارے گئے یہ نیا ہتھیار جرمنی نے بلجیم کے خلاف بھی استعمال کیا اور تباہی پھیلائی بیلجیئم کے شہر اینٹورپ میں ایک سینما گھر پر یہ راکٹ گرنے سے 567 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ یہ فضائی حملے جنگ عظیم دوم کے مصائب کا صرف پہلو تھے مورخین کے مطابق جنگ عظیم دوم انسان کے پیدا کردہ جنگی مصائب میں سب سے بڑی مصیبت تھی۔ اس جنگ میں ہلاک ہونے والے شہریوں کی تعداد نوکروڑ افراد سے زائد ہے۔ روس، چین، پولینڈ، جرمنی، جاپان اور برطانیہ سبھی ممالک کو اس جنگ سے بھاری جانی و مالی نقصان پہنچا تھا۔

1944 ..... سان جوآن، ارجنٹینا، میں قیامت خیز زلزلہ

15 جنوری 1945 کو ارجینٹنا کے شہر سان جوآن میں ایک قیامت خیز زلزلہ آیا۔ ریکٹر اسکیل پر یہ 7.8 درجہ کا زلزلہ تھا۔ اس زلزلے اس شہر کے بڑے حصے کو تباہ کر دیا اور 10000 افراد اس قدرتی آفت میں ہلاک ہوگئے جو اس وقت شہر کی آبادی کا دسواں حصہ تھے۔ اس زلزلے کو ارجنٹائن کی تاریخ کی سب سے بڑی قدرتی آفت قرار دیا جاتا ہے۔ سان جوان San juan ایک پہاڑی علاقے میں واقع ہے۔ جو ارجنٹینا کے مغرب میں ہے۔ یہی علاقہ پورے جنوبی امریکہ کا سب سے زیادہ زلزلوں کی آمد کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ 15 جنوری کے زلزلے کا مرکز سان جوان شہر سے تقریباً 20 میل شمال میں واقع تھا۔ اسی وجہ سے زلزلہ بہت شدید تھا۔ اس زلزلے میں اس شہر کی 90 فی عمارات زمین بوس ہوگئیں تھیں یہ شاید شہر کی تعمیرات کے معیاری نہ ہونے کی وجہ سے بھی ہوا تھا۔ زلزلے کی آمد کے بعد ایک طویل بحث ہوئی کہ کیا اس شہر کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کیا جانا ضروری ہے؟ تاہم آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہر کے اسی مقام پر محفوظ عمارتیں تعمیر کیا جانا ضروری ہیں جو زلزلوں کی شدت کو برداشت کرسکیں۔

زلزلے کی آمد سے پہلے سان جوان میں بہت سے گھر کچی اینٹوں سے تعمیر شدہ تھے۔ زلزلے کے بعد دوبارہ تعمیر کی جانے والی عمارات کی تعمیر میں زلزلوں سے محفوظ رکھنے کے اصولوں کو مدنظر رکھا گیا۔ ان اصولوں میں سے ایک یہ تھا کہ پختہ اینٹوں کے ساتھ عمارات کی تعمیر میں نہ صرف کنکریٹ کا استعمال بھی ہو اور یہ کہ وہ صرف یک منزلہ عمارات ہوں۔ اس کے علاوہ شہر کی گلیاں اور شاہراہیں کشادہ رکھا جانا بھی لازم تھا۔ تعمیر نو کے آغاز میں بے گھر افراد کے لیے ایمرجنسی طور پر گھر تعمیر کیے گئے۔ ان کی تعمیر کے اخراجات ارجنٹائن کی حکومت نے برداشت کیے تھے۔ یہ وسیع پیمانے پر تعمیرات کا ارجنٹینا پہلا سرکاری تعمیراتی منصوبہ تھا۔ زلزلے کی وجہ سے سان جوان میں آباد بہت سے خاندان بکھر کر رہ گئے تھے اور بہت سے بچے یتیم ہوگئے تھے ان سب کو دوبارہ آباد کرنا سان جوان کے حکام کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا تھا کہ سان جوان ارجنٹینا کے ایسے خطے میں واقع ہے کہ جو زلزلوں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں ہر پچاس کے بعد ایک بڑا زلزلہ ضرور آتا ہے۔ اسی وجہ سے 1944ء کے اس زلزلے کے بعد تعمیرات میں ہر قسم کی احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں اور انہیں زلزلہ پروف بنایا گیا۔ 2006 کے سروے کے مطابق سان جوان کی آبادی 4 لاکھ تھی۔

1944ء..... کلیو لینڈ، اوہیو میں قدرتی گیس کا دھماکہ

1944ء وہ سال تھا جب دوسری جنگ عظیم اختتام پذیر تھی۔ اور اسوقت کا میڈیا اپنی پوری توجہ یورپ اور جاپان سے آنے والی خبروں کی طرف کئے ہوئے تھا۔ امریکی ریاست کلیولینڈ اوہیو میں قدرتی گیس کو مائع بنانے کے ایک پلانٹ میں ایک بڑا دھماکہ ہوا مگر اس دھماکہ کو ذرائع ابلاغ نے نظر انداز کر دیا کیونکہ یہ تباہ کن دھماکہ تھا اور اس دھماکے میں 135 افراد جاں بحق اور ایک سو سے زائد زخمی ہوگئے۔ اس زمانے میں قدرتی گیس کو مائع میں تبدیل کرنا ایک بالکل نئی چیز تھی، کلیو لینڈ میں مائع بنانے کا یہ امریکہ میں صرف دوسرا پلانٹ نصب تھا جو تجارتی پیمانے پر مائع گیس پیدا کرتا تھا۔

مائع قدرتی گیس LNG دراصل میتھین Methane گیس ہوتی ہے۔ یہ گھروں میں ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ایک مقبول عام مائع گیس ہے جو بے بو، بے رنگ، اور بے ضرر ہے، یہ عام طور پر گیس کی شکل میں استعمال کی جاتی ہے جبکہ اس کو محفوظ مائع شکل میں کمپیکٹ کر کے کیا جاتا ہے LNG زمین میں مدفون چھوٹے پودوں اور سمندری جانداروں سے پیدا ہوتی ہے جو 2 کروڑ سال پہلے مرکز زمین کی پرتوں میں آگئے تھے۔ یہ تمام اشیاء رکاز کی شکل کی پرتوں میں دب کر قدرتی گیس کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اسی وجہ سے قدرتی گیس زمین سے پٹرولیم ہی کی طرح کنویں کھود کر نکالی جاتی ہے۔ مائع پروفین گیس بھی زمین کی پرتوں میں دبی ہوئی رکاز کی شکل کی اشیا سے ہی بنتی ہے اسے LPG کہا جاتا ہے۔ اس کو بھی مائع شکل میں محفوظ کر کے آج کل استعمال کیا جارہا ہے۔ LPG کو قدرتی گیس کی چچا زاد بہن بھی کہا جاتا ہے یہ قدرتی گیس اور پٹرولیم کے ساتھ ملی جلی شکل میں ملتی ہے۔

کلیولینڈ، اوہیو میں 1941ء میں جو مائع گیس بنانے کا پلانٹ نصب کیا گیا تھا یہ اپنی ساخت کے امریکہ میں دوسرا پلانٹ تھا۔ چونکہ ابھی اس کو نصب کئے ہوئے صرف تین سال گذرے تھے اس لیے اس کے خطرناک پہلوؤں سے تمام انسان ابھی ناواقف تھا۔ 1944ء میں بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کلیو لینڈ پلانٹ میں ایک نیا پلانٹ نصب کیا گیا تھا۔ چونکہ یہ جنگ کا زمانہ تھا اس لیے قدرتی گیس ذخیرہ کرنے کے اس ٹینک کو تیار کرنے کے لیے فولاد دستیاب نہیں تھا اس لیے یہ ٹینک ایک دھاتی آمیز سے تیار کیا گیا تھا یہ متبادل دھاتی آمیزہ مائع گیس کو ذخیرہ کرنے کے مقاصد میں پورا نہیں اترا اور

جلد ہی یہ ٹینک لیکیج کا شکار ہوگیا اور اس سے سرد تر گیس خارج ہونے لگی جس سے کلیولینڈ کے مشرقی علاقے میں ایک دھند سی پھیل گئی تاہم اس علاقے کے مکین اور سرکاری حکام اس خطرناک صورتحال کے خطرات سے ناواقف اور بے خبر تھے۔ جب LNG ہوا میں پھیلتی ہے تو ایک ٹائم بم کی صورت پیدا ہو جاتی ہے جو کسی بھی وقت چھوٹی سی چنگاری سے پھٹ سکتا ہے۔ پھر کلیولینڈ کے مشرقی علاقے میں پھیلی ہوئی اس گیس کا ملاپ ایک چھوٹی سی چنگاری سے ہوگیا جس کے نتیجے میں ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا جو امریکہ کی تاریخ میں LNG گیس سے ہونے والا اولین دھماکہ تھا۔

ٹینک کی مرمت کے لیے اگرچہ ہنگامی طور پر ورکر بھی بلائے گئے مگر متبادل ٹینک نہ ہونے کی وجہ سے LNG کو دوسری محفوظ جگہ منتقل نہیں کیا جاسکا تمام ٹینک موسم سرما کی آمد کی وجہ سے منہ تک بھرے ہوئے تھے، گیس کو کسی اور ٹینک میں منتقل کرنے کی بجائے دوسری راستہ اس کی مرمت کرنا تھا۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اگلے ہی لمحے کیا ہونے والا ہے کیونکہ دھماکے کے بعد تمام اوزار و سامان اور تمام آدمی غائب ہوگئے۔ شاید اس مرمت کرنے کی وجہ سے یا شاید کسی اور طرح ایک چنگاری پھوٹی اور اگلے ہی لمحے بڑے پیمانے پر شعلہ زن ہوئی۔ اس گیس پلانٹ سے ایک بلاک دور واقع ایک گھر میں بھی شدید آگ بھڑک اٹھی اور اہل خانہ بڑی مشکل سے جان بچا کر اس گھر سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ اس آبادی کے تمام گھروں سے جب لوگ باہر نکلے تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آگ کا دریا ان کی طرف بڑھ رہا ہے اور شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔

پھر دھماکوں کا ایک سلسلہ چین ری ایکشن کی طرح شروع ہوگیا کیونکہ ایک ٹینک کے بعد دوسرا ٹینک پھٹنے لگا تھا۔ یہ ٹینک آگ سے پیدا ہو جانے والی حدت کی تاب نہ لاتے ہوئے طاقتور بموں کی طرح پھٹ رہے تھے۔ گیس پلانٹ کے اردگرد کے چند بلاکوں میں ہر عمارت ان دھماکوں سے زمین بوس ہوگئی اور زیر زمین بچھائے گئے گیس پائپ بھی پھٹ گئے۔ شاہراہوں اور گلیوں میں مین ہولوں کے ڈھکنے ہلکے پھلکے کھلونوں کی طرح اڑ کر فضا میں بلند ہوگئے اور واپس زمین پر گر کر انہوں نے شدید نقصان پہنچایا۔ دھماکوں کے بعد پھیلنے والی آگ کے طوفان نے 150 کے قریب مکانات کو خاکستر میں بدل دیا اور اس سے دس گنا مکانات رہائش کے قابل نہ رہے۔ سب سے زیادہ غم کی بات یہ تھی کہ یہ تمام تباہ ہو جانے والے گھر غریب طبقے کے لوگوں کے تھے۔

میڈیا کی توجہ جنگ عظیم دوم کے محاذوں پر مرتکز ہونے کی وجہ سے سانحہ کلیولینڈ کے متعلق دنیا میں بہت کم لوگوں کو علم ہو سکا اگرچہ اس سانحہ میں 135 قیمتی انسانی زندگیاں ضائع ہوگئیں اور اس سے کہیں زیادہ تعداد میں انسان شدید زخمی ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب جنگ کے محاذوں سے بہت بڑی تعداد میں

اموات واقع ہونے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ ایک اخبار میں سب سے بڑی شہ سرخی ایک کار پارکنگ میں کھڑی بہت سی کاروں کی تباہی کی تھی۔ ادھر اگلے بیس سال تک مائع گیس کا کوئی اور نیا پلانٹ نہ لگایا جاسکا تاہم اس بارے میں تحقیق ضرور ہوئی کہ آئندہ اس قسم کے گیس پلانٹ میں اتنا بڑا دھماکہ نہ ہو۔ ٹینک کے بنائے جانے کے متعلق نئے ضابطے بھی بنائے گئے۔

تاہم آج LNG پلانٹ کی سیفٹی کے متعلق سب کو اعتماد ہے اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ کلیولینڈ میں آج بھی دوسرا بڑا پلانٹ نصب ہے اور یہ شہر اس انڈسٹری کے بانی شہروں میں شامل ہے اور اس شہر میں قدرتی گیس کا سب سے بڑا فیولنگ اسٹیشن واقع ہے۔ اور اب تو گیس پاور سے چلنے والی بسیں بھی اس شہر کی شاہراہوں پر عام ہیں۔

1945ء..... ہیروشیما پر ایٹم بم کا گرایا جانا

دنیا کا پہلا ایٹم بم جو جنگی ہتھیار کے طور پر کام میں لایا گیا وہ 6 اگست 1945ء کو جاپان کے شہر ہیروشیما پر گرایا گیا تھا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اگر اس ساخت کا ایک اور بم اس شہر میں پھٹ جاتا تو اس کے کیا اثرات ہوتے شاید یہ شہر صفحہ ہستی سے ہی مٹ جاتا کیونکہ اولین ایٹمی جنگی دھماکے میں اس شہر کی 7/1 فی عمارات اور 80 ہزار کے لگ بھگ شہری ایک لمحہ میں صفحہ ہستی سے ہٹ گئے تھے اگرچہ آج تک پر مرتب کی جانے والی کتابوں میں جنگی تباہی کے واقعات بہت کم رکھے جاتے ہیں مگر ہیروشیما کی تباہی ان واقعات سے الگ ہے۔ ایک سابقہ پائلٹ، لیفٹیننٹ کرنل جیمیز ایچ ڈولٹل نے جنگ عظیم دوم کے سب سے جرات مندانہ حملے کا منصوبہ اپریل 1942ء میں بنایا تھا۔ اس نے B-25,16 بمبار طیارے ایک بحری جہاز میں رکھ کر جزائر جاپان کے قریب پہنچائے اور پھر ان سے ٹوکیو پر بمباری کی اور یوں امریکہ سے ہزاروں میل دور فضائی بمباری کرنے میں کامیاب ہوگیا، جاپانی حیران تھے کہ امریکی بمبار ہوائی جہاز ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرکے کیسے ٹوکیو تک پہنچ گئے۔ اس حملے میں 50 افراد ہلاک ہوگئے تھے اور ٹوکیو پر بمباری کرنے کے بعد یہ امریکی طیارے چین میں اتر گئے تھے۔ جاپانیوں نے بھی اس حملے کا امریکی طیاروں سے خوفناک انتقام لیا تھا اور بہت سے حملہ آور جہاز مار گرائے تھے۔

ادھر جرمنی سے بھاگ کر امریکہ میں پناہ لینے والے جرمن یہودی النسل سائنسدان کئی سال سے اتحادیوں کے لیے ایٹم بم تیار کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے تاکہ اس جنگ کا توازن اتحادیوں کے حق میں ہو جائے۔ ان سائنسدانوں کو کامیابی کہیں جاکر 1945 کے آغاز میں حاصل ہوئی ادھر جرمنی اور جاپان میں بھی ایٹم بم کی تیاری جاری تھی، تاہم نومبر 1944 میں جاپانی سائنسدانوں نے رپورٹ دی کہ انہیں اس میدان میں بہت کم کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ایٹم بم تیار کرنے کے اس زمانے میں نہ صرف عسکری فوائد تھے بلکہ اس سے سیاسی فوائد بھی حاصل ہوسکتے تھے۔ جیسا کہ جنگ عظیم دوم کے اختتام کے بعد جمہوریہ امریکہ سوویت یونین کی پالیسیوں سے خوفزدہ ہونا شروع ہوگیا تھا۔ امریکی صدر ٹرومین چاہتا تھا کہ جرمنی کی فتح میں سوویت یونین کی شرکت کے جو نتائج سامنے آئے تھے اس لیے اب ضروری تھا کہ سوویت یونین کی مداخلت کے بغیر ہی جاپان کو شکست دی جائے۔ امریکہ میں تیار کیے جانے والا ایٹم بم کا

16 جولائی 1945ء کو آزمائشی تجربہ کامیاب رہا۔ چرچل نے اس بل بوتے پر کہا تھا کہ اب
مزاحمت کو سرد کرنے کے لیے اس کے ایک ایک آدمی کا مقابلہ کرنے یا جاپان کو ایک ایک
کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اسے ایک یا دو شدید جھٹکے دے کر خاموش کر دیا جائے گا۔

جاپان کا رویہ جرمنی کی شکست کے بعد بڑا مبہم تھا ادھر اس کے حکام سوویت یونین اور سوئٹزر
ذریعے ہتھیار ڈالنے پر بھی بات چیت کرنا چاہتے تھے دوسری طرف اس کا سرکاری رویہ کسی طرح بھی
کا نہیں نظر آتا تھا۔ 26 جولائی کو اتحادیوں نے جاپان سے غیر مشروط طور ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا اور
کہ جاپان کو اپنے جزائر پر قابض رہنے کی اجازت ہوگی تاہم اس کے انکار پر جاپان کو ایک بڑی جنگ
سامنا کرنا پڑے گا۔ جاپان کی بحریہ کے کمانڈر اور وزیراعظم ایڈمرل کینٹارو نے بیان دیا کہ اتحادیوں کا
مطالبہ اس کا ملک مسترد کرتا ہے اور وہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے تک جنگ جاری رکھے گا۔

اب اتحادیوں نے ٹوکیو کو نشانہ نہ بنانے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ شہر پہلے ہی بمباریوں سے جزوی طور
تباہ ہو چکا تھا۔ اتحادیوں کی نظر ہیروشیما پر تھی کہ اسے اس جنگ میں کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔ 5 اگست
1945 کو ایک B-29 بمبار امریکی طیارے نے جسے ایک کیتھولک پادری نے برکت کی دعا بھی دی تھی
تن یان آئی لینڈ Tinian island سے پرواز کی اس طیارے میں دنیا کا پہلا ایٹم بم ''لٹل بوائے''
نصب تھا۔ پھر یہ طیارہ اگلی صبح ہیروشیما پر 1900 فٹ کی بلندی پر پرواز کناں تھا۔ اس طیارے نے
ایٹم بم ہیروشیما پر گرا دیا۔ جس سے زمین پر موجود ہر شے فوراً دھوئیں میں تحلیل ہو کر اڑ گئی۔ اگلے
ہفتوں میں 92000 افراد اس بم کے دھماکے سے ہلاک ہوگئے۔ شہر کی 90000 عمارات میں سے
62000 عمارات مکمل طور پر تباہ ہوگئیں۔ امریکی صدر ٹرومین نے دھمکی دی کہ اگر جاپان نے اتحادیوں کی
شرائط کو تسلیم نہ کیا تو پھر اس پر ہیروشیما جیسی اور بہت سی تباہیاں نازل ہوں گیں اور ایسی بربادیاں جن
کہ زمین پر پہلے کبھی دیکھی نہیں گئیں ہوں گئیں۔ اس دھماکے سے پوری دنیا کو دھچکا پہنچا اور پوری دنیا
خوفزدہ ہوگئی۔ ادھر اگلے ہی دن سوویت یونین نے منچوریا پر حملہ کر دیا تاہم جاپانیوں نے اس کا کوئی فوری
جواب نہیں دیا اس لیے صدر ٹرومین کو ایک اور ایٹم بم جاپان کے شہر ناگاساکی پر گرانا پڑا۔ اس بم کو پہلے
جاپانی شہر کوکورا Kokora پر گرائے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا مگر موسم کی خرابی کی وجہ سے یہ ناگاساکی کے
حصے میں آیا۔ اس دوسرے ایٹم بم کا نام ''موٹا آدمی Fatman'' تھا اور یہ پلوٹونیم سے تیار کیا گیا تھا اور
ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم سے زیادہ طاقتور تھا۔ اسی وجہ سے اس سے دھماکہ بھی زیادہ شدید
ہوا مگر ہوائی حملے سے بچنے کی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی وجہ سے ناگاساکی میں کم جانی نقصان ہوا اسی
وجہ سے ابتدائی رپورٹ میں اس دھماکے سے ہونے والی اموات کی تعداد 40,000 بتائی گئی تھی۔ جب

ہی دوسرے ایٹم بم کے گرائے جانے کی خبر جاپان کی جنگی کابینہ کو ملی تو اس نے آخر کار ہتھیار ڈالنے کا
فیصلہ کیا۔ 14 اگست کو 1000 جاپانی فوجیوں نے ہتھیار ڈالنے کے فیصلے پر عملدرآمد روکنے کے لیے
جاپانی شہنشاہ کے شاہی محل پر حملہ کر دیا۔ ان فوجیوں نے شاہی محافظ دستے کے کمانڈر کو ہلاک کر دیا تاہم
شہنشاہ کے محافظ دستے نے انہیں محل سے دور بھگا دیا۔ پھر اسی دن آدھی رات کے بعد جاپانیوں نے اپنے
شہنشاہ ہیرو ہیٹو کی آواز ریڈیو پر پہلی مرتبہ سنی، شہنشاہ نے باقاعدہ طور پر ہتھیار ڈالنے کا اعلان کر دیا۔

ہیروشیما میں ایٹم بم کے گرائے جانے کے بعد جو پہلا شخص داخل ہوا تھا وہ جاپانی کمانڈر کیپٹن مٹسو
فوچیدا Mitsou fuchidal تھا۔ جس نے امریکی بندرگاہ پرل ہاربر پر حملہ کیا تھا۔ وہ بلا مقصد اس شہر کی
بربادی اور ویران گلیوں میں پھرتا رہا۔ اگلے مئی میں ایک امریکی صحافی نے ایٹم بم سے ہونے والی ہیروشیما
میں بربادیوں کی جھلک دنیا کے سامنے پیش کی اور اس سانحہ میں زندہ بچ جانے والوں کے انٹرویو شائع
کیے۔ ایک میتھو ڈسٹ پادری ٹانی موٹو Tanimoto نے بتایا کہ وہ اس دھماکے کے مقام سے کوئی دو میل
کے فاصلے پر ایک دوست کے باغ میں تھا اس نے دیکھا کہ آسمان پر چندھیا دینے والی روشنی چمکی پھر اس
نے خود کو دو بڑی چٹانوں کے درمیان پایا جو ملبے کے طور پر کہیں سے اڑ کر یہاں آ گریں تھیں۔ پھر اس
نے دیکھا کہ اس کے اس دوست کا گھر بھی اپنی جگہ سے غائب ہو چکا تھا دھوئیں کا ایک مشروم چھتری
ٹائپ بڑا سا مرغولہ آسمان میں بلند ہو رہا تھا شہر میں گرد کا طوفان امڈ آنے سے صبح کے وقت ہی شام کا
دھندلکا چھا گیا تھا۔ ایک جاپانی خاتون جو دھماکے کے مقام سے چار میل کے فاصلے پر تھی وہ دھماکے کے ساتھ
ہی فضا میں بلند ہوگئی تھی اور بعد ازاں اس کی چھاتی تک وہ پتھروں کے ایک ڈھیر میں مدفون پائی گئی۔
دھماکے کے مرکزی مقام سے ایک میل کے فاصلے پر ایک ریڈ کراس کا ہسپتال تھا اس کے ایک سرجن نے
دھماکے کے بعد خود کو لاشوں میں گھرا پایا اور ہر طرف لوگوں کو چیختے اور چلاتے دیکھا۔ ایک اور زندہ بچ جانے
والے ڈاکٹر نے ایسے مریضوں کو دیکھا جن کے ہاتھوں اور پیروں کی کھال اتر گئی تھی اور بہت سے بری
طرح جھلسے ہوئے تھے۔

1947ء..... ٹیکساس سٹی میں دھماکہ

16 اپریل کی صبح مصنوعی کھاد کی تیاری میں استعمال ہونے والی ایمونیئم نائٹریٹ میں ہونے والے دھماکوں نے ٹیکساس شہر کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا پہلا دھماکہ جو فریٹر گرینڈ کیمپ کہلاتا ہے اس کی آواز 90 میل تک سنائی دی گئی۔ دوسرا دھماکہ جس کو High flier کا نام دیا گیا۔ پہلے دھماکے کے 16 گھنٹے بعد ہوا وہ بھی شدت میں کسی طرح بھی پہلے سے کم نہیں تھا۔ ان دونوں دھماکوں میں کئی ہزار افراد زخمی ہوئے جبکہ 568 افراد ہلاک ہوگئے۔ یہ امریکہ میں ہونے والے کسی صنعتی حادثے میں ہونے والی سب سے زیادہ اموات تھیں۔

ٹیکساس شہر خلیج گیلو اسٹون پر ہاوسٹن کے تقریباً 30 میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ ٹیکساس 1930ء کی دہائی میں ایک ترقی پذیر تیل کی بندرگاہ تھی اور اس کی آبادی 6 ہزار نفوس پر مشتمل تھی اس شہر کی بندرگاہ میں زیادہ تر خام تیل کے جہاز لنگر ہوتے اور یہ تیل بندرگاہ کے قریب واقع تیل صاف کرنے کے کارخانوں میں صاف کیا جاتا تھا۔ 1940ء کے اوائل میں جنگ عظیم دوم کے شروع ہو جانے کے بعد جب ہوا بازی کے لیے مستعمل تیل کی ڈیمانڈ بڑھی تو تیل کی پیداوار 5 گنا بڑھ گئی اور اس شہر کی آبادی بھی دو گنا ہوگئی۔ 1947ء میں جب زمانہ جنگ ختم ہو چکا تھا تیل کے کاروبار میں اضافہ جاری تھا۔ 1946ء میں نافذ کئے جانے والے ایک ایکٹ کی بنیاد پر اس شہر کو تین مختلف زونوں میں منقسم کر دیا گیا تھا جن میں سے ایک صنعتی دوسرا رہائشی اور تیسرا تعلیمی زون تھا۔ صنعتی زون میں گیس اور تیل محفوظ کرنے کے ٹینک موجود تھے مگر ان کے ساتھ آگ سے بچاؤ کے تمام حفاظتی سسٹم بھی الرٹ رکھے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان ٹینکوں کے گرد حفاظتی پشتے بھی تعمیر کئے تھے کہ آگ لگنے کی صورت میں آگ دوسری عمارتوں تک نہ پہنچ سکے اسی وجہ سے ماہرین کا خیال تھا کہ اس علاقے میں آگ لگنے کا صرف 5 فی صد خطرہ موجود ہے۔

مگر یہ تمام صورتحال 1946ء میں اس وقت بدل گئی جب ٹیکساس کی بندرگاہ سے بڑی مقدار میں امونیئم نائٹریٹ کھاد جہازوں کے ذریعے بھیجی جانے لگی۔ اب حادثاتی آگ لگنے کی صورت میں بندرگاہ کی گودیوں والا تمام علاقہ متاثر ہونے کا امکان بڑھ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 1941ء میں فوج نے

امونیم نائٹریٹ کو انتہائی آتش گیر مادہ قرار دیا تھا اور اس میں TNT کی دھماکہ خیز خصوصیات بھی شامل تھیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ خود امریکہ کے شعبہ زراعت نے اس بات کی تصدیق کی تھی اور کہا تھا کہ امونیم نائٹریٹ میں گرمی ماحول اور دباؤ بڑھ جانے سے دھماکہ پیدا ہو جاتا ہے یا بھک سے اڑنے کی خصوصیات پیدا ہو جاتیں ہیں۔ جرمنی میں 26 سال پہلے امونیم نائٹریٹ کے ایک گودام میں ایسا دھماکہ ہو چکا تھا تاہم ابھی تک امونیم نائٹریٹ کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے تھے 16 اپریل 1947ء سے پہلے تقریباً ایک لاکھ ٹن امونیم نائٹریٹ ٹیکساس کی بندرگاہ سے دوسرے ممالک کو بھیجی جا چکی تھی۔ چونکہ اتنی بڑی مقدار میں برآمد کئے جانے کے باوجود کوئی حادثہ رونما نہیں ہوا تھا اس لئے نائٹریٹ کے بارے میں یہ غلط فہمی بڑھ گئی تھی کہ یہ ایک غیر دھماکہ خیز شے ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ امونیم نائٹریٹ اسلحہ ساز فیکٹریوں میں تیار کی جاتی تھی اور یہ بموں کے دھماکہ خیز اجزا میں سے ایک تھی۔

بار بردار جہاز Grand camp امونیم نائٹریٹ کی ایک بڑی مقدار ٹیکساس سٹی بندرگاہ سے فرانس لے کر جا رہا تھا جہاں جنگ کے بعد زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے اس مصنوعی کھاد کی ضرورت تھی۔ تقریباً 2000 ٹن امونیم نائٹریٹ کے گرینڈ کیمپ پر لادے جانے کے بعد جہاز پر ایک چنگاری بھڑکتی دکھائی دی جو غالباً کسی سگریٹ نوش کی لاپرواہی کا نتیجہ تھی۔ گودیوں میں سگریٹ نوشی اگرچہ قانونی پر ممنوع ہے مگر اس زمانے میں اس کی اجازت تھی۔ مزدور جہاز پر وزن لادنے کا کام کر رہے تھے انہوں آگ بجھانے والے آلات کی مدد سے آگ بجھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس موقع پر جہاز کے کپتان نے یہ دیکھتے ہوئے کہ آگ پانی سے بجھنے کی بجائے بڑھ رہی ہے اس نے بھاپ کے ذریعے آگ بجھانے کی کوشش میں جہاز کے تمام روشندان اور کھڑکیاں دروازے بند کروا دیئے تاکہ آگ کو ہوا نہ مل سکے جبکہ آمونیم نائٹریٹ کے دھماکہ خیز ثابت ہونے کے لیے ماحول سازگار ہوگیا پھر جیسے آگ مزید بڑھی تو مزدوروں کو جہاز چھوڑنا پڑا۔ اس پر جہاز کا الارم بجایا گیا اور بندرگاہ پر موجود آگ بجھانے والے عملے کو طلب کرلیا گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ مدد جہاز پر پہنچتی ایک بڑے دھماکہ سے جہاز اڑ گیا۔

اس دھماکہ سے پیدا ہونے والی شاک ویوز سے جن کے ساتھ جہاز پر موجود لوہے اور فولاد کے سامان کے ٹکڑوں نے بھی بم دھماکے سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ یہاں تک کہ بندرگاہ کے اوپر پرواز کرنے والے دو جہاز بھی نیچے آ گرے۔ آگ نے اتنی شدت اختیار کی کہ محسوس ہونے لگا کہ جہاز کے اوپر موجود ہر شے بھاپ بن کر اڑ جائے گی۔ دھماکہ سے اڑنے والی بھاری اشیا نے بندرگاہ پر موجود سیکڑوں افراد چشم زدن میں ہلاک کر دیئے اور قریبی عمارتوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ گرینڈ کیمپ ہونے والے اس دھماکہ سے اڑنے والی اشیا میں سے بعض کا وزن کئی کئی ٹن تھا اس شدید دھماکہ سے سمندر میں سونامی کی

طرح کی ایک 15 فٹ بلند ایک موج پیدا ہوگئی۔ ادھر جہاز پر لدی ہوئی کپاس اور کپڑے نے آتش گولوں کی شکل اختیار کرلی جو بندرگاہ کی گودیوں پر بموں کی طرح برس رہے تھے اور ان سے ہر سمت میں آگ بھڑک رہی تھی۔

پندرہ میل دور واقع گیلو اسٹون میں اس دھماکہ کی شدت سے لوگ سڑکوں پر چلتے ہوئے گر پڑے اور اس سے دوگنا فاصلے پر کھڑی عمارتیں لرز کر رہ گئیں۔ ٹیکساس شہر میں ایک خوفناک دھماکے کی آواز سنائی دینے کے بعد لوگ اپنے لواحقین کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بندرگاہ کی طرف دوڑ پڑے۔ بندرگاہ پر ہر طرف زخمی ہونے والے لوگ بکھرے پڑے تھے اور آہ و بکا کی آوازیں ہر سمت سے سنائی دے رہی تھیں۔ شہر کے بڑے آڈیٹوریم ہال کو ہنگامی طور ایک طبی کیمپ کی شکل دے دی گئی اور آس پاس کی آبادیوں سے ڈاکٹر اور نرسیں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے وہاں بلا لی گئیں۔

فیڈرل اور مقامی حکام کو متحرک ہونے میں کافی وقت لگا کیونکہ اس سے پہلے اس قسم کا کوئی حادثہ رونما نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اس حادثہ کی ذمہ داری کسی نے قبول نہیں کی مگر حادثے کی وجوہات میں انسانی غفلت اور لاپرواہی عیاں تھی۔ بندرگاہ کی تعمیرات میں خرابی مضمر تھی۔ تیل اور دیگر آتش گیر مادوں کے ٹینک بندرگاہ کے بالکل قریب میں واقع تھے جو مزید نقصانات کا سبب بنے تھے۔

1947..... تقسیم ہند کے فسادات و ہنگامے

جزوی طور پر جنگ عظیم میں ہندوستان کی وفاداری کے انعام کے طور پر اور جزوی طور پر ہندوستان کے لوگوں کے مطالبے پر 20 فروری 1947 برطانوی حکومت نے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہدایات بھجوائیں کے ہندوستان کو آزاد کرنے کی تیاریاں مکمل کرے۔ اس وقت ہندوستان کی آبادی تقریباً ۱۹۱۱ ملین تھی جس میں سے ایک چوتھائی مسلم تھی۔ شمال مغربی ہندوستان کے کچھ علاقوں میں مسلم ایک اکثریت کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہندوستان کے شہروں میں ہندو مسلم صدیوں سے مل کر رہتے چلے آرہے تھے۔ آزادی سے کانگریس پارٹی ایک ایسی سیاسی وحدت کی شکل مراد رکھتی تھی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اور کسی قسم کا تفرقہ نہیں تھا۔ تاہم مسلمانوں کو اپنے ساتھ امتیازانہ سلوک کئے جانے کا احساس تھا اور اپنے مستقبل کی فکر تھی۔ 1924ء میں مالا بار میں ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے جس میں سیکڑوں افراد مارے گئے اور فسادات کی یہ وبا یہاں سے پورے شمالی ہندوستان کے شہروں میں پھیل گئی۔

اس کے 9 سال بعد کیمبرج یونیورسٹی میں مسلمان طالب علموں کے ایک گروپ نے ہندوستان میں ایک علیحدہ مسلم ریاست..... پاکستان کے قیام کی تجویز پیش کی جو مسلم اکثریت رکھنے والے شمال مغربی اور شمال مشرقی صوبوں پر مشتمل ہو۔ اس کے اگلے سال ہی قائداعظم محمد علی جناح جو کراچی سے تعلق رکھتے تھے ایک مسلم راہنما کے طور پر ہندوستان کے سیاسی افق پر ابھرے۔ محمد علی جناح پہلے کانگریس پارٹی میں تھے مگر بعد ازاں انہوں نے یہ پارٹی محض اس لیے چھوڑ دی تھی کہ اس پارٹی پر تنگ نظر ہندوؤں کا غلبہ تھا جو موہن داس کرم چند گاندھی کو ایک مہاتما کی حیثیت دیئے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ..... ایک مسلم سیاسی جماعت کے راہنما کی حیثیت سے قائداعظم یہ سمجھتے تھے کہ ہندوؤں سے کوئی پر امن معاہدہ طے پایا جائے گا تاہم 1937ء میں ہونے والے انتخابات کے بعد کانگریس پارٹی کے ایک راہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلم لیگ کے ساتھ کسی قسم کا تعاون یا معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی ہند میں 1937ء کے انتخابات کے بعد سے ہندوستانیوں کو صوبائی سطح پر خود اختیاری مل چکی تھی ان انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے والی کانگریس پارٹی کے راہنماؤں کے جانبدارانہ رہنے کی وجہ سے مسلمان کانگریس کے راہنماؤں کو "ہندو راج کے متعصب اور ظالم نمائندے سمجھتے تھے 1938ء میں بمبئی میں کچھ ہندو اور مسلمان تاش

کھیلتے ہوئے لڑ پڑے اس لڑائی نے بڑھ کر ہندو مسلم فسادات کی شکل اختیار کر لی اور کئی دن تک بمبئی میں یہ فسادات جاری رہے۔ ان فسادات میں 14 افراد ہلاک ہو گئے۔

فروری 1946ء میں جنگ عظیم دوم کے اختتام کے بعد جو پہلے انتخابات برطانوی ہند میں ہوئے ان میں آسام اور صوبہ سرحد میں مسلم اکثریت کے علاقوں میں کانگریس کے نمائندے جیتے جبکہ باقی صوبوں میں مسلم لیگ کے نمائندے مسلم اکثریت کے علاقوں میں کامیاب ہوئے۔ اسی زمانے میں پنجاب میں سکھوں نے اپنے الگ وطن سکھستان کا مطالبہ شروع کر دیا جبکہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے مسلمانان ہند پہلے ہی اپنے ایک الگ وطن پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ 1946ء کے انتخابات کے بعد برطانوی حکومت دو ماہ تک کانگریس اور مسلم لیگ کے راہنماؤں سے مذاکرات کرتی رہی تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی مفاہمت ہو سکے مگر کسی حل پر نہ پہنچنے کے بعد برطانوی حکام نے ملک کو تین حصوں میں منقسم کرنے کی تجویز پیش کی یعنی موجودہ بھارت، مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان (جواب بنگلہ دیش ہے) اگست میں نہرو نے یہ تجویز مسترد کر دی جس پر قائداعظم نے مسلمانوں کو براہ راست اقدام کرکے پاکستان حاصل کرنے کا حکم دیا۔ 16 اگست 1946ء کو کلکتہ میں شدید ترین ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے جن کے دوران کلکتے کی گلیاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی لاشوں سے اٹ گئیں۔ صرف 4 دن میں 4000 سے زائد افراد ان فسادات میں ہلاک ہو گئے۔ جس کے بعد مسلم اکثریت کے حامل مشرقی بنگال سے ہزاروں ہندوؤں کو نکال دیا گیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے خلاف جوابی کاروائی کرتے ہوئے صوبہ بہار میں ہندوؤں نے 700 سے زائد مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ ادھر سکھ پنجاب پر مسلم حکومت کے قائم ہو جانے سے خوفزدہ تھے اس لیے انہوں نے ہندوؤں کے اکسانے پر ایک مسلمان گاؤں پر حملہ کرکے 16 مسلمانوں کو شہید کر دیا جس کے بعد اگلے دو ہفتوں میں امرتسر کے مضافات میں 1000 سے زائد لوگ مارے گئے۔ لاہور میں شرح اموات 100 روزانہ تک پہنچ گئی جبکہ کلکتہ میں اس سے کہیں زیادہ تعداد میں روزانہ لوگ مارے جانے لگے۔ ایک امریکی صحافی لوئس فشر کے مطابق کلکتہ کی گلیوں میں کہاں ایک مسلمان لڑکی ہندو لڑکی کے بال نوچ رہی ہوتی تھی یا پھر ہندو لڑکے کسی مسلمان لڑکے پر تشدد کرتے ہوتے نظر آتے تھے یوں ہندو اور مسلم متحد ہو کر ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کی بجائے فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہو گئے۔

مارچ 1947ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے آخری وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان پہنچا۔ اسے برطانوی حکومت کی طرف سے ہدایات ملی تھیں کہ جون 1948ء سے پہلے ہندوستان کو ہندوستانیوں کے حوالے کر دے مگر اس نے حالات کو بدلتے دیکھ کر اس سے کہیں پہلے ہندوستانیوں کو

منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہندوؤں اور مسلمانوں میں تناؤ کے پیش نظر برصغیر کی تقسیم ہی واحد حل تھا
اختیارات
مگر ہندوستانی راہنماؤں میں گاندھی جی ابھی تک اس کے خلاف اڑے ہوئے تھے۔ انہیں دنوں ماؤنٹ
بیٹن نے نہرو کو اعتماد میں لے لیا مگر قائداعظم کو ماؤنٹ بیٹن پر بھروسہ نہ رہا۔ ہندوستان کے مسئلے کا حل
نکالنے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ نے جولائی 1947ء میں ''انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ پاس کیا اور
14 اگست کو بھارت اور پاکستان کو آزادی دینے کا اعلان کر دیا۔ پنجاب اور بنگال میں تقسیم کی حدود کو خفیہ
رکھا گیا اور اس کا اعلان آزدی کے دو دن بعد کیا گیا۔ جس کا مقصد انگریزوں کے نزدیک ہندو مسلم کشمکش
کو دبانا تھا مگر اس اقدام سے الٹا فسادات کو ہوا ملی۔ اعلان آزادی ہندوستان کے بعد جلد ہی 2 کروڑ
کے قریب ہندو، مسلم اور سکھ گھروں سے نکل پڑے وہ اپنے نئے قائم شدہ ملک کی طرف ہجرت کرنا چاہتے
تھے۔ مگر اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ قتل عام کا شکار ہوگئے۔

ایک انگریز ایڈمنسٹریٹر نے حاصل پور کے قصبے میں خزاں کے پتوں کی طرح بکھری ہوئی ہندوؤں کی
لاشیں دیکھیں جبکہ پنجاب میں لیفٹننٹ کرنل جیمز بیل نے جو گذشتہ 20 سال سے برطانوی ہندوستان میں
تھا۔ پنجاب کے ہزاروں گاؤں، قصبوں اور شہروں میں ہزاروں لوگوں کو وحشیانہ طور پر قتل کیا ہوا دیکھا اور
بستیوں کی بستیاں اجڑی ہوئی پائیں۔ پاکستان اور بھارت جانے والی اسپیشل ٹرینوں کو راستے میں روک کر
مخالف کمیونٹی کے لوگوں کو ان سے گھسیٹ کر اتار لیا جاتا اور بچوں، عورتوں اور بوڑھوں سمیت ذبح کر دیا
جاتا۔ اسی دوران بہت سی خواتین کی عصمت دری کی گئی اور انہیں بے سہارا کر دیا گیا۔ کرنل جس ٹرین
میں سوار تھا اسے بھی لدھیانہ کے باہر روک لیا گیا اور پھر سکھوں نے وحشیانہ طور پر ٹرین میں سوار ہر
مسلمان کو قتل کر دیا صرف مٹھی بھر لوگ جان بچا سکے۔ کرنل بیل نے خود بھی ٹرین کے باتھ روم میں چھپ
کر جان بچائی تھی۔ بچ کر آنے والے لوگوں کا احوال سننے کے بعد فرقہ وارانہ فسادات مزید تیز ہوگئے۔
جب پاکستان سے کچھ ہندو دہلی پہنچے تو ان کا حال سننے کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے
گھروں پر حملہ کر دیا۔ اور مسلمانوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ صوبہ بہار میں ایک کروڑ مسلمان آباد
تھے صرف ایک ہفتے میں بہار کے ہندوؤں نے 10 ہزار سے زائد مسلمانوں کو گھروں سے نکال کر ہلاک کر
دیا ایک انگریز افسر نے دیکھا کہ لاریاں لوگوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھتیں تھیں اور نعرہ لگایا جاتا تھا کہ
جہاں لاکھوں لوگ مارے گئے وہاں مزید چند سے کیا فرق پڑے گا۔ پنجاب میں اسپیشل ٹرینیں ایسی حالت
میں بھی بھارت کی سرحد میں داخل ہوئیں کہ ان کے ڈبے لاشوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان پر لکھا تھا
کہ ''یہ پاکستان کی طرف سے تحفہ''۔ ایک برطانوی افسر نے پاکستان میں داخل ہونے والی ایک ٹرین میں
تقریباً دو ہزار لاشیں بھری ہوئی پائیں تھیں۔ یہ گاڑی ریلوے لائن پر پتھر ڈال کر مشرقی پنجاب میں روک

لی گئی تھی پھر اس پر سوار ہر مسلم مرد کو قتل کر دیا گیا اور خواتین کو سکھ حملہ آور اٹھا کر لے گئے۔ تاہم سکھوں
ان فسادات میں بڑی تعداد میں مارے گئے تھے اور تقریباً 2 لاکھ سکھوں کو پاکستان کے علاقوں سے
ہندوستانی علاقوں میں منتقل ہونا پڑا تھا۔

ماؤنٹ بیٹن نے مہاتما گاندھی کو امن برقرار رکھنے والی واحد طاقت کے نام سے یاد کیا تھا، کہ وہ
ہندوؤں کی امن پسندی کے قائل تھے۔ جب آزادی سے 9 ماہ پہلے مشرقی بنگال میں قتل عام شروع ہوا تھا
تو مہاتما اپنی معمری (ستتر سال کی عمر) کے باوجود ننگے پاؤں گاؤں در گاؤں ان فسادات کو روکنے کے
لیے گئے تھے اور بلا امتیاز ہندو مسلم گاؤں کے ہر باشندے کے پاس گئے۔ اس دورے میں انہوں نے 49
گاؤں کا دورہ کیا تھا۔ کہتے ہیں آزادی کے دوسرے دن انہوں نے کلکتے کی ایک کھلی سڑک پر اپنا خیمہ لگوا
لیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ وہ مرتے دم تک مرن برت رکھیں گے تاوقتیکہ قتل عام بند نہ ہو جائے۔

مگر ان کی ان امن پسندانہ کوششوں کے باوجود تقریباً بیس لاکھ افراد ان فسادات اور ہنگاموں میں
ہلاک ہوگئے تھے۔ ان فسادات کے بعد مسلمانوں کو بھی اس کا صلہ پاکستان کی صورت مل گیا اور ہندو بھی
بھارت قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ صرف سکھ قوم ایسی تھی کہ ہندوؤں کی حمائت میں اس نے
مسلمانوں کو بے اندازہ نقصان پہنچایا مگر بے نیل و مرام رہی اور ماسٹر تارا سنگھ یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ
مسلمانوں کو پاکستان مل گیا اور ہندوؤں کو بھارت مگر سکھوں کو کیا ملا؟

1952ء.....لندن میں قاتل دھند

5 دسمبر سے 9 دسمبر 1952ء تک لندن پر ایک قاتل دھند یا کہر چھائی رہی۔ یہ دھند یا کہر لندن پر اکثر موسم سرما میں چھائی رہنے والی کہر سے بالکل مختلف تھی تاہم اس کا آغاز لندن کی عام کہر کی طرح ہی ہوا تھا۔ یہ کہر اتنی طاقتور تھی کہ زمین پر ہوا کو پہنچنے سے روکتی تھی۔ دوسری طرف اس کہر یا سرد ہوا کے اوپر شمالی سمندر سے آنے والی گرم ہوا کی ایک تہہ یا چھت جمی ہوئی تھی۔ گرم ہوا کی یہ تہہ لندن کی فضاؤں پر 5 دن تک چھائی رہی جس سے لندن میں رہنے والوں کو حبس دم لاحق ہوگیا اور تقریباً 4 ہزار افراد کی دم گھٹنے کی وجہ سے موت واقع ہوگئی جاں بحق ہونے والے ان 4 ہزار افراد میں بوڑھے بچے اور جوان سبھی شامل تھے۔ ان پانچ دنوں میں لندن میں شرح اموات عام شرح اموات سے 8 گنا زیادہ تھی۔

عموماً لندن کی فضاؤں کو شمالی سمندر اور رود بار انگلستان سے آنے والی ہوائیں صاف کرتی رہتیں ہیں۔ مگر کہر چھانے کی وجہ سے دسمبر 1952ء کے ان پانچ دنوں میں لندن میں ہوائیں تھمی ہوئیں تھیں اور فضا بالکل ساکت و جامد تھی۔ اور دونوں سمندروں میں سے کسی طرف سے بھی ہوائیں نہیں چلیں کہ وہ اس قاتل دھند کو اڑا لے جائیں۔ ان پانچ دنوں میں لندن کے باسیوں کو سانس لینے میں انتہائی دشواری پیش آئی جس سے ہسپتالوں کے ایمرجنسی وارڈ مریضوں سے بھر گئے۔

کہر اتنی گہری تھی کہ نہ صرف شہر کی شاہراہوں پر ٹریفک رک گئی بلکہ ایر ٹریفک بھی معطل کرنا پڑی۔ شہر میں مریضوں کو لانے اور لے جانے کے لیے جو ایمبولینس سروس چلائی جارہی تھی وہ صرف پانچ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اس طرح چلتی کے اس کے آگے ایک آدمی راستہ دکھانے کے لیے چلتا تھا۔ بیس میل کے دائرے میں دکھائی دینا بالکل بند ہوگیا یہاں تک کہ پیدل چلنے والے بھی راستے کو ٹٹول ٹٹول کر چلتے یا پھر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گھروں سے باہر نکلتے تھے۔ ان حالات میں جرائم پیشہ لوگوں کی سونا چاندی ہوگئی۔ جیب کترے یا پاکٹ مار آسانی سے جیبیں صاف کرنے لگے اور لندن چوروں کی جنت بن گیا۔ دھند کے پردے نے ان لوگوں کے کام کو آسان کر دیا تھا۔ دوسرے دن جب یہ کہر مزید بڑھی تو عمارتوں میں داخل ہوگئی جس سے عمارتوں میں بھی دکھائی دینا دشوار ہوگیا۔ سینما گھر چونکہ بصری فنون کی نمائش کرتے ہیں۔ ان حالات میں فلم صرف اگلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے افراد ہی دیکھ سکتے باقی ہال پر دھند چھائی

ہوئی رہتی تھی۔

کہیں جا کر 4 دن بعد 8 دسمبر کو ہوائیں چلنا شروع ہوئیں جو اس دم گھونٹ دینے والی دھند کو اڑا کر لے جانے لگیں مگر اس وقت تک بڑی دیر ہو چکی تھی اور دم گھٹنے کی وجہ سے لندن کے ہزاروں شہری ہلاک ہو گئے تھے لندن کی آب و ہوا شدید طور پر مرطوب ہے اور لندن کے شہری اس سے پریشان رہتے ہیں مگر ان پانچ دنوں میں معاملہ اس کے برعکس رہا اور لندن آب و ہوا انتہائی خشک ہو گئی تھی جس سے سانس کی تکالیف میں اضافہ ہو گیا تھا۔

جنوری 1953ء میں برطانوی حکومت نے اس قاتل دھند کے چھا جانے کی وجوہات پر غور شروع کیا اور سائنسدانوں نے لندن کی فضا میں ہوا کے معیار اور آلودگی کا مطالعہ کیا۔ اس ساری کاروائی کو مکمل کرنے میں چار سال لگے اور 1956ء میں اس دھند کے چھا جانے کی وجوہات سامنے آئیں جو فضائی آلودگی بڑھ جانے کو ظاہر کرتی تھیں۔ آب و ہوا کے اس تجزیہ کی تجاویز کے مطابق برطانوی پارلیمنٹ نے 1956ء میں صاف ہوا کا ایکٹ منظور کیا۔ اسی ایکٹ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جمہوریہ امریکہ کی کانگریس نے اس کے سات سال بعد 1963ء میں ایک ایسا ہی قانون منظور کیا۔ ان قوانین کے پاس ہونے کی وجہ سے فضائی آلودگی میں کمی واقع ہوئی مگر اس کے دس سال بعد 1962ء میں لندن ایک بار پھر ایسی ہی ایک اور مہلک دھند کا شکار ہو گیا تاہم اس مرتبہ صرف 136 معمر افراد اس کی دم کشی کا شکار ہوئے وہ بھی پہلے سے سانس کی مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے اس طرح 1962ء میں قاتل دھند کے چھا جانے سے جانی نقصان 1952ء کی دھند سے کہیں کم ہوا۔ لندن میں دھند یا کہرا اکثر موسم سرما کی شدت میں اضافہ کے ساتھ ہی چھا جاتی ہے۔ چارلس ڈکنز جیسے ناول نگاروں نے لندن کی اس کہر کی اپنے ناولوں میں بڑے خوبصورت انداز میں منظر نگاری کی مگر گذشتہ صدیوں میں ایسی دھند کے چھانے کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی جس سے ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے ہوں مگر ایسا اس ترقی یافتہ دور میں ہی جا کر ہوا تھا۔ جو بیسویں صدی کا نصف تھا۔

1953ء..... ہالینڈ شدید سیلاب کی زد میں

موسم بہار میں آنے والے سمندری تلاطم اور ہواؤں کے طوفان نے مل کر ایک قدرتی آفت کی شکل اختیار کرلی جس سے ہالینڈ اور انگلینڈ کے ساحلی علاقوں میں سمندری سیلاب آ گیا۔ 31 جنوری 1953ء کی رات کو اس طوفان کے بپا ہونے سے شمالی سمندر Northsea بپھر گیا اور اس میں پانی معمول کی سطح سے 16 فٹ بلند ہوگیا جو ہالینڈ میں تعمیر کیے گئے حفاظتی پشتوں سے بھی بلند ہوگیا اور ہالینڈ کے تمام نشیبی ساحلی علاقے زیر آب آ گئے۔ بیلجیم، فرانس اور ڈنمارک بھی جزوی طور پر اس سمندری سیلاب سے متاثر ہوئے۔ شمالی سمندر کے کنارے واقع ممالک کو شدید نقصان پہنچا۔ ان ممالک میں ہالینڈ سب سے زیادہ اس سیلاب سے متاثر ہوا تھا ہالینڈ یا نیدر لینڈ میں 47000 مکانات یا تو تباہ ہوگئے یا انہیں شدید نقصان پہنچا 1800 افراد ڈوب گئے اور 72000 کو دوسری جگہوں پر منتقل کرنا پڑا۔ 800 ایکٹر قابل کاشت زمین زیر آب آ گئی اور کھیتوں میں کئی دن تک سمندر کا کھارا پانی کھڑا رہنے سے کھڑی فصلیں، مویشی اور پولٹری فارم تباہ ہوگئے جس سے ہالینڈ کے کسانوں کو شدید مالی نقصان پہنچا۔

ہالینڈ کے باشندوں کو 1928 اور 1934ء میں ملنے والی رپورٹوں سے اپنے حفاظتی پشتوں کی کمزوریوں کا پتہ تھا مگر ان کو بہتر بنانے کے لیے بہت کم اقدامات اٹھائے گئے جس کی وجہ ان پشتوں کی مرمت پر آنے والے بھاری اخراجات تھے۔ اسی طرح کے حالات 2005ء میں نیو آرلینز میں پیش آئے تھے جہاں ہالینڈ ہی کی طرح حکام نے حفاظتی اقدامات سے گریز کیا تھا اور ہری کین قطرینہ نے وہاں شدید نقصان پہنچایا تھا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ڈچ انجینئروں نے سمندر سے پشتے تعمیر کرکے کچھ نشیبی زمینیں بازیاب کی تھیں جنہیں ''پولڈرز Polders کا نام دیا گیا تھا۔ آج کل ہالینڈ میں ایسے 3000 پولڈرز موجود ہیں ایسے علاقوں کی حفاظت کے لیے خصوصی طور پر پشتے تعمیر کیے گئے تھے۔ کیونکہ پشتوں کی تعمیر سے پہلے اکثر پانی کچھ نہ کچھ مقدار میں ان پولڈرز میں در آتا تھا اور اکثر ایسے پانی کو نکالنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ قدیم زمانے میں ہالینڈ میں پن چکیاں اسی کام کے لیے تعمیر کی گئیں تھیں، بعد ازاں یہی کام بھاپ کی طاقت اور بجلی کی طاقت سے چلنے والے پمپوں سے لیا جانے لگا تھا۔ سمندر سے اس طرح بازیاب کی گئی

نشیبی زمینوں پر کاشت کی جاتی تھی پھر آبادی بڑھنے کی وجہ سے ان زمینوں پر قصبے اور شہر بھی تعمیر کیے گئے اس طرح حفاظتی پشتوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔ 1928ء۔1934ء میں ان حفاظتی پشتوں کا تکنیکی معائنہ کیا گیا اور ان کی خراب حالت پر رپورٹیں مرتب کی گئیں تھیں۔ جن پر عملدرآمد پورے طور پر نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہالینڈ میں صدیوں سے کوئی بڑا سیلاب نہیں آیا تھا اس لیے لوگوں کو ان پشتوں سے یا سمندر سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ پشتے 31 جنوری 1953ء کی رات کو آنے والے شدید سیلاب کے پانی کا دباؤ نہ سہار سکے اور اس طرح سیلابی ریلے شہروں اور دیہاتوں میں در آئے۔ اور یہاں آباد لوگوں کو اس غیر متوقع خطرے سے آگاہی نہ حاصل ہونے کی وجہ سے شدید جانی و مالی نقصان پہنچا۔ ہالینڈ کے لوگ آدھی رات ہو جانے کی وجہ سے سوئے ہوئے تھے اور اکثر اس وقت بیدار ہوئے جب پانی ان کے گھروں میں گھس چکا تھا۔ پھر جلد ہی وہ اپنے گھروں میں سیلابی پانی کے ہاتھوں محصور ہوگئے کچھ گھر پانی آنے کے بعد گر گئے۔ ان گھروں کے باسی ملبے کے پانی کے اوپر تیرتے ہوئے ٹکڑوں پر پناہ لینے پر مجبور ہوگئے ان میں سے بہت سے امدادی جماعتوں کے آنے سے پہلے ہی ڈوب کر مر گئے۔ جن جگہوں پر مکان نہیں گرے وہاں لوگوں نے چھتوں پر پناہ لی اور پانی کے اترنے کا انتظار کرنے لگے۔ تمام ریڈیائی اور ٹیلی فونک رابطے کٹ گئے۔ یکم فروری کو پانی کچھ اترا اور اس پاس کے دیہاتوں سے لوگ کشتیوں میں پانی میں گھرے ہوئے لوگوں کو بچانے کے لیے نکلے۔ چونکہ پشتے پہلے ہی سے کمزور تھے اس لیے پانی آسانی سے پولڈروں میں در آیا تھا جب پہلا ریلہ اترا کو سیلاب کا دوسرا ریلہ پہلے سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا اور زیادہ لوگوں کو ڈبو دینے کا باعث بنا۔

یکم فروری کو ان پشتوں میں بھی ضعف کے آثار دکھائی دینے لگے۔ جو ہالینڈ کے جنوبی اور شمالی علاقوں کی حفاظت کے لیے تعمیر کیے گئے تھے اور جن کی وجہ سے یہ علاقے سیلاب کی زد میں آنے سے بچ گئے تھے ان پشتوں میں ضعف کے آثار دکھائی دینے کی وجہ سے پچاس سے ساٹھ لاکھ لوگوں کی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ ایک پشتہ جس کی حفاظت کے لیے پتھروں کی دیوار موجود نہیں تھی رسنے لگا اور اس کی مرمت کی کوششوں کے باوجود یہ پانی میں بہہ گیا اس پشتے کے گرنے سے جو شگاف پیدا ہوا اس میں ایک بحری جہاز کھڑا کر کے سیلاب کے مزید بڑھنے کا خطرہ کم کیا گیا سیلاب کے مزید بڑھنے کا خطرہ کم کیا گیا۔ اور پشتے کو فوراً دوبارہ مرمت و تعمیر کیا گیا۔ 2 فروری تک امدادی کاروائیاں شروع ہوگئیں اور صورتحال کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا گیا۔ سیلاب زدہ مقامات پر ہیلی کاپٹرز کی پروازیں شروع ہوگئیں اور مصیبت زدگان کے لیے خوراک اور ادویات اس کے علاوہ پشتوں کی مرمت کے لیے ریت کے بھرے ہوئے تھیلے گرائے گئے بلجیم، انگلینڈ، جمہوریہ امریکہ، کینیڈا، ڈنمارک اور فرانس نے مالی امداد کے ساتھ فوجی دستے

بھی سیلاب زدگان کی امداد کے لیے بھجوائے اور دیگر ممالک نے بھی امدادی سامان ہالینڈ بھجوایا۔ 3 فروری تک یہ بحران کافی کم ہوگیا اور بہت سے سیلابی مقامات سے سیلاب اتر گیا۔ جن مقامات میں ابھی تک لوگ پھنسے ہوئے تھے ان کو نکالنے کا کام شروع کیا گیا۔ نقصانات کا تخمینہ اور پشتوں کی بحالی مرمت کا کام بھی شروع ہوگیا۔

اس قدرتی آفت کی آمد کے بعد نئے سرے سے پشتوں کی تعمیر و مرمت کا کام شروع کیا گیا تا کہ آئندہ گنجان آباد علاقے ایسی آفتوں سے محفوظ رہ سکیں۔ اس کام کا آغاز 1950ء میں ہوا اور یہ 1986ء تک جاری رہا۔ اس سیلاب سے انگلینڈ میں 24000 مکانات کو شدید نقصان پہنچا تھا اور 30 ہزار افراد کو پانی سے گھرے ہوئے مقامات سے نکال کر محفوظ مقامات پر منتقل کیا گیا تھا۔

1957ء..... تھیلیڈو میڈ، ڈرگ ٹریجیڈی

تھیلیڈو میڈ Thalidomide ایک دوا کا نام تھا جو حاملہ خواتین کی بہتری کے لیے بنی جرمن Celegene نامی کمپنی نے مارکیٹ میں پیش کی تھی۔ مگر اس دوا نے نومولود بچوں میں بہت سے نقصانات ظاہر کیے۔ تین سال بعد جب یہ دوا بند کی گئی تو ہزاروں بچوں میں جسمانی نقائص پیدا ہو چکے تھے۔

یکم اکتوبر 1957ء کو جرمنی میں تھیلیڈو میڈ نامی دوا مارکیٹ میں متعارف کرائی گئی۔ یہ ایک خواب آور Hypnotic دوا تھی جو حاملہ خواتین میں نیند کی کمی کو دور کرنے کے لیے متعارف کرائی گئی تھی۔ نیند کی کمی سے حاملہ خواتین میں متلی اور دیگر امراض سے بچاؤ کے لیے یہ دوا بعد ازاں 1958ء میں پوری دنیا میں متعارف کرائی گئی 1960ء میں جب یہ دوا منسوخ کی گئی تو اس وقت تک یہ ہزاروں نومولود بچوں میں شدید جسمانی عیب پیدا کر چکی تھی۔

سیلی جین ڈرگ کارپوریشن نے تھیلیڈو میڈ نامی دوا کو ایک بے ضرر Non-Toxic اور ناموافق اثرات سے پاک مسکن دوا کے طور پر حاملہ خواتین کے لیے متعارف کرایا تھا۔ تاہم مارکیٹ میں بھیجی جانے کے فوراً بعد اس دوا کے متعلق ایسی رپورٹیں ملنے لگیں کہ یہ دوا دوران خون اور نظام اعصاب میں جلن کا باعث بنتی ہے مگر نظام اعصاب اور دوران خون میں جلن Peripheralneuritts براہ راست کی تولیدی نقصان کا باعث نہیں بنتی مگر کئی ایک تحقیقی سائنسداں اسے براہ راست اعصابی نظام پر حملہ تصور کرتے تھے جس سے تولیدی مسائل پیدا ہوسکتے تھے۔ ان سائنسدانوں میں جمہوریہ امریکہ کے ادارے FDA کے ڈاکٹر فرانسس اولڈہام بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر فرانسس کے اس دوا کی مخالفت کرنے کی وجہ سے امریکہ میں نومولود بچوں میں جسمانی عیب کے صرف سترہ کیس سامنے آئے جبکہ اس دوا کے استعمال سے دنیا کے کل چھیالیس ممالک متاثر ہوئے تھے۔ پھر جب امریکی ادارے نے اس دوا کے محدود اور مشروط استعمال کی اجازت دی تو اس دوا کے ناموافق اثرات کو بھی اس کی پیکینگ پر ظاہر کیا گیا تھا۔

اس دوا کی مخالفت کرنے والی ڈاکٹر فرانسس اولڈ ہام کیلسے کینیڈا میں پیدا ہوئیں تھیں اور وہیں اس نے تعلیم پائی تھی۔ پھر یہ امریکہ آ گئیں تھیں جہاں اس نے ایک فارما کولوجسٹ سے شادی کرلی تھی۔ یہ جوڑا 1960ء میں واشنگٹن میں FDA کے لیے کام کر رہا تھا جب ڈاکٹر کیلسے کو نئی متعارف کرائی گئی مسکن

دوا تھیلیڈومائڈ کا جائزہ لینے کا کام سپرد کیا گیا۔ ڈاکٹر کیلسے نے مطالعہ کیا تھا کہ تھیلیڈومیڈ مریضوں میں دوران خون اور اعصابی نظام میں جلن Periahereral کا باعث بنتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ایسی شہادتیں بھی موجود نہیں تھیں کہ اس دوا کا استعمال محفوظ ترین ہے۔ اس دوا کے پوری دنیا میں استعمال کی وجہ سے امریکی ادارے FDA پر بہت شدید دباؤ تھا کہ اس دوا کو امریکہ میں بھی متعارف کرایا جائے تاہم ڈاکٹر کیلسے نے مزید معلومات بہم پہنچائے بغیر اس دوا کو منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر جب اس دوا کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوئیں تو اس نے ایک بار پھر اسے نامنظور کر دیا۔ اس وقت تک دنیا بھر میں اس دوا کے استعمال سے ہونے والے جینیاتی نقصانات ظاہر ہو چکے تھے۔

سیلی جین ڈرگ کارپوریشن کے اس دوا کے تعارف میں اس دوا کے ناموافق اثرات پر پردہ ڈال دیا تھا، جانوروں پر کیے جانے والے تجربات میں بھی اس دوا سے سائیڈ ایفیکٹس ظاہر ہوئے تھے جس کی وجہ سے انسانوں کے لیے اس دوا کے استعمال کی سائنسدانوں نے مشروط اور محدود اجازت دی تھی۔ 1960ء تک اس دوا کے استعمال سے نومولود بچوں میں جو عیب ظاہر ہوئے تھے ان کے باوجود عالمی طور پر حکومتیں اور حکومتی ادارے اس دوا کے استعمال کو روکنے میں ناکام رہے تھے۔ کئی اقوام عالم میں اس دوا پر پابندی عائد ہونے کے بعد بھی اس کا استعمال جاری رہا۔ جاپان میں اس دوا کو مزید ایک سال کے لیے حاملہ خواتین کے استعمال میں رہنے دیا گیا تھا۔ برطانیہ میں اس دوا کے استعمال پر نومبر 1961ء تک کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکی تھی۔ اس کی وجہ یہ مفروضہ تھا کہ اس دوا کے استعمال سے براہ راست کوئی نقصان نہیں پہنچا کیونکہ مارکیٹ میں متعارف کرائے جانے سے پہلے اس دوا پر بہت سے تجربات کیے جا چکے تھے۔ اس غلط مفروضے کی وجہ سے یہ دوا برطانیہ اور دیگر ممالک میں مستعمل رہی۔ 1960ء میں اس دوا کے استعمال پہ پابندی عائد کئے جانے سے پہلے اسی وجہ سے 12000 بچے دنیا بھر میں شدید جسمانی عیب لئے پیدا ہو چکے تھے۔

1959ء جاپان ٹائفون، وشیش ویرا کی زد میں

26 ستمبر 1959 کو جاپان کے چوتھے بڑے شہر ناگویا Nagoya نامی شہر میں 20 لاکھ انسانوں نے اس دور جدید میں آنے والے ایک شدید سمندری طوفان Typhoon کی سختیوں کو جھیلا وشیش ویرا Vicious vera نامی یہ طوفان ناگویا کے جنوبی حصے سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہوائیں 135 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھیں۔ اس سمندری طوفان سے اس پورے علاقے میں سیلاب آ گیا جس کی وجہ سے اس شہر کے نزدیک بہنے والے ایک دریا کا مغربی کنارہ بیٹھ گیا اور اس علاقے کے 1851 مکین ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ جبکہ 530000 افراد بے گھر ہو گئے۔ وسطی جاپان میں اس طوفان کی وجہ سے ہونے والی بارشوں کی وجہ سے ندی نالوں میں طغیانی آ گئی جس کی وجہ سے ریلوے لائنیں سینکڑوں مقامات سے ٹوٹ اور گاڑیوں کی آمد و رفت معطل ہو گئی۔ اس طوفان نے جاپان کے اور حصوں میں بھی بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائی جس سے ہلاک شدگان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور بہت سے مزید لوگ بے گھر ہو گئے۔

جاپان کا شہر ناگویا دوسری جنگ عظیم کے دوران بھی فضائی بمباری سے بری طرح متاثر ہوا تھا۔ مگر 1959ء تک اس شہر میں تعمیر نو اور بحالی کا کام بڑے پیمانے پر ہو چکا تھا اور یہ شہر دوسری جنگ عظیم کے اثرات سے نکل چکا تھا اور جاپان کی ایک بڑی بندرگاہ بن چکا تھا۔ اس شہر کی آبادی 1959 میں 23 لاکھ نفوس تھی۔ پھر 21 ستمبر کو سمندری طوفان کے آنے کی خبریں آنے لگیں۔ یہ اس سال آنیوالا پندرھواں ٹراپیکل سمندری طوفان تھا اور اس کے متعلق بہت کم معلومات بہم پہنچائی گئیں تھیں۔ جاپان میں امریکہ کے سفیر ایڈان او ریشور Edwino Rei schaur کے مطابق جو سمندری آفات سے آشنا ہیں اور ان سے پہنچنے والے نقصانات بھی ان کے لیے کوئی نئے نہیں ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں ایسے ہی سمندری طوفانوں نے جاپان کو قبلائی خان کے بھیجے ہوئے تاتاری بحری بیڑے کے حملوں سے بچایا تھا۔ ان سمندری طوفانوں کو جاپانی تاریخ میں ''خدائی ہوا Divine wind'' کا نام دیا گیا ہے۔

ایسے ہی ایک سمندری طوفان ویرا نے 26 ستمبر کی رات کے آخری پہر میں ناگویا پر حملہ کیا۔ یہ شدید ترین طوفانی حملہ تھا۔ اس کے ساتھ 17 فٹ بلند سمندری موجوں نے بھی اس علاقے پر دھاوا بول دیا۔ اور ڈیم، پل، گھاٹ اور عمارتوں کو بہا کر لے گئیں اس شہر میں واقع ایک پورا رہائشی اپارٹمنٹس کا بلاک

زمین بوس ہوگیا اور 84 سے زائد مکین اس کے ملبے میں پھنس کر رہ گئے۔ سمندری لہریں جلد ہی ان نشیبی علاقوں میں داخل ہوگئیں جو سمندر سے ہی حاصل کئے گئے تھے۔ پھر یہ لہریں عمارتی لکڑی کے گوداموں سے بڑے بڑے شہتیر اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں جو عمارتوں کو شدید نقصان پہنچانے لگے۔ 140 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی طوفانی ہوئیں مکانات اور عمارتوں کی چھتیں لے اڑی اور ہواؤں کی اس تیز رفتاری کی وجہ سے عمارتی ملبہ تباہ کن میزائلوں کی شکل اختیار کر گیا۔ بہت سے لوگ اس وقت پانی کی لہروں کی نذر ہوگئے جب دریائے شونائی Shonai کا مغربی کنارہ بیٹھ گیا جس کی وجہ 1800 افراد ہلاک ہوگئے۔ پولیس اور فوج کے ارکان اس طوفانی موسم میں انتہائی بہادری کے ساتھ لوگوں کو بلند مقامات پر منتقل کرنے میں مصروف تھے۔ پورے تین گھنٹے تک یہ طوفان شہر کی شاہراہوں اور گلیوں میں چنگھاڑتا ہوا نقصانات کرتا رہا پھر اس نے بحرالکاہل کا رخ کیا اور غائب ہوگیا۔

اگلے دن جب صبح ہوئی تو نیگویا کا ایک تہائی حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور باقی شہر کیچڑ اور گارے سے اٹا پڑا تھا۔ شہر کی گلیوں اور خلیج کے پانیوں میں انسانی لاشے بکھرے ہوئے تھے۔ کم از کم 20 بحری جہاز طوفان میں گھر کر خشکی پر چڑھ آئے تھے۔ زندہ بچنے والوں کو شدید مصائب کا سامنا تھا۔ اکثر انہیں کھانے کی اشیا تلاش کرنے کے لیے سیلاب کے آلودہ پانی میں اترنا پڑتا تھا۔ اکثر گھروں کے باورچی خانے بھی پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور گھروں کے باہر کے لان بھی اس لئے کھانے پینے کی اشیا ڈھونڈنا ایک دشوار کام بن گیا تھا۔ کچھ سیلاب زدگان نے اپنے ڈوبے ہوئے گھروں کو لٹیروں کے خطرے کی وجہ سے چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور کچھ اپنے قیمتی اسباب اپنے ساتھ اٹھائے ہوئے تھے اور کسی محفوظ مقام کی تلاش میں سرگردان تھے۔ سب سے بڑا ایمرجنسی کیمپ ریس کورس میں لگا دیا گیا تھا مگر اس کیمپ میں پناہ لینے والوں کو اگلے 30 گھنٹے تک پینے کا پانی میسر نہ آسکا تھا۔ لاشوں کو چٹائیوں میں لپیٹ کر یا تو عارضی مردہ خانوں میں رکھ دیا گیا تھا یا پھر وہ گیلی زمین پر بکھری پڑی تھیں نیگویا کا میئر ماتم کناں تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کٹ گئے ہیں کہ وہ اپنے شہریوں کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ جو کچھ اسے دکھائی دیتا وہ یہ ہے کہ پورا شہر سیلابی پانی کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر طرف لاشیں بکھریں ہوئیں ہیں۔ قرب و جوار کے گاؤں اور قصبات بھی سیلاب میں گھر چکے تھے۔ ایک قریبی قصبے ہینڈا Handa میں ایک بڑی سمندری موج نے 250 گھروں کو تباہ کر دیا تھا 300 افراد ہلاک ہوگئے تھے اور سیکڑوں لاپتہ ہو چکے تھے۔ جاپان کے 47 ضلعوں میں سے 38 ضلعے اس طوفان سے متاثر ہوئے تھے اور مسلسل بارشوں اور سیلابی پانی کے کھڑے ہونے کی وجہ سے امدادی کاروائیاں بہت کم رفتاری سے انجام پا رہی تھیں۔ امریکی بحریہ کے ہیلی کاپٹروں نے بلند مقامات پر کھانے پینے کا سامان اور دیگر اشیا گرائیں اور گھروں کی چھتوں

پر پھنسے ہوئے سیلاب زدگان کو محفوظ مقامات تک پہنچایا۔ 30 ستمبر تک جاپانی فوج کے 9000 دستے امدادی کاروائیوں میں مصروف ہوگئے۔ مگر سیلابی پانی ابھی تک امدادی کاروائیوں میں رخنہ انداز تھا۔ سیلاب زدہ علاقوں میں لوگ آلودہ پانی اور خراب خوراک استعمال کرنے پر مجبور تھے جس کی وجہ سے اسہال کی وبا پھیل گئی تھی اور ادویات کی سخت کمی تھی۔

اس آفت کی آمد کے چھ دن بعد اخبار ٹائمز کے نمائندے ہیلی کاپٹروں اور کشتیوں میں بیٹھ کر نقصانات کی کوریج کر رہے تھے۔ ان کے الفاظ میں اس علاقے میں بلڈنگیں ایسے بیٹھ گئیں تھیں جیسے گتے کے ڈبے اور بہت سے افراد ابھی تک عمارتوں کی چھتوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ اس قدرتی آفت سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد تقریباً 5000 تھی جبکہ سینکڑوں افراد لاپتہ ہوگئے تھے۔ 30000 افراد زخمی ہوئے تھے اور تقریباً 120000 عمارتیں زمین بوس ہوگئیں تھیں جس سے تقریباً 20 لاکھ افراد بے گھر ہوگئے تھے۔ اخبار ٹائمز نے لکھا کہ اتنے بڑے پیمانے پر جانی مالی نقصان پہنچنے کی وجہ یہ تھی کہ سیلاب کی آمد سے پہلے احتیاطی تدابیر نہ ہونے کے برابر اختیار کی گئیں تھیں۔ ٹائمز کا نمائندہ جب نیگویا کے میئر کو ملنے کے لیے اس کے دفتر پہنچا تو اس نے وہاں بہت سے سرکاری افسروں کو آپس میں لڑتے ہوئے دیکھا۔ میئر نے اس کی وضاحت یہ کی کہ علاقے کے لوگ اس آفت کا ذمہ دار آسمان کو ٹھہرانے کی بجائے سرکاری حکام کو ٹھہرا رہے ہیں کہ جن کی بدانتظامی سے اتنا شدید جانی ومالی نقصان پہنچا تھا۔

1958ء..... ماؤزے تنگ، کمیونسٹ دنیا کا دوسرا اسٹالن

مشہور روسی راہنما خروشیف نے کہا تھا کہ جب میں نے چینی راہنما ماوزے تنگ کو دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کے عالی جناب چینی راہنما ہمارے (روس کے) راہنما اسٹالن کی ایک فوٹو کاپی ہیں۔ بقول خروشیف ان دنوں چین میں ماؤ کے حکم پر گرفتار شدگان کے لیے مجرموں کی پوری پوری کالونیاں آباد ہو چکی تھیں۔ ماؤ کے حکم پر بہت سے گرفتار شدگان کو ہیلونگ جیانگ Heilonjiang کے سرد جہنم میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ جہاں درجہ حرارت کے کم ہونے کی وجہ سے آدھے سے زیادہ قیدی سردی سے ٹھٹھر کر مر گئے تھے۔ یہ ماوزے تنگ کی طرف سے چین میں جاری کردہ پروگرام Great, leap forward کی صریح ناکامی تھی جو چین کو قحط سالی کی طرف لے گئی تھی۔ مئی 1958ء میں ماوزے تنگ نے ایک بڑی جست Greatleap for word نامی پروگرام متعارف کرایا تھا۔ جو روسی راہنما اسٹالن کے روس میں متعارف کردہ پروگرام "پانچ سالہ منصوبے کی کاپی تھا۔ اس پروگرام کے نتائج بالکل ویسے ہی نکلے تھے۔ جیسے اسٹالن کے پروگرام پنجسالہ منصوبے کے نکلے تھے۔ دیہاتوں میں اس پروگرام کی وجہ سے حالات خراب سے خراب تر ہوگئے تھے۔ اس سے ماؤ کو اپنی حیثیت کے پارٹی کی نظروں میں گر جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا اسی وجہ سے ماؤ نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ایک متبادل پلیٹ فارم پیپلز لبریشن آرمی تشکیل دیا تقریباً اسی زمانے میں ماؤ نے چینی کمیونسٹ پارٹی میں سرمایہ دار عناصر کے گھس آنے کی بھی شکایت کی اور بیوروکریسی کی ملامت کی۔ اور کہا کہ یہ لوگ اپنے ذاتی مفادات کو عوام کے مفادات پر ترجیح دے رہے ہیں۔

ان دنوں چین میں غلے کی پیداوار روس سے بھی کم تھی اور چین میں قحط پڑنے کا خطرہ بھی بری طرح منڈلا رہا تھا خروشیف نے ان حالات میں ماؤزئے تنگ کو خبردار کیا کہ وہ سوویت یونین کی ماضی کی غلطیوں کو نہ دہرائے تاہم اسے پتہ چلا کہ چینی راہنما خود کو خدا کے احکام کی تعمیل کے لیے بھیجا گیا خدا کا فرستادہ سمجھتا ہے۔ گریٹ لیپ فارورڈ پروگرام میں اشتراکی زراعت کی ناکامی اور اجتماعی کاشتکاری کی ناکامیاں ماؤزے تنگ کے لیے پریشانی کا باعث نہیں تھیں۔ اس نے تمام نتائج سے صرف نظر کرتے ہوئے چینی کسانوں کو کسی طریقے پر بھی نجی کاشتکاری سے منع کر دیا اور انہیں اجتماعی کاشت کاری میں

شمولیت کرنے پر زور دیا جس کے بدلے میں کاشتکاروں کو صلے کے طور پر ضروریات زندگی
جاتیں تھیں۔ بہت سے کسانوں کے لیے یہ طریقہ محنت کا صحیح طور پر دیا گیا صلہ نہیں تھا۔ ہر
اجتماعی باورچی خانوں میں ملتا تھا۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہوئی کہ ماؤ کے حکم پر خاندانوں
کر دیا گیا۔ مرد اور عورت الگ الگ کاموں پر بھیج دیئے گئے جبکہ بچوں کو پرورش کے لیے دارالاطفال
دیا گیا اوپر سے سرکاری طور پر پروپیگنڈہ کیا گیا کہ خاندان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ دنیا میں
سے زیادہ پیارے اگرچہ والدین ہوتے ہیں مگر وہ بھی چیئرمین ماؤزے تنگ سے زیادہ اہم نہیں
ان کو بھی اس سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ مگر جلد ہی ماوزے تنگ کی زرعی حکمت عملیوں کا
اسٹالن کی حکمت عملیوں جیسا ہی نکلا جو قحط سالی اور بھوک تھا۔ 50-1959 کا موسم بہار چین کے لیے
خطرناک ثابت ہوا۔ اس موسم میں چین کی آدھی قابل کاشت زمینیں خشک سالی اور سیلابوں کا
ہوگئیں۔ 1955ء میں چین میں غلے کی پیداوار 170 ملین ٹن تھی جبکہ 1960 میں یہ کم ہو کر 143 ملین
ٹن رہ گئی۔ چین کے صوبے ہینان کی ایک خاتون نے اپنی یاداشتوں لکھا تھا کہ 1960ء میں غلے کی
پیداوار رہ جانے کی وجہ سے ایک گاؤں میں قحط پڑ گیا اور درجنوں افراد کی لاشیں بے گور وکفن کھیتوں میں
پڑی نظر آنے لگیں۔ جبکہ بھوکوں مرنے والے بہت سے زندہ بچ جانے والے افراد بھی ان لاشوں میں
پڑے ہوئے رینگتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ بے چارے کھیتوں میں بھوکے مرتے ہوئے گھاس کے تنکے
اور بیج تلاش کر کے کھانے پر مجبور تھے یا کیچڑ میں لتھرے ہوئے مینڈکوں کو پکڑ کر کھانے کے لیے کوشاں
نظر آتے تھے۔ بھوک سے مرتے ہوئے بعض لوگ انسانی لاشوں سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر کھانے پر
مجبور ہوگئے تھے۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ بیلوں کو اور دوسرے مویشیوں کو جب کھانے کو
گھاس بھی میسر نہ رہی تو وہ ہلاک ہوگئے جس کے بعد لوگ کتے کھانے پر مجبور ہوگئے۔ دوسری طرف
کمیونسٹ پارٹی کے ارکان نے لوگوں کے چوزے اور بطخ بحق سرکار میں ضبط کر لیں کیونکہ اس گاؤں کے
لوگ غلہ کی کافی پیداوار کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس گاؤں میں تین سال تک عورتوں نے کسی بچے کو جنم
نہیں دیا جس کی وجہ سے اس گاؤں میں بچوں کے رونے کی آوازیں بھی سنائی نہیں دیتیں تھیں۔ جب اس
گاؤں کے کسانوں کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں رہا تو وہ اتنے کمزور ہوگئے کہ آئندہ کاشت کاری
کرنے سے قاصر ہوگئے۔ جن کسانوں نے اناج چھپانے کی کوشش کی ان کو پارٹی کے ارکان نے بڑے
وحشیانہ انداز میں زدوکوب کیا ایک امیر کسان کی بیوہ کو اس کے بچوں سمیت محض غلہ چھپانے کی پاداش
میں زندہ درگور کر دیا گیا، اس گاؤں میں 300 افراد رہتے تھے ان میں سے اس قحط کے پڑنے کے بعد
صرف 20 افراد زندہ بچے تھے۔

کمیونسٹ پارٹی کے ایک مقامی سیکرٹری نے 200 افراد سے غلہ چھین کر ان کو بھوکوں مرنے پر مجبور کر دیا جبکہ یہ غلہ اس نے اعلیٰ حکام کے لیے محفوظ کر لیا۔ قحط سالی بڑھ جانے کے بعد نوبت آدم خوری تک پہنچ گئی۔ مگر اس جرم کی کوئی سزا نہیں دی جاتی تھی کیونکہ ریاست کے خلاف سرزد ہونے والے دوسرے جرائم اس جرم سے زیادہ سزا کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ ایک پندرہ سالہ لڑکی جس نے اپنے چھوٹے بھائی کی لاش کو کھا کر خود کو زندہ رکھا تھا اس کو اس جرم کی پاداش میں جیل بھجوا دیا گیا جہاں وہ فاقہ کشی کی وجہ سے خود بھی مر گئی۔ ہینان کے ایک قصبے Xinyang میں ایک بے رحم ماں نے ایک سور کو جو اس کے گھر میں آدھی رات کے بعد گھس آیا مار کر خود کو زندہ رکھا اور اس کا باقی گوشت کو چھپا لیا اور اس گوشت میں سے ایک بوٹی تک اپنے پانچ سالہ بیٹے کو کھانے کو نہیں دی کیونکہ وہ ڈرتی تھی کہ وہ اس کا یہ راز افشا کر دے گا۔ آخر وہ بچہ بھوک سے مر گیا۔ صوبہ ہینان میں ہزاروں لوگ قحط سالی کی وجہ سے بھوکوں مر گئے۔ مگر ان حالات میں بھی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان بہت کم اس قحط سالی سے متاثر ہوئے کیونکہ انہیں اسپیشل اجتماعی کھانا گھروں سے کھانا ملتا تھا۔ تاہم وہ قربانی اور ایثار کا نعرہ لگاتے تھے۔ چیرمین ماؤ نے خود گوشت نہ کھانے کا اعلان کیا تھا۔ جدید زمانے میں پڑنے والا یہ قحط پوری چینی تاریخ میں ایسا قحط تھا جو یکساں پورے ملک میں پڑا تھا۔ اس قحط سے سب سے زیادہ متاثر وہ علاقے ہوئے تھے جہاں ماؤ کے خصوصی پیروکاروں کی حکومت تھی۔ ان علاقوں میں سچوان Sichuan کا علاقہ سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا اگرچہ یہ چین کے زرخیز ترین علاقوں میں سے ایک تھا۔ اسی علاقے میں قحط زدگی سے سب سے زیادہ ہلاکتیں رونما ہوئی تھیں۔

1960ء..... چلی میں آنے والا ہولناک زلزلہ

22 مئی 1960ء کو زلزلہ پیماؤں پر اب تک ریکارڈ کیا جانے والا دنیا کا سب سے شدید زلزلہ جنوبی امریکہ کے ملک چلی میں آیا۔ یہ ریکٹر اسکیل پر 9.5 درجہ کا حامل زلزلہ تھا۔ اس زلزلے نے جنوبی چلی کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ علاقہ چلی کے دارالحکومت سان ڈیاگو سے دو سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ 750 میل لمبی فالٹ لائن پر اس زلزلے نے شدید جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ اس زلزلے کے بعد درجنوں مزید جھٹکے محسوس کیے گئے جو ریکٹر اسکیل پر 6.0 درجے کے تھے اتنے شدید زلزلے سے سونامی کا پیدا ہو جانا بھی ایک قدرتی امر تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس زلزلے اور سونامی سے 5 ہزار افراد ہلاک اور 3 ہزار سے زائد زخمی ہوئے اور مالی نقصانات کا اندازہ 400 ملین ڈالر تھا۔ چلی کے ساحل کے ساتھ ساتھ سونامی نے تباہی مچائی اور مزید ہلاکتوں کا سبب بنا۔

بحر الکاہل کے حلقے کو زلزلوں کی آمد کی وجہ سے اکثر آگ کا حلقہ Ring of Fire کہا جاتا ہے۔ اسی حلقے یا علاقے میں اکثر دنیا کے شدید ترین زلزلے آتے رہتے ہیں جو ریکٹر اسکیل پر 9.0 درجہ سے بھی زیادہ کے ہوتے ہیں۔ اس حلقے میں 1950 سے 2005 تک جو بڑے زلزلے آئے وہ یہ تھے چلی 1960 میں 9.5 درجے کا زلزلہ، الاسکا 9.2درجے کا حامل زلزلہ، سماٹرا 2004 ، 9.1درجہ کا حامل ہولناک زلزلہ اور کاما چاٹکا Kama chatk ۔ 1952 ، 9.0 درجے کا زلزلہ۔ یہ مقامات جن پر یہ شدید زلزلے آئے ایسے مقامات ہیں جہاں زمین کی اندرونی پرتیں مسلسل متحرک رہتی ہیں۔ اکثر اوقات جب یہ زمینی پرتیں حرکت کرتی ہیں تو کوئی روکاوٹ پیش آنے کی وجہ یہ حرکت رک جاتی ہے اور جب یہ زمینی پرتیں اس رکاوٹ سے نکلتی ہیں تو اس سے پیدا ہونے والی توانائی زلزلوں کا سبب بنتی ہے۔ چلی کے ساحل کے قریب سمندر کی ارضیاتی پرتیں اور براعظمی پرتیں متحرک رہتیں ہیں یہی اس زلزلے کا مرکزی مقام Epicentre تھا۔ اس زلزلے کے نتیجہ میں Concepcion کے شمال میں واقع علاقے میں زمین کی سطح تین فٹ بلند ہوگئی تھی جبکہ جنوب میں سطح زمین پانچ فٹ تک بلند ہوگئی تھی۔ زلزلے کا مرکز سمندر میں واقع ہونے کی وجہ سونامی پیدا ہوا تھا جس کی لہریں 20فٹ بلند ہو کر ساحل پر چڑھ دوڑیں تھیں جس سے 10 لاکھ مکانوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔

1835ء میں مشہور برطانوی سائنسدان چارلس ڈارون Concepcion شہر میں موجود تھا۔ اس نے اس شہر میں اس سال آنے والے ایک شدید زلزلے کا احوال قلمبند کیا تھا۔ وہ 4 مئی 1835ء کو Concepcion پہنچا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے یہ شدید زلزلہ آیا تھا۔ تاہم یہ زلزلہ 1960ء میں آنے والے زلزلے جتنا شدید نہیں تھا۔ مگر ڈارون کی مرتب کردہ رپورٹ کے مطابق یہ زلزلہ بھی شدید نقصانات کا باعث بنا تھا۔ ڈارون کو بتایا گیا تھا کہ 70 گاؤں مکمل طور پر تباہ ہوگئے تھے اور بڑی بڑی سمندری لہریں خشکی پر چڑھ آئیں تھیں۔ ڈارون نے خود بھی شہر میں تباہ شدہ لکڑی کے فرنیچر کے ملبے کے ڈھیر لگے ہوئے دیکھے تھے جو اس کے مطابق ایک ہزار بحری جہازوں کا ملبہ دکھائی دیتا تھا، تاہم خوش قسمتی سے اس زلزلے سے ہلاک ہونیوالوں کی تعداد ایک سو سے بھی کم تھی۔

1960ء میں آنے والے زلزلے سے چلی کے ساحل پر 40فٹ بلند سونامی کی لہریں چڑھ دوڑیں تھیں جبکہ کئی مقامات پر ان لہروں کی بلندی 70 فٹ سے زائد بھی دیکھی گئی تھی۔ ان لہروں نے ساحل پر موجود ریت کے ٹیلوں کو 1500 فٹ خشکی کے اندر تک پہنچا دیا تھا۔ ایک مقام پر جہاں سونامی کی لہریں در آئیں تھیں ساحلی ریت خشکی میں چھ میل اندر تک دکھائی دی تھی۔ چلی میں آئے زلزلے سے پیدا ہونے والا سونامی اگلے 24 گھنٹوں میں بحرالکاہل کے پورے حلقے کے ساحلی مقامات تک پہنچ گیا تھا یہ سونامی الاسکا کے ساحل سے زلزلے کی آمد کے 18 گھنٹوں کے بعد ٹکرایا تھا جبکہ جاپان جیسے مشرقی ایشیائی ملک کے ساحلوں تک پہنچنے میں اسے 22 گھنٹے لگے تھے۔ اور جزائر ہوائی تک یہ 15 گھنٹوں میں پہنچا تھا۔ یہ لہریں 400 سے 500 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ان مقامات تک پہنچی تھیں۔

1960ء..... نیویارک شہر پر ہونے والا فضائی تصادم

16 دسمبر 1960ء کی صبح کو دو ایئر لائنز کے ہوائی جہاز نیویارک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک یونائیٹڈ ایئر لائنز کا DC8 تھا اور دوسرا ٹرانس ورلڈ ایئر لائنز کا سپر کانسٹیلیشن constelallation پروپیلر ہوائی جہاز نیویارک کا جان ایف کینیڈی ایرپورٹ ان دنوں لاگارڈیا Lagaurdia ایرپورٹ کہلاتا تھا۔ اس ایرپورٹ کے ایئر کنٹرولرز نے جب ان دونوں جہازوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اسے خاموشی کے سوا کچھ نہ ملا۔ یہ دونوں طیارے نیویارک شہر کے گنجان آباد ترین علاقے پر فضا میں ٹکرا گئے تھے۔ اور ان دونوں جہازوں کا ملبہ زمین پر آ گرا تھا۔ ان دونوں جہازوں پر سوار 134 مسافروں میں سے زیادہ تر خوشگوار چھٹیاں گذار کر واپس آنے والے طالب علم تھے جو نیویارک کی ایک برفانی صبح عین شہر کے اوپر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ جبکہ جہازوں کا ملبہ آبادی پر گرنے سے 6 افراد زمین پر ہلاک ہوگئے تھے۔

TWA کی پرواز سٹیٹن آئی لینڈ پر جا گری تھی جبکہ یونائیٹڈ ایرلائنز کا طیارہ قلابازیاں کھاتا ہوا بروکلین میں آ گرا تھا۔ یہ اس زمانے میں امریکہ کی فضائی تاریخ کا بدترین حادثہ تھا۔ ٹرانس ورلڈ ایرلائنز کا طیارہ لاگارڈیا ایرپورٹ کی طرف بڑھ رہا تھا جبکہ یونائیٹڈ ایئر لائنز کا DC8 آئلڈ وائلڈ ایرپورٹ پر لینڈ کرنے والا تھا اور شہر پر سے گذر رہا تھا۔ جیسے ہی یہ دونوں طیارے ایک دوسرے نزدیک پہنچے لاگارڈیا ایرپورٹ کے ایرٹریفک کنٹرول نے TWA کے پروپیلر طیارے کو متنبہ کیا کہ اس کے دائیں طرف جیٹ طیاروں کی ٹریفک گذر رہی ہے مگر انتباہ کا TWA کے طیارے نے کوئی جواب نہیں دیا عین اسی لمحے یونائیٹڈ ایر لائنز جیٹ مسافر برادر طیارہ کو جسے آئیڈلڈ وائلڈ ایرپورٹ نے 5000 فٹ کی بلندی پر رہنے کے لیے کہا تھا، لینڈنگ کی ہدایات دی گئیں جن کا بھی کوئی جواب نہیں دیا گیا ایک دوسرے سے ٹکرانے کے بعد ڈی سی 8 طیارہ نیویارک کے گنجان آباد علاقے بروکلین میں گرا اور اس نے ایک گرجا گھر تباہ کر دیا اور جہاز کا تباہ شدہ ڈھانچہ 20 فٹ زمین کے اندر تک گھس گیا۔ ڈی سی 8 کا دم والا حصہ ایک شاہراہ پر گرا اور کئی کاروں کو تباہ کرتا چلا گیا۔ جہاز کے ٹینکوں میں موجود پٹرول ادھر ادھر پھیل گیا اور کئی عمارات اور ایک کار میں آگ بھڑک اٹھی جہاز کے ڈھانچے سے ایک گیارہ سالہ لڑکا رینگتا ہوا باہر نکلا تو اس کے

کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دو پولیس والے اسے جلتے ہوئے جہاز کے ڈھانچے سے دور لے گئے اور برف پر لٹا کر اس کے کپڑوں کی آگ کو بجھا دینے میں کامیاب ہوگئے۔ طبی امداد دیے جانے کے چند گھنٹوں کے بعد بری طرح جھلس جانے اور ایک ٹانگ کے ٹوٹ جانے کے باوجود یہ لڑکا نیویارک کے میتھوڈسٹ ہسپتال میں بیٹھ کر بات چیت کرنے کے قابل ہوگیا تاہم دو دن بعد اس کی موت واقع ہوگئی۔ چونکہ وہ آگ لگ جانے کے بعد جہاز میں شعلوں کے درمیان گھر گیا تھا اتنے شدید درجہ حرارت میں سانس لینے کی وجہ سے اس کے پھیپھڑوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ اور یہی اس کی موت کی وجہ تھی۔ جہاز کے کرش ہونے کے بعد اسے جو مختصر وقت ملا اس میں اس نے بتایا کہ جہازوں کا تصادم ایک شدید دھماکے کے ساتھ ہوا تھا جس کے بعد جہاز زمین پر گرنے لگا تو لوگوں نے چیخنا اور پکارنا شروع کر دیا تاہم وہ اپنی سیٹ پر ہی بیٹھا رہا تھا۔

امریکی بحریہ ایرفورس اور آرمی سے ہنگامی طور رآگ بجھانے کے لیے امدادی جماعتیں جلد ہی موقع پر پہنچ گئیں اور آگ پر قابو پانے کی کوششوں میں مصروف ہوگئیں۔ ڈی سی 8 کے گرنے سے جو گرجا کی عمارت منہدم ہوگئی تھی اس میں دس مزید رہائشی عمارتوں کے ساتھ ساتھ آگ بھڑک اٹھی۔ جہاز کا ایک ونگ ٹوٹ کر ایک رہائشی عمارت کی چھت کو توڑتا چلا گیا تھا جبکہ جہاز کا عقبی حصہ ایک شاہراہ کے وسط میں جا گرا تھا آگ بجھانے والا عملہ بدقت جہاز کے ڈھانچہ میں گھس کر لاشیں نکال کر عارضی مردے خانوں میں رکھ رہا تھا۔

شام ہوتے ہی آگ بجھانے والے عملے نے اپنی ہنگامی لائٹین روشن کر دیں اور جہاز کے ڈھانچے اور جلی ہوئی عمارتون سے لاشیں نکالنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ لوگوں کی ذاتی اشیا بھی اکٹھی کر رہے تھے تاکہ ان کی پہچان کی جاسکے۔ شام ہوتے ہی نیویارک کی گیلی شاہراہوں پر برف جم گئی جو امدادی کاروائی میں رکاوٹ کا باعث بنی۔ اس کام میں مزید رکاوٹ اس وقت پڑی جب اس حادثے کی اطلاع ملنے کے بعد لوگوں کے جم غفیر مقام حادثہ پر جمع ہوگئے۔ ان حالات میں ریڈ کراس اور سیلویشن آرمی جیسی تنظیموں نے امدادی کاروائیاں کرنے والوں کو گرم کافی اور دیگر ریفرش منٹ پیش کیں۔

TWA کے پائلٹ نے حادثے کے بعد اپنا جہاز ملر فیلڈ میں اتارنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا جہاز زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک دھماکے سے تین حصوں میں منقسم ہوگیا تھا۔ اور اس کا ملبہ جزیرہ سٹیٹن کے ایرفیلڈ پر بکھر گیا تھا اس جہاز کے مسافروں کی لاشیں سمندر میں جا گری تھیں۔ زندہ بچنے والوں کی امداد کے لیے امدادی کشتیاں موقع پر پہنچیں، انہیں چھ مسافر زندہ ملے مگر وہ ہسپتال پہنچ کر دم توڑ گئے۔ سارے دن امدادی کاروائیاں جاری رہیں۔ شام ہوتے ہی جہاز کے مسافروں کے لواحقین موقع پر پہنچ گئے اور

امدادی کاروائیوں میں مداخلت کا باعث بنے حادثے کے بعد لوگوں کے ذہن میں بالآخر یہ سوال ابھرا کہ آخر اتنا بڑا فضائی حادثہ کیونکر رونما ہوا؟ آخر اس کا جواب فیڈرل ایوی ایشن ایڈمنسٹر نے اپنی ایک رپورٹ میں دیا۔ اس رپورٹ کے مطابق ڈی سی 8 کا پائلٹ اس حادثے میں قصور وار تھا۔ حادثے کے وقت اس کا جہاز 9 میل اپنے راستے سے ہٹ کر TWA کے طیارے کے راستہ میں آ گیا تھا۔ مزید یہ کہ وہ ٹریفک کنٹرول کی ہدایات کے مطابق 207 میل فی گھنٹہ کی رفتار پر پرواز کرنے کی بجائے 346 میل فی گھنٹہ کی رفتار پر پرواز کر رہا تھا۔ اس حادثے میں دونوں جہازوں پر سوار 134 افراد اور زمین پر موجود 6 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ اس لیے کل اموات 140 واقع ہوئیں تھیں۔ یہ حادثہ ہوائی جہاز ایجاد کیے جانے کی 57 ویں سالگرہ کے دن رونما ہوا تھا اور جیسا کہ پہلے ذکر آیا تھا کہ اس وقت تک امریکہ کی فضائی تاریخ کا بدترین حادثہ تھا۔

کسی بڑے شہر کی فضا میں ہونے والے ایسے فضائی حادثات، فضائی سفر کے بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ سے ہمیشہ سے ایک چیلنج کی حیثیت رہے ہیں۔ ایسے حادثات زیادہ تر انسانی غلطیوں سے رونما ہوتے ہیں۔ اس کی کئی اور مثالیں بھی موجود ہیں۔ جیسے TWA 800 کی پرواز 17 جولائی 1996ء کو نیویارک میں سے فضا میں بلند ہونے کے فوراً بعد فضا میں پھٹ گئی تھی۔ اسی طرح مصر کی قومی ایرلائن کا طیارہ 31 اکتوبر 1999 کو نیویارک سے فضا میں بلند ہونے کے بعد لانگ آئی لینڈ کے قریب سمندر میں جا گرا تھا۔

1960ء میں جیٹ ہوائی جہاز بھی ابھی ابتدائی مرحلے سے گذر رہے تھے اور آج کے جیٹ ہوائی جہازوں کا معیار نہیں رکھتے تھے۔ مگر بہت سی حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے بعد اور فضائی سفر کو محفوظ بنانے کی کوششوں کے باوجود بھی آج بھی فضائی حادثات سے بچا نہیں جا سکتا ہے۔

1963ء..... اٹلی میں وایونٹ ڈیم کی تباہی

9 اکتوبر 1963ء کو صبح 10 اور 11 بجے کے درمیان ایک بڑی پانی کی لہر شمالی اٹلی میں واقع وایونٹ ڈیم Vaiontdam کو توڑتے ہوئے نکلی اور راستے میں آنیوالی ہر شے کو تباہ کرتی چلی گئی۔ پانی کے اس طوفانی ریلہ نے 2600 سے زائد افراد کو ہلاک کر دیا۔ یہ طوفانی ریلہ ڈیم سے اس وقت نکلا جب 70 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے 350 ملین کیوبک گز کا ایک بڑا چٹانی تودہ ایک پہاڑ سے پھسل کر ڈیم میں جا گرا تھا۔ اس تودے کے گرنے سے ایک بڑی سونامی لہر ڈیم سے ابھر کر نکلی اور نیچے وادی میں تباہی مچاتی چلی گئی۔ یہ اپنی طرز کا بدترین حادثہ تھا جو ارضیاتی تحقیق کے بغیر یہ ڈیم تعمیر کرنے کی وجہ سے تاریخ عالم میں رونما ہوا۔

جدید انسانی معاشرے میں متعدد بار ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو ہمیں کسی بات کی یاددہانی کراتے ہیں تاہم ہم پھر بھی احتیاطی کاروائی یا اقدام اٹھانے سے گریزاں رہتے ہیں۔ وایونٹ ڈیم کی ناکامی ایک ایسی ہی مثال ہے اس سے بچنے کے لیے اگر پہلے سے موجود سینٹ فرانسس ڈیم اور ٹیٹان ڈیم Tetondam کی ناکامیوں کی مثالوں سے اگر فائدہ اٹھایا جاتا تو یہ حادثہ رونما نہ ہوتا، مگر اس ڈیم پر کام بھی کافی ارضیاتی تحقیق کئے بغیر ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ جن دنوں یہ ڈیم تعمیر کیا جارہا تھا انہیں دنوں ہی عمودی طور پر بلند پہاڑوں میں گر بڑ کے آثار نظر آنے لگے تھے تاہم اس ڈیم کی تعمیر کو موخر کرنے کی بجائے اور ارضیاتی سروے مکمل کرنے کی بجائے انجینئروں نے غلط فیصلہ کرتے ہوئے اس ڈیم کی تعمیر کو جاری رکھا۔

یہ ڈیم اٹلی کے چونے کے پتھروں پر مشتمل پہاڑوں کے درمیان سے گذرنے والے ایک دریا Piave river پر باندھا گیا تھا جو وینس کے شمال میں 60 میل کے فاصلے پر اطالوی الپس میں واقع ہے۔ پہاڑوں میں بلند مقامات پر اس ڈیم کی تعمیر کا مقصد میلان Milan اور دوسرے بڑے اطالوی صنعتی شہروں کے لئے ہائیڈروالیکٹرسٹی پیدا کرنا تھا۔ اس ڈیم کے گرد واقع پہاڑوں کی بلندی 7200 فٹ سے 8200 فٹ تھی اور ان کے نیچے ایک وادی عمیق گہرائی میں واقع تھی۔ ڈیم اس وادی سے 900 فٹ کی بلندی پر تعمیر کیا گیا تھا اور دنیا میں تعمیر کئے جانے والے بلند ترین ڈیموں میں دوسرے نمبر پر آتا تھا۔

چونے کے پتھروں میں پانی سے کمزوری کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسے پتھروں پر مشتمل پہاڑ
تودے گرنے کے واقعات اکثر اوقات رونما ہوتے رہتے ہیں۔

ڈیم کا منصوبہ تیار کرنے والوں کو اس بات کا علم تھا کہ جہاں یہ ڈیم تعمیر کیا جا رہا ہے وہاں ماضی
تودے گرنے کے لاتعداد واقعات رونما ہو چکے ہیں۔

1960ء میں اس ڈیم کی تعمیر مکمل ہوئی۔ پھر جب تعمیر مکمل کیے جانے کے بعد اس ڈیم میں
چھوڑا گیا تو اس ڈیم کے پہلوؤں میں تودے گرنے کے خطرات پیدا ہو جانے کا مشاہدہ کیا گیا۔
مشاہدے سے انجینئروں کو اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہوئی کہ پانی کی مقدار اور رفتار آس پاس کی
چٹانوں کو متاثر کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ عام لوگوں نے بھی مشاہدہ کیا کہ اس ڈیم کے قریب میں واقع
ایک پہاڑ کی چوٹی کے قریب زمین میں دراڑیں پڑنے لگیں تھیں۔ جس سے نیچے وادی میں رہنے والے
ہزاروں کسان اس 900 فٹ بلند ڈیم کی تعمیر سے بے چین تھے اور اس کی موجودگی سے خطرہ محسوس کرتے
تھے۔ اس کی تعمیر کے تین سال بعد بھی نیچے وادی میں موجود گھروں پر یہ ڈیم مسلسل خطرے کی تلوار بن کر
لٹک رہا تھا۔

جو انجینئر اس ڈیم کی دیکھ بھال اور مرمت کے لیے اس ڈیم کے قریب رہتے تھے وہ بھی تودے
گرنے کے خطرات کو اکثر محسوس کرتے تھے۔ ان کے نزدیک چونے کے خشک پہاڑوں کے درمیان پانی
کا وجود خطرناک تھا۔ ان انجینئروں نے ان خطرات پر مشتمل ایک رپورٹ مرتب کر کے روم میں حکومت کو
بھجوا دی۔ جب وہ اس رپورٹ کے جواب ملنے کے انتظار میں تھے تو موسم میں ریکا یک تبدیلی آ گئی۔
مہینوں تک گرم اور خشک موسم رہنے کے بعد ایک زور دار بارش ہوئی اور اس کے ساتھ ایک طوفانی ہوا بھی
چلی۔

اکتوبر 1963 کے آغاز میں پہاڑوں کے اطراف و جوانب میں بھی تبدیلی دیکھنے میں آئی اور بارش
کے بعد یہ پہاڑ پانی سے سیراب ہو گئے۔ اس سے پہلے ستمبر میں بھی وادی کے اطراف و جوانب میں
تودوں کے سرکنے کے آثار دکھائی دیئے تھے۔ 8 اکتوبر کو یعنی اس سانحہ کے رونما ہونے سے صرف ایک
دن پہلے تودے سرکنے کی رفتار 16 انچ فی دن تک پہنچ گئی تھی جو انتہائی خطرناک تھی۔ پھر 9 اکتوبر کو یہ
رفتار مزید دوگنا ہو گئی۔ جانوروں نے اس خطرے کو بھانپ لیا اور وہ یہ علاقہ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ڈیم پر
متعین انجینئروں نے بھی خطرہ محسوس کرتے ہوئے ڈیم میں پانی کی سطح کم کر دی۔ مگر حیرانی کی بات یہ تھی
کہ انجینئروں کے جھیل میں پانی کی سطح کم کرنے کے باوجود یہ سطح بڑھنے لگی جس کی وجہ جھیل کے پانی میں
تودے کا رینگتے ہوئے اترنا تھا۔ آخر 9 اکتوبر کی شام کے اوقات میں چونے کے پتھر کا ایک بڑا تودہ اور

اس کے ساتھ مٹی اور پتھر جو ایک میل کی کشادگی اور لمبائی رکھتے تھے اور تقریباً ایک ہزار فٹ موٹائی کے حامل تھے دھاڑتے ہوئے پہاڑوں کی اطراف سے اس جھیل میں آ گرے جس سے ایک بہت بڑی مقدار میں پانی جھیل سے باہر ابل پڑا۔ اس پانی سے بننے والی لہر تقریباً تین سو فٹ بلند تھی۔ پھر یہ طوفانی لہر کسی بڑے سونامی کی طرح ڈیم کے اوپری حصے کو بہا کر لے جاتے ہوئے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ نیچے وادی میں اتر گئی۔ اگرچہ اس سونامی کے ابھرنے کے بعد بھی ڈیم موجود رہا مگر اس سونامی نے نیچے وادی میں بڑے پیمانے پر تباہی مچا دی پانی کی یہ سینکڑوں فٹ طویل لہر اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو بہا کر لے گئی۔ وادی میں موجود گاؤں ایک بعد ایک اور اسی طرح ان میں موجود گھر خشک و خاشاک کی مانند بہتے چلے گئے اور اپنے پیچھے ملبے اور کیچڑ کے ڈھیر اور انسانی لاشے چھوڑتے چلے گئے۔ جو لوگ نیچے وادی میں بہت دور دراز کے فاصلے پر آباد تھے انہوں نے پانی کے اس سونامی کو کسی طوفان کی مانند چنگھاڑتے دھاڑتے ہوئے اپنی طرف انتہائی تیز رفتاری سے بڑھتے دیکھا۔ وادی کے ایک گوشے میں آباد لونگ ارون Longaron نامی آبادی کو سب سے زیادہ مالی و جانی نقصان پہنچا۔

اگلے دن اس آبادی کو دیکھنے کے آنے والوں نے اس کو 2 ہزار سال پرانے پومپیائی کے کھنڈرات جیسا پایا صرف فرق ان دونوں مقامات کی تباہی میں آتش فشانی اور سونامی کا تھا۔ اس وادی میں آباد لوگوں کا ریکارڈ تک نہیں بچا تھا کیونکہ تمام سرکاری عمارات بھی بہہ گئی تھیں۔ اسی وجہ سے جانی و مالی نقصانات کا تخمینہ لگانے میں بہت زیادہ وقت لگا۔ آہستہ آہستہ جب زندہ بچ جانے والے لوگ حکام سے ملے تو اموات کا صحیح تخمینہ لگایا گیا جو 2600 افراد تھے۔ 15 اکتوبر کو ایک اور تودہ جھیل میں آ گرا تاہم اس وقت ایسے حادثات سے نمٹنے کے لیے حکام مکمل طرح تیار تھے۔ اس علاقے میں موجود بقایا افراد کو فوراً محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا جس کی وجہ سے مزید اموات واقع نہ ہوئیں۔

بعد میں کیے جانے والے ایک ارضیاتی سروے نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ پہاڑوں میں گھرا ہوا یہ بلند ڈیم کی تعمیر کے لیے ہرگز مناسب نہیں تھا۔

1966ء..... ایبر فان، ساؤتھ ویلز کا سانحہ

انگلستان میں ساؤتھ ویلز Southwales کے ایک قصبے ایبرفان Aberfan میں کوئلے کی بہت سی کانیں واقع تھیں۔ ان کانوں کی باقیات یا بے کار فالتو کوئلے کے کچرے کو اس قصبے کے باہر واقع پہاڑیوں پر ڈھیر کر دیا جاتا تھا جو ایک انتہائی بے احتیاطی تھی جو روا رکھی گئی اور پہاڑیوں پر یہ کوئلے کا ڈھیر بڑھتا ہی گیا۔ عین اس کوئلے کے ڈھیر کے نیچے ایک قصبہ ایبرفان واقع تھا۔ 21 اکتوبر 1966 کو جب اس قصبے کے لوگ صبح نو بجے معمولات زندگی میں مصروف تھے اور قصبے میں واقع ایک اسکول بھی لگ چکا تھا۔ پہاڑی پر لگا وہ کوئلے کے کچرے کا ڈھیر جو خود بھی ایک پہاڑ بن چکا اچانک پھسلنا شروع ہوگیا۔ اور ایک ایوالانچ کی طرح صرف چند سیکنڈ میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اس اسکول اور قصبے کے کئی اور مکانات پر آ گرا۔ اس کوئلے کے تودہ نما ڈھیر کے قصبے پر گرنے سے اس قصبے میں قیامت صغریٰ بپا ہوگئی۔ کوئلے کے اس تودے کے گرنے سے اسکول اور مکانات کی عمارتیں فوراً زمین بوس ہوگئیں اور اس حادثے میں 116 بچے اور 28 بالغ افراد ہلاک ہوگئے۔ کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے افراد نے فوراً ملبے میں دبے افراد کو نکالنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ قریبی کوئلے کی کانیں اس واقعہ کی اطلاع ملتے ہی بند کر دیں گئیں اور امدادی کارکنان نے اگلی پوری رات ملبے میں دبے افراد کی لاشیں نکالنے کا کام کیا۔ اگلے دن اس حادثے میں ہلاک ہونے والے تمام افراد کی لاشوں کو ایک اجتماعی قبر میں دفن کر دیا گیا۔

کوئلے کی ہر کان کے ساتھ کوئلے کے کچرے کا ایک بڑا ڈھیر ضرور لگ جاتا ہے۔ ایبر فان میں کوئلے کی کانوں کی باقیات کا یہ ڈھیر 1900 کے اولین سالوں سے شروع تھا۔ ایبرفان کے قصبے میں کوئلے کے کچرے کے اس ڈھیر کو بڑھا کر پہاڑیوں کی شکل دینے کا منصوبہ تھا جس پر بعد ازاں گھاس اور درخت بھی لگائے جانے تھے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں ایبرفان میں کوئی ایسا ضابطہ متعارف نہیں کرایا گیا تھا جس کے تحت ان کوئلے کے کچرے کے ڈھیروں کا معائنہ بھی کیا جاتا۔ ایبرفان میں کوئلے کے کچرے کے ان ڈھیروں میں ایک 7 نمبر ڈھیر تھا جو اس قصبے پر آ گرا تھا۔ اس ڈھیر کے علاوہ اس مقام پر چھ ڈھیر اور تھے۔ ان تمام ڈھیروں کی اطراف میں پانی کے دھارے بہتے تھے۔ پانی کے ان دھاروں

سے کچھ پانی کوئلے کے کچرے کے ان ڈھیروں کو بھی پہنچتا تھا۔ اسی وجہ سے ماہرین ان ڈھیروں کو خطرناک قرار دے چکے تھے اور کہہ چکے تھے کہ اگر ساؤتھ ویلز کی کانوں کے حکام نے اس پانی کو ان ڈھیروں کے نیچے پہنچنے سے ہٹانے کے لیے خرچہ نہ کیا تو بالضرور وہ ایک دن اس کے نتیجے میں تودے گرنے سے ہونے والے نقصانات کی تلافی کا خرچہ برداشت کریں گے۔ پھر 1963ء میں ان ڈھیروں میں سے ایک چھوٹا سا تودہ گرنے کے بعد قصبے کے مکینوں نے آئندہ کوئی بڑا تودہ گرنے کا خوف ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ یہ تودہ نمبر 7 کے نیچے والے حصے سے گرا تھا جبکہ اس ڈھیر کی بلندی 80 فٹ تک جا پہنچی تھی۔

پھر نمبر 7 ڈھیر کے قصبے پر گرنے سے چند ماہ پہلے اس میں ضعف کے آثار دکھائی دینے لگے تھے اور یہ ڈھیر چھ ماہ میں 37 انچ نیچے سرک آیا تھا۔ ان تمام خطرات کی رپورٹیں حکام کو دی جاتی رہیں مگر ماضی کی طرح ہی ان کے کان پر جوں نہیں رینگی اور انہوں نے اس صورتحال سے بچاؤ کی کوئی کوشش نہیں کی پھر 21 اکتوبر 1966ء کو 1,40000 ٹن وزنی بھیگے ہوئے کوئلے کے کچرے کا تودہ اور کیچڑ چنگھاڑتا ہوا نیچے قصبے کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے میں پانی کی دو تین لائنیں اس بڑے تودے کے ٹکرانے سے ٹوٹ گئیں اور پانی کے پھیلنے کی وجہ سے اس بھاری تودے کے گرنے کی رفتار اور بڑھ گئی۔ یہ تودہ 9 بجے صبح کے بعد گرنا شروع ہوا تھا اور 11 بجے تک سکول اور کئی گھر اس کے نیچے دب چکے تھے۔ پھر جب لوگوں کو پتہ چلا کہ اس تودے کے شکار زیادہ تر بچے ہوئے ہیں تو وہ امدادی کاروائیاں کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔ ایک شخص جس کی ایک بچی اس تودے کے نیچے دب گئی تھی کہتے ہیں 3 میل سے دوڑتا ہوا موقع پر پہنچا اور پھر دم لیے بغیر شام تک کھدائی کرتا رہا اور کہیں جا کر اسے اندھیرا ہونے کے بعد روکا گیا۔ اس حادثے میں کل 144 لوگ جاں بحق ہوئے جن میں سے 116 اسکول کے بچے تھے۔

1970ء..... پیرو کا ہولناک زلزلہ

31 مئی 1970ء کے دن بعد از دوپہر ریکٹر اسکیل پر 7.9 درجہ کا زلزلہ مغربی وسطی پیرو کے 30 ہزار مربع میل کے علاقے میں آیا۔ یہ علاقہ پیرو کے ایک قصبے چمبوٹے Chimbote کے قریب تھا اور پیرو کے دارالحکومت لیما Lima کے 300 میل شمال میں واقع تھا۔ اس زلزلے کی شدت کی وجہ سے پیرو کے دو کوہستانی سلسلوں کے پہاڑوں کی ڈھلوانوں سے بڑے بڑے تودے اور پتھر نیچے آبادیوں پر آ گرے اور انہوں نے این کیش Ancash کے علاقے میں تمام سڑکیں بلاک کر دیں اور تمام نہروں اور دریاؤں کو بہنے سے روک دیا۔ اس زلزلے کی وجہ سے کوہسکران Hauscran کی چوٹی کے قریب سے ایک بڑا ایوا لانچ جو زیادہ کچرے اور پتھروں پر مشتمل تھا 18000 فٹ کی بلندی سے پیرو کے شہر یوان گے Yungay پر آ گرا اور پورا شہر اس بڑے ایوا لانچ کے نیچے دب گیا۔ اس حادثے میں 70000 افراد اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جبکہ 140000 افراد زخمی ہوئے اور 800000 لاکھ افراد بے گھر ہو گئے۔ کل 160000 عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ جائیدادوں کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ ہاف بلین ڈالر سے زیادہ تھا۔

جو بڑا ایوا لانچ یوں گے پر آ گرا تھا وہ ایک سو ملین کیوبک گز پتھروں کیچڑ برف اور مٹی پر مشتمل تھا۔ زلزلے کے جھٹکے اتنے شدید تھے کہ باوجود کہ یہ صرف ایک منٹ تک جاری رہے انہوں نے کوہ ہسکران کی شمالی ڈھلوان پر ایک میل طویل اور 3 ہزار فٹ کشادہ گلیشیائی برف اور پتھروں اور مٹی پر مشتمل ایک بڑا ایوا لانچ متحرک کر دیا۔ اس بڑے ایوا لانچ نے پہاڑ کی چوٹی سے یون گے شہر تک کا سفر دس میل کا سفر 200 میل فی گھنٹہ کی طوفانی رفتار سے کیا۔ چشم دید گواہوں کے بیان کے مطابق اس ایوا لانچ نے اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو چاہے وہ 500 فٹ بلند کوئی چٹان بھی تھی چشم زدن میں ہٹا دیا۔ اور کئی ٹن وزنی پتھروں کو 3000 فٹ دور لے جا پھینکا۔ اس ایوا لانچ کے گرنے سے دو پہاڑوں کے درمیان واقع وادی کو شدید نقصان پہنچا۔ چمبوٹے اور دیگر ساحلی قصبات میں تقریباً 90 فی صد عمارات منہدم ہو گئیں۔ پیرو کی پان امریکن ہائی وے کو شدید نقصان پہنچا جس کی وجہ سے ملک میں رسل و رسائل کے ذرائع محدود ہو کر رہ گئے زلزلے میں واقع ہونے والی اموات کی زیادہ تعداد عمارتوں کے گرنے کی وجہ سے ہوئی۔ یہ عمارتیں بدقسمتی سے سیلابی مٹی کی بھرت سے اور کچی اینٹوں سے تعمیر کی گئیں تھیں۔

علاوہ ازیں یہ زلزلہ بھی مغربی نصف کرے کی تاریخ میں آنے والی بدترین قدرتی آفت تھی۔ اس زلزلے کا مرکز پیرو کے ساحل سے 20 میل پرے سمندر میں سطح سمندر سے 25 میل نیچے واقع تھا۔ پیرو خود زلزلوں کے لیے کوئی اجنبی مقام کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہاں ماضی میں بھی بڑے بڑے زلزلے آتے رہے ہیں اور مستقبل میں بھی یہاں شدید زلزلوں کی آمد کے امکانات روشن ہیں۔ یہاں تک کہ کوہستان اینڈیز کی بلند و بالا چوٹیاں بھی انہیں شدید زلزلوں کی وجہ سے وجود میں آئی تھیں۔ ان شدید زلزلوں کی آمد کا سبب ماہرین کے نزدیک ناز کا Nazca ارضیاتی پرت کے جنوبی امریکہ کی ارضیاتی پرت کے نیچے مسلسل متحرک رہنے کی وجہ سے ان دونوں ارضیاتی پرتوں میں یہ تحریک مسلسل رہتی ہے اور اسی کی کم و بیش شدت کی وجہ سے ہی زلزلے پیدا ہوتے ہیں۔

پیرو کی حکومت نے قصبہ یون گے کے مقام پر کھدائی کرنا ممنوع قرار دیدیا تھا۔ اور اس شہر کے مدفن کو ایک فوجی قبرستان کا درجہ دیدیا تھا۔ دریا سانتا River santa کی وادی جہاں یہ زلزلہ آیا تھا اور یہ ایوالانچ گرا تھا اس وادی کے زندہ بچنے والے بچے کھچے لوگوں کو پیرو کی حکومت نے دوبارہ آباد کیا اور 31 مئی کے دن کو پیرو میں اس قدرتی آفت کا دن ہونے کی وجہ سے سرکاری تعطیل کا دن قرار دیدیا گیا۔

اس زلزلے سے پیرو کا ایک تفریحی مقام اور قصبہ ہوارس بھی صفحہ ہستی سے مٹ گیا تھا۔ جو لوگ اس تباہ ہو جانے والے قصبے میں زندہ بچے ان کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ عمارات کے انہدام سے پیدا ہونے والے گرد و غبار کے مرغولوں نے ان لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا۔ دو اور قصبات کساما اور ہوارمے میں بھی اس زلزلے نے بڑے پیمانے پر تباہی مچا دی اور راستے بلاک ہو جانے کی وجہ سے امدادی کاروائیاں بھی مشکل بنا دیں تھیں۔ یہاں تک کہ اس علاقے پر پرواز کرنے والے ہیلی کاپٹر پائلٹ بھی گرد و غبار کی وجہ سے نیچے سطح زمین پر دیکھنے سے قاصر تھے۔ اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی تباہی کے بعد جو سب سے بڑا مسئلہ کھڑا ہوا وہ بے شمار انسانی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ لوگ تعفن پھیلنے کے ڈر سے اپنے قریبی عزیزوں کی لاشوں کے قریب نہیں جاتے تھے۔ اس لیے بڑی بڑی اجتماعی قبریں کھود کر بغیر شناخت کیے سینکڑوں افراد کو ان اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا۔

1970ء..... مشرقی پاکستان میں ہولناک سمندری طوفان

13 نومبر کو مشرقی پاکستان کے آخری ایام میں ایک ہولناک سمندری طوفان یا ''سونامی'' نے خلیج بنگال سے اٹھ کر مشرقی پاکستان کے ساحلی علاقوں پر حملہ کر دیا۔ اس سمندری طوفان سے ایک اندازے کے مطابق 5 لاکھ افراد ہلاک ہوئے جبکہ بعض دیگر ذرائع نے دس لاکھ اموات کا تخمینہ لگایا تھا۔ اخبار نیویارک ٹائمز نے لکھا تھا کہ اگر زخموں اور فاقوں کی تاب نہ لاکر جاں بحق ہونے والے افراد اور طوفان کے بعد وبائی امراض کے پھیلنے سے ہونے والی ہلاکتوں کو بھی شمار کر لیا جائے تو اموات کی تعداد دس لاکھ بھی کم محسوس ہوتی ہے کیونکہ ان آفتوں سے ہونے والی ہلاکتیں اس سے بھی کہیں زیادہ تھیں۔ اس سمندری طوفان Bangladesh cyclone کا سراغ دریائے گنگا کے ڈیلٹا سے آٹھ سو میل جنوب میں خلیج بنگال میں لگالیا گیا تھا۔ پھر کاکس بازار کے ریڈیو اسٹیشن سے دریائے گنگا کے ڈیلٹا کے نزدیکی مقامات پر رہنے والوں کو متنبہ بھی کیا گیا تھا کہ یہ سمندری طوفان جزائر انڈمان کے قریب پہنچ چکا ہے اور تقریباً دس میل فی گھنٹہ سے ان علاقوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔

مگر طوفانوں سے اکثر نبرد آزما ہونے والے بنگالیوں نے اس انتباہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اکتوبر 1970ء میں بھی ایک سمندری طوفان کی آمد کی پیشین گوئی کی گئی تھی لیکن وہ طوفان انتہائی معمولی نوعیت کا نکلا تھا اور اس سے ہونے والا جانی و مالی نقصان بھی کم نوعیت کا تھا اس لیے بھی لوگوں نے اس طوفان کو بھی کم نوعیت کا جانا۔

دوسرے یہ کہ چونکہ دریائے گنگا کے ڈیلٹا میں واقع جزیروں میں لوگ چھوٹی چھوٹی بستیوں میں آباد تھے اور ان لوگوں کے پاس ٹرانزسٹر یا ریڈیو نہیں تھے اس لیے طوفان کی آمد کا انتباہ بھی کم ہی لوگوں نے سنا اور طوفان کے راستے میں آباد بے شمار لوگوں کو خبر ہی نہیں تھی کہ آفت ان کے سر پر پہنچ چکی ہے۔

سونامی کی پہلی لہر 12 نومبر 1970ء کو تقریباً آدھی رات کے بعد یہاں پہنچی جس کے بعد 150 میل فی گھنٹہ کی تیز رفتار ہوائیں چلنے لگیں یوں طوفانی لہروں اور تیز رفتار ہواؤں نے مل کر دریائے گنگا کے ڈیلٹا میں واقع جزیروں اور ساحلی آبادیوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ پانی کے چڑھ جانے کے بعد بہت سے لوگوں نے درختوں پر چڑھ کر اپنی جان بچائی۔ بہت سے لوگ پانی میں گھرے ہوئے گھروں کی چھتوں پر

پناہ گزیں ہوئے۔ ان لوگوں نے بعد ازاں بتایا کہ ہوا اتنی شدید تھی کہ ان کے بہت سے ہمسایوں کو تو ہوا اڑا کر لے گئی۔ طوفان تھمنے کے بعد زمین پر ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں اور انسانی لاشے اتنی بڑی تعداد میں بکھرے ہوئے تھے کہ زمین پر چلنا مشکل ہوگیا تھا۔ مزید لاشیں درختوں کی شاخوں میں اٹکی ہوئی تھیں۔ دریائے گنگا کے ڈیلٹا میں دس لاکھ سے زائد گائیں اور دیگر مویشی بہہ گئے تھے۔ لاتعداد مچھلیاں اور بحری جہاز طوفان میں پھنس کر خشکی پر چڑھ آئے تھے۔ سیلابی پانی کے اترنے کے بعد کئی دنوں تک بے گور و کفن پڑی لاشوں کو گدھ نوچتے رہے اور کوئی پرسان حال نہ ہوا۔ امدادی جماعتیں بھی بعد میں پہنچیں۔ 55 فٹ بلند سونامی کی لہروں نے خلیج بنگال میں واقع کئی جزیروں کو ڈبو دیا اور جب یہ دوبارہ پانی اترنے کے بعد سطح سمندر پر ابھرے تو کوئی ذی روح ان پر آباد نہیں رہا تھا۔

طوفان کے بعد جب نقصانات کا تخمینہ لگایا گیا تو یہ سمندری طوفان خلیج بنگال میں آنے والے سمندری طوفانوں میں سب سے زیادہ ہولناک ثابت ہوا۔ جب دنیا کو اس طوفان سے پہنچنے والے نقصانات کا علم ہوا تو دنیا کے گوشے گوشے سے امدادی سامان بھجوایا گیا۔ امریکہ برطانیہ نے دل کھول کر طوفان زدگان کی مدد کی۔ برطانیہ نے خصوصی طور پر غذائی امداد بھجوائی جبکہ امریکی نیوی کے ہیلی کاپٹروں نے پانی میں گھرے ہوئے طوفان زدگان کو قریے قریے میں یہ امدادی سامان پہنچایا۔ پوری دنیا سے طبی امداد اور ڈاکٹرز بھی بھیجے گئے تاکہ وبائی امراض پر قابو پایا جاسکے۔ انجینئرز کو مشرقی پاکستان میں پلوں اور سڑکوں کی تعمیر کے لیے بھیجا گیا۔ مگر افسوسناک پہلو یہ تھا کہ خود حکومت پاکستان بنگالیوں کی باغیانہ کاروائیوں سے پریشان ہونے کی وجہ سے بہت کم امدادی کاروائیاں انجام دے سکی۔

مشرقی بنگال، سابقہ مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش کی تاریخ میں 1970ء میں آنیوالے اس سمندری طوفان کو بیسویں صدی کا سب سے تباہ کن طوفان تسلیم کیا جاتا ہے۔

1971ء..... عراق میں پارے سے ہونے والی زہر خورانی

اگست 1971ء میں شمالی امریکہ سے بڑی مقدار میں اناج کے بیج عراق بھیجے گئے۔ ان دنوں عراق کے نائب صدر صدام حسین صاحب تھے وہ اس عہدے پر باتھ پارٹی کے 1968ء میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد فائز ہوئے تھے۔ اس کے دس سال بعد صدام حسین عراق کے صدر بن گئے اور 2003ء میں عراق پر کئے جانے والے امریکی حملے کے بعد جا کر اس عہدے سے معزول کئے گئے۔ نائب صدر کی حیثیت سے وہ 1971ء میں عراقی فوج اور حکومت کے تمام شعبوں کے انچارج تھے میکسیکو امریکہ سے بھیجے گئے اناج کے بیجوں کو حشرات الارض سے اور خراب ہونے سے بچانے کے لیے ان بیجوں پر کیمیائی پھپھوندی مار Mercury fungicide سے سپرے کیا گیا تھا۔ اس حالت میں اگر اناج کو بطور بیج فصل اگانے کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ بے ضرر ہوتا ہے تاہم اگر اسے اس سپرے کے بعد اگر کھانے کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ زہر خورانی کا باعث بن جاتا ہے۔ پارے کی آمیزش سے تیار کئے گئے زہریلے پھپھوندی مار سے سپرے کرنے کے بعد اسے گلابی رنگ بھی دیا جاتا ہے تاکہ اس کے زہریلے ہونے کا پتہ چل سکے اور غلطی سے اسے کھانے کے لیے استعمال نہ کرلیا جائے۔ عراقی حکومت کو بھی امریکی حکومت نے متنبہ کیا تھا کہ اس اناج کو عراق میں کھانے کے لیے استعمال سے منع کیا جائے۔ بہت سی وجوہات کی بنا پر عراقی حکومت اور حکام نے اس امریکی انتباہ کو بھلا دیا اور اس زہریلے اناج کو عراق میں کھانے کے لیے استعمال کرنے دیا گیا نتیجتاً سینکڑوں عراقی اس زہریلے اناج کے کھانے سے جاں بحق ہوگئے جبکہ ہزاروں مزید صاحب فراش ہوگئے۔

باتھ پارٹی کے رکن کی حیثیت سے صدام حسین 1971ء میں عراق کے نائب صدر تھے۔ 1971ء تک عراق ایک زرعی ملک تھا اور ابھی تیل کی پیداوار اس معیار پر نہیں پہنچی تھی کہ معیشت تیل کی برآمد پر انحصار کرسکے۔ باتھ پارٹی کے اقتدار میں آنے سے پہلے سے عراق میں گندم کاشت کی جاتی تھی۔ مگر بارشوں کی کمی سے فصل اکثر خراب ہو جاتی تھی۔ 1971ء کا سال عراق میں بارشوں کی کمی کا سال تھا جس کی وجہ سے حکام نے گندم کا ایک نیا بیج ملک میں متعارف کرانے کا فیصلہ کیا تاکہ بدلتے ہوئے موسمی حالات سے نمٹا جاسکے۔ شمالی امریکہ کا ملک میکسیکو بھی ایک ایسا ملک ہے جہاں بارشوں کی سالانہ اوسط

بڑی کم ہے اور موسم اکثر خشک رہتا ہے وہاں گندم کی ایک خصوصی قسم کاشت کی جاتی ہے اسی قسم کا بیج عراق نے بڑی مقدار میں 1971ء میں درآمد کیا تھا۔ تقریباً 700000 ٹن یہ بیج جنوبی عراق کی بندرگاہ البصرہ میں موصول کرلیا گیا اور پھر اسے ملک کے باقی حصوں میں ترسیل کر دیا گیا۔

گندم کا یہ بیج خصوصی طور پر سیمابی کیمیائی محلول سے سپرے کیا گیا تھا تاکہ خراب ہونے سے اور کیڑوں مکوڑوں کے حملے سے محفوظ رہ سکے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا کہ یہ زہریلا کرم کش اسپرے ان حالات میں تو بے ضرر ہوتا ہے کہ اگر اس بیج کو اگایا جائے مگر اگر اسے کھانے کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ زہر خورانی کا باعث بن جاتا ہے۔ اس بیج کی بوریوں پر یہ بات واضح طور پر تحریر کر دی گئی تھی مگر بدقسمتی میکسیکو کی زبان ہسپانوی ہونے کی وجہ سے یہ تحریر بھی ہسپانوی زبان میں تھی جو عراقیوں کے لیے ایک اجنبی زبان تھی۔ اس کے علاوہ اسی بیج پر گلابی رنگ کر دیا گیا تھا جو اس کے زہریلے پن کو ظاہر کرتا تھا۔ مگر ہسپانوی رسم الخط یا تحریر کی طرح یہ علامت بھی عراقی ورکروں کے لیے غیر موثر ثابت ہوئی۔ جو لوگ اس بیج کو بندرگاہ سے باہر لے جانے والے تھے اس کو بھی متنبہ کر دیا گیا تھا اور جن علاقوں میں یہ بیج بھیجا جارہا تھا وہاں بھی خصوصی ہدایات بھجوا دیں گئیں تھیں۔ جن علاقوں میں جتنی مقدار میں یہ بیج ضرورت تھا وہاں اس سے زیادہ بھیج دیا گیا۔ مگر تمام انتباہوں کے باوجود جلد ہی یہ گندم کا بیج لوگوں کے گھروں میں کھانے کے طور پر اور مویشیوں کے چارے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔

چند ہفتوں تک تو اس بیج پر لگے ہوئے زہریلے کیمیکل کے اثرات کا پتہ نہ چل سکا مگر جلد ہی جب نامعلوم وجوہات سے مرنے والوں اور شدید بیمار پڑنے والوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا تو حکومت عراق چونکی اور اس نے یورپی ممالک سے طبی امداد بھیجنے کی درخواست کی۔ جب یہ غیر ملکی میڈیکل ٹیمیں عراق پہنچیں تو انہوں نے جلد ہی اس وبائی مرض کی تشخیص کرلی اور پتہ چلا لیا کہ یہ زہریلا اناج کھانے کی وجہ سے پھیلا ہے۔ مگر صورتحال پر قابو پانا مشکل تھا کیونکہ اس زہریلے اناج کی ملک کے مختلف حصوں میں ترسیل جاری تھی اور عراق عوام کو اس کے متعلق صحیح معلومات نہیں تھی۔ اسی وجہ سے عراقی ریڈیو پر اعلان کر دیا گیا اور لوگوں کو میکسیکی بیج پر زہریلے سپرے کئے جانے کے بارے میں بار بار وضاحت کی گئی تاکہ عراقی حکومت اسی معاملہ پر کنٹرول کر سکے مگر اس وقت تک سرکاری طور پر 6500 اموات واقع ہو چکی تھیں۔ مرکری یا پارے سے ہونے والی زہر خورانی دنیا میں کوئی نئی شے نہیں تھی۔ انیسویں صدی میں یہ انگلستان میں ہیٹ HAT بنانے والے لوگوں کے گروہ میں پھیل گئی تھی۔ یہ کسی خاص قسم کے ہیٹ کے کنارے موڑنے کے لیے استعمال کیے جانے والے کیمیکل میں مرکری کی موجودگی کی وجہ سے پھیلی تھی۔ یہ زہر اسی زمانے میں تحریر کئے جانے والے ایک انگریزی ناول Alice in wondeland میں اس

ناول کے مصنف لیوس کیرول نے اپنے اس ناول میں Madhatter کے نام سے ایک کردار متعارف کرایا تھا۔ جو شاید مرکری کے اثرات سے دماغی امراض میں مبتلا ہو جانے والے ہیٹ بنانے والوں کی وجہ سے ہی متعارف کرایا گیا تھا۔

اسی طرح 1962ء اور 1970ء کے درمیان کینیڈا کے صوبے اونٹاریو میں ایک کیمیکل کمپنی نے ٹنوں کے حساب سے مرکری یا پارہ ایک دریا میں کیمیائی تلچھٹ کے طور پر بہا دیا تھا۔ اس دریا سے مقامی ریڈ انڈین قبائل دریائی جانداروں کی شکل میں خوراک حاصل کرتے تھے۔ مرکری سے آلودہ ہونے والے اس دریا میں پلنے والی مچھلیاں بھی مرکری سے آلودہ ہوگئیں اور ان آلودہ مچھلیوں کو کھانے سے جلد ہی یہ ریڈ انڈین مرکری کی زہر خورانی کا شکار ہوگئے تھے۔ اگرچہ کینیڈا کی حکومت نے فوراً مداخلت کر کے دریا میں مرکری کے بہائے جانے کا سلسلہ منسوخ کرایا اور ریڈ انڈینوں کو طبی امداد بھی بھجوائی مگر اس وقت ریڈ انڈین بہت سے جانی نقصان میں مبتلا ہو چکے تھے۔

اسی طرح جاپان کی ایک پیٹرو کیمیکل کمپنی نے ٹنوں کی مقدار میں مرکری کی آمیزش رکھنے والا کیمیائی فضلہ مناٹاما Minatama نامی دریا میں بہا دیا۔ 20 سال تک اس کیمیائی فضلے کے بہائے جانے کے اثرات سامنے نہیں آئے۔ یہ کیمیائی فضلہ 1930ء کی دہائی میں بہایا گیا تھا۔ پھر ایک جاپانی قصبے کے لوگ جو اس دریا سے حاصل کردہ مچھلیاں بہ طور خوراک استعمال کرتے تھے۔ مرکری کی زہر خورانی کا شکار ہوگئے۔ اس قصبے میں پیدا ہونے والے نومولود بچے پیدائشی طور پر مفلوج پیدا ہونے لگے تو اس کی تشخیص کی گئی اور اس بیماری کو مناٹاما بیماری کا نام دیا گیا۔

1972ء ۔ میونخ اولمپک ولیج میں ہونے والی دہشت گردی

جدید زمانے میں ہونے والی دہشت گردی کے واقعات کا ابتدائی دھماکہ 5 ستمبر 1972ء کی صبح کو جرمنی کے شہر میونخ میں اولمپک ولیج Olympic village میں صبح سویرے ہوا تھا۔ میونخ میں 1972 میں ہونے والے گرمائی اولمپک کھیل منعقد ہو رہے تھے اور ابھی چھ دن کے کھیل باقی تھے۔ 8 فلسطینی گوریلے اسرائیلی کھلاڑیوں کی رہائش گاہ میں گھس آئے یہ گوریلے کھلاڑیوں کے لباس میں ملبوس تھے اور انہوں نے اپنی گنیں بھی کھلاڑیوں کے بیگوں میں چھپائی ہوئی تھیں تاکہ انہیں پہچانا نہ جا سکے۔ پھر اس دن، دن ڈھلنے سے پہلے گیارہ اسرائیلی کھلاڑی، ایک جرمنی کا پولیس افسر اور 5 فلسطینی گوریلے ہلاک ہو گئے۔

عالمی دہشت گردی آج دنیا کے لیے سوہان روح بن چکی ہے اور دنیا کے بڑے خوفوں میں سے ایک بڑا خوف یہ ہے۔ یہاں تک کہ دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے ہمیں اپنی آزادی اور حقوق برائے انسانیت کے خلاف بھی کئی پابندیاں قبول کرنا پڑی ہیں۔ جیسے کہ مقدمہ چلائے بغیر لمبی مدت کے لیے کسی انسان کو قید کیا جانا جو کہ ماضی میں ایک غیر انسانی فعل سمجھا جاتا تھا مگر آج دہشت گردی کے خلاف ایک موثر ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ دہشت گرد سینکڑوں بے گناہ لوگوں کو اور بعض مواقع پر ہزاروں انسانوں کو قتل کر دیتے ہیں مگر اس کا کیا کیا جائے کہ یہ ظلم بھی ریاستی مظالم اور آمروں کی طرف سے کیے جانے والے مظالم سے کم ہے۔ کہ یہ ظالم تو لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق بیسویں صدی میں تقریباً 2 کروڑ افراد ریاستی مظالم کا نشانہ بنائے گئے تھے جبکہ دہشت گرد اس تعداد تک کبھی نہیں پہنچ سکے تھے۔

دہشت گردی کیا ہے، ذرا سوچیے! جیسا کہ انگریزی زبان کی ایک کہاوت ہے کہ ایک قوم کا دہشت گرد دوسری قوم کا آزادی کے لیے لڑنے والا مجاہد ہے۔ سابقہ SAS کا رکن میری ڈیوس نے جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دہشت گردی کے خلاف لڑتے ہوئے گذار دیا تھا، لکھا تھا کہ کسی قوم کے لیے لڑی جانے والی آزادی کی جنگ جس سے یہ جنگ لڑی جائے اس کے نزدیک دہشت گردی ہے۔ یاد رہے لفظ دہشت گردی یا اس کا انگریزی مترادف Terrorism سب سے پہلے انقلاب فرانس کے بعد انقلابی حکومت کی طرف سے کیے جانے والے ریاستی مظالم کے لیے ہی استعمال ہوا تھا۔ جب اٹھارہویں صدی

میں جب فرانسیسی انقلابی حکومت نے ہزاروں لوگوں کی گردنیں گلوٹین کے ذریعے اڑا دیں تھیں۔ انیسویں صدی میں اس لفظ کو مزاحمتی گروہوں کے لئے استعمال کیا گیا۔ یاد رہے یہ مزاحمتی گروہ الیگزینڈر دوم، روس اور شاہ امبرٹو آف اٹلی کے خلاف مزاحمت برائے حصول آزادی کر رہے تھے۔ ہسپانوی وزیراعظم بھی اسی زمانے میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ ایک اپنے ہوٹل کے کمرے میں قتل کیا گیا جبکہ دوسرا کتابوں کی دوکان پر۔ ایک تجزیہ نگار نے دہشت گردوں کی حکمت عملی کا تجزیہ بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ اگر بہت سی بھیڑیں موجود ہوں تو پھر شیر پر حملہ بھلا کیوں کیا جائے۔ یہی اصول دہشت گردوں کی حکمت عملی میں کارفرما ہوتا ہے اسی لیے وہ حکمران طبقے پر حملہ کرنے کی بجائے اکثر بے چارے عوام کو نشانہ بناتے ہیں۔ 1936ء میں اولمپک گیمز جرمنی میں منعقد کئے گئے تھے۔ اگلے 36 سال تک جرمنی میں یہ کھیل منعقد نہیں ہوئے پھر اگست 1972ء میں دوسری بار جرمنی کو ان کھیلوں کا میزبان ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ جرمنی چاہتا تھا کہ ان کھیلوں کی میزبانی کرکے وہ ماضی کی تلخ یادیں اقوام عالم کے حافظوں سے کھرچ دے۔ تاہم ایسا نہ ہوسکا اور کھیلوں کے اختتام سے چھ دن پہلے فلسطینی گوریلوں نے جرمنی کی سرزمین پر گیارہ اسرائیلی کھلاڑیوں کا خون بہا کر جرمنی کو مبتلائے اذیت کر دیا۔ فلسطینیوں نے یہ حملہ صبح 4 بجے کے قریب کیا اور دو اسرائیلی کھلاڑی ابتدائی کاروائی کے دوران ہلاک ہوگئے جبکہ باقی 9 کھلاڑی یرغمال بنا لیے گئے۔ پھر پورے دن جرمنی کی حکومت اور فلسطینیوں میں بات چیت ہوتی رہی۔ فلسطینی چاہتے تھے کہ وہ اس کاروائی سے [illegible] بار بار یرغمالیوں کو قتل کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ان کے مطالبات تھے کہ 200 فلسطینیوں کو اسرائیل کی قید سے آزاد کیا جائے۔ مگر یہ مطالبہ پورا نہیں کیا گیا۔ جرمن پولیس جان بوجھ کر تاخیر کر رہی تھی اور اس نے فلسطینیوں کی طرف سے دی گئی تین مرتبہ کی ڈیڈ لائن کو اسرائیلی کھلاڑیوں کے لیے جان کا خطرہ بنے بغیر گذار دیا تھا۔ اسرائیلی حکومت فلسطینیوں سے روائتی طور پر کسی قسم کے مذاکرات میں حصہ لینے سے انکار کر رہی تھی۔ جرمن حکام پورے دن سے اسرائیلی حکومت سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے اور جانتے تھے کہ کھلاڑیوں کی جان بچانے کے لیے اسرائیلی حکومت کسی قسم کی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کی بجائے اسرائیلی حکومت نے پیش کش کی کہ وہ اپنی دہشت گردی کے خلاف کام کرنے والی فوج کے دستے جرمنی بھجوانے کے لیے تیار ہے۔ اس پر جرمن حکام رضامند نہیں تھے۔ اس پر ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ اولمپک کھیلوں کے مقام پر متعین جرمن پولیس بھی دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے پوری طرح ہتھیار بند نہیں تھی۔

دن کے آخری حصے میں جرمن حکام نے فلسطینی گوریلوں کو ان کے یرغمالی اسرائیلی کھلاڑیوں سمیت

مصر جانے کی اجازت دے دینے کا فیصلہ کیا مگر دوسری طرف انہیں ایئر پورٹ لے جاتے ہوئے یرغمالی اسرائیلی کھلاڑیوں کو ان سے رہا کرانے کا منصوبہ بھی بنایا گیا اور پولیس نے بذریعہ طاقت یرغمالیوں کو چھڑوانے کی تیاریاں بھی مکمل کرلیں۔ پولیس کے گن مین ایرپورٹ کی چھت پر متعین کر دیئے گئے اور انہیں ہدایات دیں گئیں کہ جیسے ہی وہ یرغمالیوں اور یرغمال بنانے والے فلسطینیوں میں کوئی فاصلہ دیکھیں بلا دریغ فائرنگ کر دیں۔ مگر یہ منصوبہ بندی ناکام رہی کیونکہ جو گن مین متعین کئے گئے تھے ان کے پاس رات کے اندھیرے میں کام کرنے والے ہتھیار نہیں تھے دوسرے فلسطینیوں نے خود حفاظتی اقدام کے طور پر پورے علاقے کی روشنیوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا جس کی وجہ سے حالات مزید خراب ہوگئے۔ پولیس کی سوچ کے مطابق صرف پانچ دہشت گرد تھے جبکہ وہ حقیقتاً آٹھ تھے۔

ایئر پورٹ پر ان حالات میں ایک گھنٹے تک گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا اسی لڑائی کے دوران ایک فلسطینی گوریلے نے یہ جانتے ہوئے کہ جرمن حکام نے انہیں دھوکہ دیا ہے۔ ایک گرنیڈ اس ہیلی کاپٹر میں دے مارا جس میں 5 اسرائیلی یرغمالی کھلاڑی ایرپورٹ پر لائے جارہے تھے جس سے یہ پانچوں ہلاک ہوگئے۔ پھر ایک اور فلسطینی نے ایک دو [illegible] ہیلی کوپٹر کو بھی اڑا دیا جس میں 4 اسرائیلی یرغمال سوار تھے اس طرح اسرائیل کے تمام کھلاڑی مارے گئے اس لڑائی میں ایک جرمن پولیس والا اور 5 فلسطینی گوریلے بھی مارے گئے۔ باقی تین فلسطینیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ اولمپک گیمز کو ایک دن کے لئے معطل کر دیا گیا پھر بین الاقوامی اولمپک کمیٹی کے صدر کے فیصلے پر انہیں دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ اولمپک کمیٹی کے اس فیصلے پر پوری دنیا میں ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔

تقریباً ایک سال بعد ان تین فلسطینیوں کو رہا کرانے کے لیے ان کے ساتھیوں نے ایک جرمن ہوائی جہاز کو اغوا کرلیا اور ان تینوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ جرمن حکام کو جہاز کے مسافروں کی زندگیاں بچانے کے لیے فلسطینیوں کا مطالبہ ماننا پڑا اور انہوں نے تینوں فلسطینی گوریلوں کو رہا کر دیا مگر اسرائیلیوں نے اس کا نوٹس لیا اور کچھ عرصے بعد ان تینوں فلسطینی گوریلوں کو انتقامی کاروائی کرتے ہوئے قتل کر دیا۔ دوسری طرف 1976ء میں منعقد ہونے والی اولمپک گیمز کے حفاظتی انتظامات سخت تر کر دیئے گئے او تمام کھلاڑیوں کو خصوصی سکیورٹی فراہم کی۔

1973ء..... آئس لینڈ میں آتش فشانی

آئس لینڈ کی تاریخ کی سب سے تباہ کن آتش فشانی 23 جنوری 1973ء کی صبح سویرے شروع ہوئی تھی۔ یہ آتش فشانی آئس لینڈ کی ماہی گیری کی اہم بندرگاہ Vastmannaeyiar کے قریب جزیرہ Heimaex پر رونما ہوئی تھی۔ آئس لینڈ کے جنوبی ساحل کے قریب واقع یہ واحد آباد جزیرہ ہے VEI اسکیل پر یہ آتش فشانی 3 درجہ کی تھی جو 1902ء میں رونما ہونے والی ماؤنٹ پیلے کی آتش فشانی کے دسویں حصے کے برابر تھی مگر اس کی تباہی پھیلانے کی طاقت اس سے بھی زیادہ تھی جس نے ویسٹ مانیز کے قصبے کے تین چوتھائی حصے کو تباہ کر دیا۔ اگر کہیں اس قصبے کے مکین احتیاطی تدابیر اختیار نہ کرتے تو یہ مزید تباہی پھیلاتی۔ بہتے ہوئے گرم لاوے کے سیلاب کو انہوں نے سمندری پانی کا چھڑکاؤ کر کے مزید آگے بڑھنے سے روک دیا قصبے کا ایک حصہ اس گرم لاوے کے سیلاب سے بچ گیا۔

آئس لینڈ دنیا کے ان خطوں میں سے ایک جہاں بہت زیادہ آتش فشاں پہاڑ واقع ہیں اور یہاں پر پانچ سال کے بعد اوسطاً ایک آتش فشانی بالضرور ہوتی ہے۔ 1973ء میں ہونے والی یہ آتش فشانی اس دہائی میں ہونے والی پانچویں آتش فشانی تھی۔ یہ بات بھی محققین نے لکھی ہے کہ پوری دنیا کی تاریخ میں بہنے والے لاوے کا کم از کم تیسرا حصہ آئس لینڈ کے آتش فشاں پہاڑوں سے بہا ہے۔ آئس لینڈ بحر اوقیانوس میں اس مقام پر واقع ہے جہاں شمالی امریکہ کی ارضیاتی پرت یورایشیائی ارضیاتی پرتوں سے علیحدہ ہوتی ہے۔ جزوی طور پر ان ارضیاتی پرتوں کا متحرک رہنا اس آتش فشانی کا سبب ہے۔ البتہ آئس لینڈ پر اتنی بہت سی آتش فشانیوں کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ آئس لینڈ جزائر ہوائی اور یلو اسٹون نیشنل پارک کی طرح ایک ارضیاتی طور پر ایک گرم مقام پر واقع ہے۔ آئس لینڈ کے قریب ایک زیر آب آتش فشاں پہاڑوں کا ایک کوہستانی سلسلہ سمندر کے اندر بھی موجود ہے جو زیر آب 82000 میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے آئس لینڈ ایک آتش فشانی جزیرہ ہے جو مکمل طور پر آتش فشاں لاوا بہنے کی وجہ سے وجود میں آیا تھا۔ اور اس جزیرے کے عین وسطی حصے کے نیچے زیر آب آتش فشاں پہاڑوں کا سلسلہ بھی موجود ہے۔

1973ء میں ہونے والی آتش فشانی جزیرہ ہیمے Heimaey کے مشرق میں واقع آتش فشاں کوہ

ایلڈ فیل Eldfell کے پھٹنے سے ہوئی تھی۔ یہ آتش فشاں ویسٹ مان ایئر کے قصبے کے وسطی حصے سے صرف ایک ہزار گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس آتش فشانی سے ایک میل طویل ایک تنگ دراڑ نمودار ہوگئی۔ آتش فشانی شروع ہونے کے صرف تین دن کے اندر اندر لاوا اور دیگر آتش فشانی مادہ Tephra 3(۱/۲) فٹ طویل ہو چکا تھا۔ آتش فشاں کے دہانے سے آتش فشاں راکھ 130 کیوبک گز فی سیکنڈ کے حساب سے خارج ہو رہی تھی۔ لاوا کے بہنے کی وجہ سے خود اس پہاڑی کی بلندی صرف چند ہفتوں میں دو گنا ہوگئی۔ آئس لینڈ کے باشندے اپنے قصبے کو اس آتش فشانی کی وجہ سے مسلسل تباہ ہوتے دیکھتے رہے جس سے ان کی معیشت کو سخت دھچکا پہنچا۔ آئس لینڈ کے 5300 باشندوں کو اس علاقے سے نکال کر محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا گیا۔ لاوے کے ابلتے ہوئے سیلاب نے قصبے کے مشرقی حصے میں واقع مچھلیوں کو محفوظ کرنے والا ایک پلانٹ تباہ کر دیا اور دو مزید پلانٹوں کو شدید نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ مقامی بجلی گھر بھی تباہ ہوگیا۔ صرف دو مہینے کے اندر اندر نقصانات 2 کروڑ ڈالر سے بڑھ گئے یاد رہے کہ آئس لینڈ کا GNP سالانہ صرف ہاف بلین ڈالر رہے۔

آئس لینڈ کے سائنسدانوں کے سمندری پانی کے چھڑکاؤ سے ابلتے ہوئے گرم لاوے کے سیلاب کو ٹھنڈا کر کے روکنے یا کم از کم آہستہ رو کرنے کی کوششوں کی وجہ سے قصبے ویسٹ مانیئر کے کچھ حصے تباہ ہونے سے بچ گئے، آئس لینڈ کے سائنسدانوں کے لاوے کو روکنے کے اس طریقے کو آتش فشاں پہاڑی علاقے رکھنے والے دیگر ممالک نے اپنانے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ ان کے علاقوں میں آتش فشاں سرگرمیوں کو کنٹرول کیا جاسکے۔

آتش فشانی سے پہنچنے والے نقصانات سے قطع نظر آئس لینڈ میں اس سے فائدہ بھی پہنچا۔ لاوا اور ٹیفرا کے بہنے سے اس جزیرے کے رقبے میں ایک میل کا اضافہ ہوگیا یہ علاقہ بعد ازاں اس جزیرے کے واحد ہوائی اڈے کو وسیع کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس کے علاوہ آتش فشاں پہاڑ ایلڈ فیل دنیا کا سب سے زیادہ تصویریں اتارے جانے والا مقام بھی بن گیا تھا جس سے جزیرے کو مالیاتی طور پر بھی فائدہ پہنچا۔

1974ء..... برسبین، آسٹریلیا میں آنیوالا سیلاب

براعظم آسٹریلیا اپنی آب و ہوا کے شدائد سے بخوبی جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس براعظم کا ایک بڑا حصہ صحرا پر مشتمل ہے اور اس کے منطقہ حارہ میں واقع ہونے کی وجہ سے اس براعظم میں موسم گرما میں درجہ حرارت کافی بڑھ جاتا ہے اور بارشوں کی اوسط بھی کافی زیادہ رہتی ہے۔ 1974ء کا موسم گرما آسٹریلیا کے لیے مرطوب ترین موسم تھا۔ یاد رہے کہ جنوبی نصف کرے میں دسمبر اور جنوری موسم گرما کے مہینے ہیں۔ اس سال ان مہینوں میں آسٹریلیا کے اندرونی حصوں، نیو ساؤتھ ویلیز کوئنز لینڈ وغیرہ میں سمندری طوفان وینڈا wanda بھی چڑھ آیا۔ 24 گھنٹے میں ان علاقوں میں 12 انچ سے زائد بارش مسلسل ہوتی رہی صحرائی علاقے ہونے کی وجہ سے سبزہ اور روئیدگی نہ ہونے کی وجہ سے ان بارشوں سے آسٹریلیا کے ان خطوں میں واقع دریاؤں میں شدید سیلاب آ گیا۔

آسٹریلوی شہر برسبین اس سیلاب سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اس شہر کی گذشتہ ستر سال تاریخ میں یہ سب سے بڑا سیلاب تھا بلکہ بعض مورخین کے نزدیک تو یہ اس شہر کی تاریخ کا سب سے بڑا سیلاب تھا۔ 1893ء میں آنے والے ایک بڑے سیلاب کے بعد سے اس شہر میں عمارتوں کی تعمیر کے لیے کچھ ضابطے اور قوانین نافذ کر دیئے گئے تھے۔ ان ضابطوں اور قوانین کو اس شہر کے بڑے حصے کو بڑے سیلابوں سے بچانے کے لیے نافذ کیا گیا تھا۔ تاہم ان ضابطوں پر کسی نہ کسی وجہ سے عملدرآمد نہ ہوسکا اور بے ضابطگی ہوتی رہی۔ جیسے 1906ء کے زلزلے کے بعد سان فرانسسکو میں ہوتی رہی تھی۔ اسی وجہ سے 25 جنوری 1974ء کو آنے والے سیلاب سے برسبین میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلی اگرچہ سیلاب کی آمد سے خبردار کرنے کے لیے بہت سے انتباہ بھی جاری کیے گئے تھے۔ تاہم شہر میں سیلاب کی مقدار کی تفصیلات اس کے مختلف ذرائع کے مطابق درج کرنے کے لیے کوئی مرکزی اتھارٹی بھی موجود نہیں تھی۔ اس شہر کے 70 فی صد لوگوں نے بعد ازاں بتایا کہ سرکاری طور پر انہیں سیلاب کی آمد سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔

آسٹریلیا کی شہری تاریخ میں 25 جنوری کو اس براعظم میں سب بڑے سیلاب کی آمد کا دن تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ سیلاب اس براعظم کے خشک علاقوں سے بحرالکاہل کے ساحل تک وسیع علاقے میں آ گیا تھا۔ ادھر آسٹریلیا کے انتہائی شمال سے یہ سڈنی تک جا پہنچا تھا۔ اس سیلاب میں گھر کر باقی علاقوں سے کٹ

جانے والے قصبوں کو جن تک خشکی کے راستے رسائی ممکن نہ رہی تھی ان کو فوج نے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے کھانے پینے کا سامان پہنچایا گیا۔ برسبین شہر کے نزدیک واقع دریائے برسبین کے تمام پل گر جانے سے 35 افراد ڈوب گئے اور سیلابی پانی دریا کے کناروں سے باہر آجانے سے پانی شہر کے تجارتی علاقے میں داخل ہوگیا۔ شہر کے ایک دوسرے علاقے میں سیلابی پانی نے 1200 گھروں کو زمین بوس کر دیا جس سے تقریباً 20 ہزار افراد بے گھر ہوگئے۔ ایسی کوئی تنظیم موجود نہ ہونیکی وجہ سے جو ان سیلاب زدگان کی مدد کرتی ان سیلاب زدگان کو مختلف گرجاؤں میں پناہ لینی پڑی اور ان کی مدد کے لیے کچھ رضا کار نکلے۔ جنوری کے آخر تک عام طور خشک رہنے والے براعظم آسٹریلیا کے بہت سے علاقے سیلاب کے پانی میں ڈوب گئے۔ ڈوبنے والوں کی لاشیں گلنے وسڑنے کی وجہ سے یہاں وبائی امراض بھی پھیل گئے۔

چونکہ آسٹریلیا میں اکثر بڑے سیلاب نہیں آتے اس لیے جنوری 1974ء کا سیلاب آسٹریلیا کی جدید تاریخ کا نمایاں ترین سیلاب تھا۔

دنیا کے جن علاقوں میں سیلاب آتے ہیں ان میں جمہوریہ امریکہ کے دریائے مسسپی کے علاقے اسی طرح چین میں دریائے ہوانگ ہو Hwangho کے علاقوں میں سیلابوں کی آمد کی تاریخ بڑی الم ناک ہے۔ اگرچہ سرکاری طور پر اس دریا کا نام ہوانگ ہو ہے مگر عام طور پر چین کے اس دریا کو ''غموں کا دریا River of sorrow بھی کہا جاتا ہے اور اس دریا کی تاریخ بھی بڑی الم ناک ہے۔ اسی دریا کا ایک اور نام دریائے زرد بھی ہے۔ یہ نام اس دریا میں آنے والے اکثر سیلابوں کی وضاحت کرتا ہے۔ دریا اکثر بارشوں کی بہتات کے بعد اپنے کناروں سے باہر آجاتا ہے۔

1976ء..... پول پاٹ حکومت کے مظالم

چینی راہنما ماوزے تنگ نے اپنے جیسے ایک اور نظریہ پرست کمیونسٹ راہنما کی حکومت کی دوسرا افزائی کی تھی۔ یہ تھا کمبوڈیا کا راہنما پول پاٹ Pol pot جس نے کمبوڈیا کے چار سالہ دور دہشت میں لاکھوں افراد کو قتل کر دیا تھا۔ پول پاٹ ایک زمیندار کا بیٹا تھا اور 1925ء میں سیلاتھ سار Saloth sar میں پیدا ہوا تھا۔ پیرس میں تعلیم کے بعد وہ کمبوڈیا میں بائیں بازو کا راہنما بن گیا 1969ء میں جب پرنس سہانوک کی حکومت کا تختہ ایک فوجی جنرل لون نول Lon Nol نے الٹ دیا لون نول امریکہ نواز تھا اس لیے پرنس سہانوک نے پول پاٹ کے ساتھ مل کر اس کی حکومت کے خلاف کاروائی کرنے کا فیصلہ کیا مگر خود پرنس سہانوک چین کی طرف بھاگ گیا۔ 6 اپریل 1975ء کو کمیونسٹ فوجوں نے نوم پن شہر پر قبضہ کرلیا اور 1976ء میں پول پاٹ ملک کا وزیر اعظم بنا۔ اس نئی کمیونسٹ حکومت نے ملک کا نام بدل کر کمپوچیا رکھ دیا۔ تاہم پول پاٹ حکومت نے ماوزے تنگ کے خطوط پر چلتے ہوئے ملک میں آمریت تشکیل دی اور ملک میں آمرانہ کمیونسٹ نظام رائج کر دیا اس حکومت نے جہاں لوگوں کو بیگار کیمپوں میں بھیج دیا وہیں ڈاکٹرز، اساتذہ، سائنسدان اور قلمکاروں کو غلاموں کی طرح کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں 12 سے 14 گھنٹے کام کرنے کی تلقین کی گئی اور سرکاری راشن کے طور پر صرف چاول اور کیلے کا سوپ کھانے کو دیا جاتا۔ ان میں سے بہت سے فاقہ کشی اور زائد محنت کرنے کی وجہ سے مر گئے کچھ کو حکومت نے کام نہ کرنے کی پاداش میں قتل کروا دیا۔ ملک میں اقلیتوں، چینی ویت نامی، مسلم، عیسائی اور تھائی لوگوں سے انتہائی برا سلوک روا رکھا گیا۔ پول پاٹ کمبوڈیا کا سٹالن بن گیا اور اس نے ملک میں وقوع پذیر ہونے والی ہر خرابی کو ''غداروں کی کارروائی قرار دیا جو خود کمیونسٹ پارٹی میں موجود تھے۔ ایسے ارکان کے لیے ٹوسلینگ پوچھ گچھ سنٹر تشکیل دیا گیا جہاں پوچھ گچھ کے نام پر 20 ہزار افراد پر تشدد کیا گیا اور انہیں سزائے موت دی گئی۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جنہوں نے مدتوں پارٹی میں پوری وفاداری سے کام کیا تھا۔ ان میں 2 ہزار بچے بھی شامل تھے۔ ان قیدیوں کو چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں رکھا گیا بیڑیاں پہنائی گئیں اور زنجیروں میں جکڑا گیا۔ خواتین قیدیوں کو پوچھ گچھ کرنے والے اکثر اپنی ہوس کا نشانہ بناتے تھے۔ تمام قیدیوں کو بری طرح زدوکوب کیا جاتا اور انہیں بجلی کے جھٹکے پہنچائے جاتے تھے۔ بعد ازاں اس

عبارت کو اس نسل کشی کا میوزیم قرار دیا گیا تھا۔

کھمر روگ نامی تنظیم کو ابتدائی طور پر ویت کانگ نے ٹرین کیا تھا اور فوجی تربیت دی تھی تاہم ان دونوں گروہوں میں 1970ء کی ابتدائی دہائیوں میں باہمی رقابت اور حسد پیدا ہوگیا اور آخر کار یہ دونوں گروہ آپس میں لڑ پڑے چین پول پاٹ حکومت کی حمایت کرتا تھا مگر کمبوڈیا والے ویت نام والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ 1979ء کے شروع میں پول پاٹ اور اس کے حواریوں کو کمبوڈیا سے باہر نکال دیا گیا اور وہ تھائی لینڈ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ ویت نامیوں نے کمبوڈیا میں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی جس نے کمبوڈیا میں نجی جائیداد بحال کر دی اور مذاہب کو بھی بحال کر دیا۔

چار سال سے کم عرصے تک اقتدار میں رہنے کے باوجود پول پاٹ حکومت نے 35 لاکھ انسانوں کو قتل کیا تھا جو کہ کمبوڈیا کی آبادی کا چوتھا حصہ تھے۔ ان لوگوں کو بیگار کیمپوں میں رکھ کر اذیت دے کر اور بیماری اور فاقہ کشی سے ہلاک کیا تھا۔ کھمر روگ 1995ء تک جنگلوں میں لڑتی رہی۔ اس سال انہوں نے بالآخر نئی کمبوڈین حکومت سے صلح کر لی اور پول پاٹ کو گرفتار کر لیا گیا تاہم وہ 1998ء میں دل کا دورہ پڑنے سے چل بسا یا عدالتی کارروائی سے بچنے کے لیے مار دیا گیا۔

1976ء..... اٹلی کے قصبے سیوسو میں زہریلی گیس کا پھیلاؤ

کیمیکل فیکٹریوں کو جن سنجیدہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں پلانٹ کے اصلی ڈیزائن میں تبدیلی سب سے نمایاں ہے۔ اس تبدیلی کی جوہات کچھ بھی ہوں مگر یہ تبدیلیاں اکثر تباہی کا پیغام لئے ہوتی ہیں۔ 1921ء میں Oppau کے مقام پر ہونے والا دھماکہ اسی قسم کی تبدیلی کی وجہ سے رونما ہوا تھا۔ 10 جولائی 1976ء کو اٹلی کے قصبے سیوسو Seveso میں واقع آئیسما کیمیکل Icemesa پلانٹ میں بھی دھماکہ کچھ ایسی ہی وجوہات کی بنا پر ہوا۔ اس پلانٹ میں تیار کی جانے والی کیمیائی مصنوعات کے مزاج میں کی گئی تبدیلی انتہائی خطرناک ثابت ہوئی۔ اگرچہ یہ حادثہ ڈرامائی انداز میں رونما نہیں ہوا تھا، مگر اس سے پیدا ہونے والے اثرات تباہ کن تھے۔ چشم دید گواہوں کے مطابق اس کیمیکل فیکٹری سے ایک فیصد کیمیائی دھوئیں کا بادل نکلا اور پھر ہر طرف ایک ناخوشگوار کیمیائی بدبو پھیل گئی۔ یہ ناخوشگوار بدبو ایک انتہائی زہریلے نامیاتی کیمیائی مرکب ڈایوکسین Dioxion کی بو تھی جو سیوسو کی فیکٹری سے سفید کیمیائی دھوئیں کے بادل کی شکل میں نکلی تھی۔

شمالی اٹلی میں مشہور اطالوی شہر میلان کے نزدیک واقع قصبے سیوسو میں آئیسما کیمیکل پلانٹ کے منیجروں نے کئی سال بعد اس فیکٹری کے پروڈکشن پراسس میں کچھ تبدیلی کی جو حقیقتاً اس کے اصلی ڈیزائن میں تبدیلی تھی۔ اس فیکٹری میں کام کرنے والے ورکرز اس نئی تبدیلی سے بالکل ناواقف تھے اور ان میں سے بہت سے اس اہم کیمیائی پروسس میں درجہ حرارت کے کنٹرول کو جو انتہائی ضروری تھا برقرار نہیں رکھ سکے۔ اس کیمیائی پروسس میں اگر درجہ حرارت میں کمی بیشی واقع ہو جاتی تو اس سے کیمیائی بخارات خارج ہونے لگتے تھے جو ایک انتہائی زہریلی گیس ڈایوکسین کے بخارات تھے۔ اس زہریلے نامیاتی مرکب کے انسان پر براہ راست اثرات سے نہ صرف انسان سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے بلکہ اس سے انسان کی تولیدی نشو ونما متاثر ہوتی ہے۔ اور انسان کے ہارمونی نظام اور امیون سسٹم Immune system میں بھی خرابیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اسی گیس کے اخراج سے نیویارک میں لو کینال کا حادثہ رونما ہوا تھا۔ ہفتہ 10 جولائی کو جب آئسما پلانٹ میں ورکروں کی شفٹ میں تبدیلی ہوئی تو اسوقت TCP ایک کیمیائی پروڈکٹ تیار کی جارہی تھی جس کی تیاری میں درجہ حرارت پانی کے ذریعے کم کیا جاتا ہے۔ اگر

درجہ حرارت بڑھ جائے تو پھر TCP کی بجائے یہ پلانٹ ڈائیوکیسس تیار کرنے لگتا ہے۔ چونکہ نئی شفٹ میں آنے والے ورکر ابھی اس درجہ حرارت کی تبدیلی کے پروسس سے ناواقف تھے اور انہیں اس سے پیدا ہونے والی خطرناک صورتحال سے بھی آگاہی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ پلانٹ کے اس حصے میں جہاں کیمیائی عناصر کو باہم ملایا جانا تھا دباؤ بڑھ جانے سے کیمیائی بخارات آٹومیٹک طور پر خارج ہونے لگے تھے۔

پھر اس دن درجہ حرارت بڑھ جانے کے بعد دباؤ بڑھا تو ڈائیوکیسس کے زہریلے بخارات سفید دھوئیں کی صورت میں خارج ہونے لگے۔ یہ تقریباً دو پاؤنڈ وزنی زہریلے نامیاتی مرکب ڈائیوکسین کے بخارات تھے۔ پھر جلد ہی یہ اردگرد کے علاقوں کی فضاؤں میں پھیل گئے۔ چونکہ ان سے کسی قسم کا شور پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے لوگوں کو اس زہریلے مرکب کے ہوا میں شامل ہو جانے کا پتہ بھی نہیں چل سکا۔ جو کچھ دکھائی دیا وہ صرف کیمیکل فیکٹری سے سفید دھوئیں کا ایک بادل تھا۔

پھر سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوائیں اس زہریلی گیس کو سیوسو اور میلان کے آبادی والے حصوں کی طرف لے گئیں۔ جن لوگوں نے فیکٹری سے یہ سفید دھواں نکلتے دیکھا اور اس کی ناخوشگوار بو سونگھی انہوں نے اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں اس سے بچنے کے لئے بند کر لیں۔ مگر بہت سے گھروں میں یہ بو پہلے ہی پھیل چکی تھی۔ پھر اسی رات اس قصبے کے بہت سے مکین شدید سردرد اور متلی کی بیماری میں مبتلا ہوگئے۔ اگلی صبح اس قصبے کے بہت سے بچوں کی آنکھیں سوجی ہوئیں تھیں اور جلد پر چھالے نمودار ہو چکے تھے۔ اس علاقے کے ڈاکٹر اس نئی بیماری کا علاج کرنے سے قاصر تھے۔ اور نہ ہی یہ بتا سکے تھے کہ یہ کیونکر پیدا ہوئی ہے۔ ایک ہفتہ تک اس علاقے کے لوگوں کو اس بیماری میں اچانک مبتلا ہو جانے کا سبب معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ چونکہ اس علاقے میں رہنے والوں کی ڈائیوکسین سے پیدا ہونے والے اثرات کے متعلق معلومات محدود تھی۔ پھر اس علاقے کے لوگوں نے ایک اور عجیب بات یہ محسوس کی کہ ہزاروں کی تعداد میں اس علاقے میں مویشی مرنے لگے اور درختوں کے پتے درختوں پر مرجھا نے لگے جو بالکل ایک انہونی بات تھی ہسپتالوں میں جلد کے امراض میں مبتلا مریضوں کی بھرمار ہوگئی پھر اس فیکٹری کے قریبی علاقوں سے لوگوں کو محفوظ مقامات پر منتقل کیا جانے لگا اور اس علاقے میں تیار کی جانے والی کھانے پینے کی اشیا کے استعمال پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ایک ہفتے بعد آئیسما پلانٹ کے حکام نے اس علاقے کے لوگوں کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کئے جانے کی اپیل کی اور آخر اعلان کیا کہ اس علاقے میں ڈائیوکسین کے بخارات پھیل چکے ہیں جن کے اثرات کافی عرصے تک زائل نہ ہوسکیں گے۔ پھر اس علاقے کے میڈیکل افسروں نے سیوسو کو 1970ء کی دہائی کا ہیروشیما قرار دے دیا۔

اس علاقے میں شدید ترین مسائل اس کے بعد پیدا ہوئے جب جمہوریہ امریکہ کے شعبہ [illegible] نے یہ رپورٹ شائع کی کہ ڈایوکسین کی کم سے کم مقدار بھی انسانی اعضائے رئیسہ دل، جگر اور پھیپھڑوں کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ رحم مادر میں انسانی جنین کے لیے بھی تھیلیڈومائیڈ Thalidomide سے بھی زیادہ مضر ہے اس رپورٹ کے شائع ہوتے ہی پورے اٹلی میں معذور بچوں کی پیدائش کا خوف پھیل گیا۔ سیسوسو میں ڈاکٹروں نے لوگوں کو بتایا کہ اگر حاملہ خواتین میں جنین کی خرابی پائی جائے تو انہیں اسقاط حمل کا مشورہ دیا جائے گا۔ ڈاکٹروں کے اس اعلان سے ایک شدید بحث کا آغاز ہوگیا کہ آیا اسقاط حمل ایک جائز عمل ہے، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اٹلی میں رومن کیتھولک مسلک کی اکثریت حاصل ہے جو اسقاط حمل کے خلاف ہے۔

ڈایوکسین کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے متاثرہ علاقوں میں باقیماندہ جانوروں کو ختم کردیا گیا جس کے بعد اناج کے کھیتوں میں کھڑی فصلیں اور باغات میں لگے پھل اور سبزیاں بھی ضائع کردیے گئیں ان اقدامات کے باوجود ماہرین کو ڈایوکسین کے اثرات کے متعلق شبہ تھا کہ وہ زائل نہیں ہوئے کیونکہ دوسرے ممالک سے ڈایوکسین کے متعلق جو رپورٹیں میں تھیں وہ حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ مثلاً برطانیہ میں چند سال پہلے ڈایوکسین کے پھیلاؤ کے بعد جس فیکٹری میں یہ زہریلی گیس پیدا ہوئی تھی اسے زمیں بوس کرکے زمین میں دفن کردیا گیا تھا۔ اسی طرح ویت نامی جنگ میں ڈایوکسین سے پیدا شدہ اثرات کے متعلق ویت نامی ماہرین نے بھی جو رپورٹیں شائع کی تھیں ان سے بھی ڈایوکسین سے پیدا شدہ مسائل کو شدید بتایا گیا تھا۔

1976ء..... بیسویں صدی کا بدترین زلزلہ

28 جولائی 1975ء کو چین کے علاقے تانگ شین Tangshan میں ماہرین کے مطابق بیسویں صدی کا بدترین زلزلہ آیا جس میں ہلاک شدگان کی تعداد کو سرکاری طور پر کبھی بھی درست طور پر بیان نہیں کیا جاسکا چینی حکومت نے ابتدا میں بتایا کہ واقع ہونے والی اموات کی تعداد 6 لاکھ 55 ہزار ہے مگر بعد ازاں اس تعداد کو 2 لاکھ 55 ہزار ظاہر کیا گیا جبکہ ماہرین بعد کے اعداد و شمار کو بہت کم تصور کرتے ہیں۔ چین میں گذشتہ 4 سو سالوں میں آنے والا یہ ہولناک ترین زلزلہ تھا۔ یہ زلزلہ دو بڑی لہروں کی شکل میں آیا۔ صبح سویرے آنے والے زلزلے کے جھٹکے ریکٹر اسکیل پر 8.2 درجے کے تھے۔ جبکہ ان جھٹکوں کے بعد دن میں جو جھٹکے محسوس کیے گئے وہ 7.9 درجے کے تھے۔ یہ دونوں جھٹکے 1906ء میں سان فراسسکو میں آنے والے زلزلے سے کہیں شدید درجے کے تھے۔ یہ زلزلہ چونکہ چینی دارالحکومت بیجنگ سے صرف 150 میل دوری پر آیا تھا اس لیے چینی حکام خوفزدہ تھے کہ زلزلے کے جھٹکے شاید پھر آئیں گے اس لیے انہوں نے دارالحکومت کے لوگوں کو بھی احتیاطاً عمارتوں کے باہر رہنے کا حکم دیا تھا۔ اگلے چھ ہفتے تک ایک کروڑ 20 لاکھ چینی شہری اپنے گھروں کے باہر عارضی پناہ گاہوں میں سونے پر مجبور رہے تھے۔

چونکہ اس شدید زلزلے کا مرکز عین تانگ شین نامی شہر کے نیچے تھا اس لیے تباہی لرزہ خیز تھی۔ جو شہری عمارتوں کے گرنے سے ہلاک نہیں ہوئے انہیں زلزلے کے شدید جھٹکوں نے 5 فٹ بلندی پر اچھال کر پرے پھینک دیا تھا۔ چند ماہرین اس زلزلے سے پہنچنے والے مالی و جانی نقصانات کو ایٹم بم (ہیروشیما) سے پہنچنے والے نقصانات کے برابر قرار دیا تھا۔ دوسری طرف یہ زلزلہ چین میں آنے والے 1556ء کے زلزلے جتنا ہی تباہ کن تھا جس نے وسطی چین کے 98 ضلعوں اور 8 صوبوں میں تباہی مچا دی تھی۔ 1556ء کے زلزلے میں 8 لاکھ 30 ہزار لوگ ہلاک ہوئے تھے اور 1976ء کے زلزلے کا جانی نقصان بھی کم و بیش اتنا ہی تھا جو چینی حکومت نے 6 لاکھ 55 ہزار بتایا تھا۔ تانگ شین میں مقامی وقت کے مطابق صبح تین بج کر چوبیس منٹ پر زمین کی سطح سے سات میل نیچے ایک شگاف میں سب سے پہلے حرکت شروع ہوئی تھی۔ حرکت سے جو حرکی توانائی پیدا ہوئی وہ جب زمین کی مختلف پرتوں میں سے گذر کر سطح زمین پر پہنچی تو زمین پہلے چند سیکنڈ کے لیے گھڑی کی سوئیوں کے موافق حرکت کرنے لگی پھر اچانک

یہ حرکت گھڑی کی سوئیوں کی حرکت کی مخالف سمت میں بدل گئی اس کے بعد زمین اوپر اٹھنے لگی
ان شدید حرکات کی وجہ سے تانگ شین کی 100 فی صد عمارتوں میں سے 96 فی صد زمین بوس ہوگئیں
مجموعی طور پر ساڑھے تین لاکھ عمارتیں منہدم ہوگئیں۔ اور 100 میں سے 90 کارخانے بھی گر گئے

لاکھوں لوگ رات کے اس پہر میں اپنے بستروں میں محو استراحت تھے انہیں پھر بھی اپنے
سے نکلنا نصیب نہ ہوا۔ لاکھوں لوگ مکانوں کے انہدام سے شدید زخمی ہوگئے جبکہ لاکھوں لوگ
کے بعد پھیلنے والی بیماریوں، ٹائیفائیڈ اور اسہال، انفلوائنزا اور دماغ کی سوزش سے ہلاک ہوگئے۔ تانگ
شین شہر میں چار بڑے ہسپتال تھے چاروں زلزلے کے دوران زمین بوس ہوگئے اور ان میں موجود ہر ڈاکٹر
روح مارا گیا۔ زلزلے سے زخمی ہونے والوں کے لیے ایمرجنسی کیمپوں کے سوا کوئی ہسپتال نہیں رہا۔ شہر
میں ہر طرف انسانی لاشیں بکھرنے کی وجہ سے جلد ہی تعفن پھیل گیا اور وبائی امراض بڑھ گئے۔

اسی شام 7.1 درجے کا ایک اور زلزلہ آیا جس نے رہی سہی عمارات کو بھی منہدم کر دیا جو زندہ بچ
جانے والے پہلے جھٹکوں کی وجہ سے ملبے میں دب جانے والے زخمیوں کو نکال رہے تھے وہ اب خود بھی
ملبے میں دب گئے۔ شہر میں اب کوئی عمارت باقی نہ رہی۔

اس علاقے کی ہر سڑک ٹوٹ گئی، پل تباہ ہوگئے اور 250 میل لمبی ریلوے لائن اکھڑ گئی۔ رسل و
رسائل کے ذرائع کی اس تباہی نے اس علاقے میں کی جانے والی امدادی کاروائیوں کو مشکل بنا دیا۔ ٹیلی
فون لائنیں ٹوٹ جانے اور ریڈیائی رابطے ٹوٹ جانے کی وجہ سے بیجنگ میں اس زلزلے کے ہاتھوں پھیلنے
والی اس بڑی تباہی کی خبر گھنٹوں کی تاخیر کے بعد پہنچ سکی۔

مگر عظیم چینی قوم اس تباہی سے ہراساں نہیں ہوئی اور صرف (۳) سال کی کوششوں کے بعد اس
شہر کو مکمل طور پر دوبارہ آباد کر لیا گیا اس کی تعمیر نو پر 80 ملین سے زائد ڈالر خرچ آئے۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کے سرکاری اخبار Peoples daily نے اس زلزلے کے دوران پیش آنے
والے واقعات کی رپورٹیں شائع کرتے ہوئے لکھا کہ ہماری قوم اس بڑی قدرتی آفت سے عظیم راہنما
ماؤزے تنگ کی قیادت کی وجہ سے آسانی سے نکل آئی ہے جو کہ بڑ کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ اسی
اخبار نے ایک خبر شائع کی جس میں لکھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک رکن چی چنگ من نے تانگ شین میں
زلزلے کے بعد جب خود کو اپنے گھر کے ملبے سے نکالا تو اسے اپنے بیوی بچوں کی آواز سنائی دی کہ پاپا
ہمیں نکالو ابھی وہ اپنے بیوی بچوں کو نکال ہی رہا تھا کہ اسے کمیونسٹ پارٹی کے مقامی سیکرٹری کے گھر سے
جو اس کا ہمسایہ تھا امداد کرنے کی درخواست سنائی دی۔ چی چنگ نے اپنے بیوی بچوں کو ملبے تلے دبا چھوڑ
کر کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری اور اس کے بچوں کو ملبے کے نیچے سے نکالا جب اس سیکرٹری نے چی چنگ

سے اس کے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھا تو چی چنگ نے جواب دیا کہ آپ ہماری پارٹی کے سیکرٹری ہیں آپ کے پاس وقت نہیں ہے آپ فوراً جایئے اور امدادی کاروائیوں کو منظم کیجئے۔ مگر اخبار کی رپورٹ کے مطابق جب چی چنگ واپس اپنے گھر پہنچا تو اس کے بیوی بچے اس کے فرض پر قربان ہو چکے تھے۔ یہ تھا عظیم قائد ماؤزے تنگ کی تعلیمات کا اثر۔ اسی وجہ سے نہ چی چنگ کو اپنے اس فرض کی ادائیگی پر کوئی پچھتاوا نہیں ہوا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا؟ کیا وہ انسان نہیں بلکہ کمیونسٹ ربوٹ تھا؟

1977ء دنیا کا بدترین فضائی حادثہ جو روئے زمین پر رونما ہوا

بحیرہ اوقیانوس میں براعظم یورپ کے نزدیک جزائر کینری واقع ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے درمیان چلنے والی ایئر ٹریفک اکثر ان جزائر کے لاس پالماس Las palmas ایئر پورٹ پر ٹھہر کر یورپ اور امریکہ میں اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہوتی ہے 27 مارچ 1977ء کو اس ایئر پورٹ پر ہونے والے ایک بم دھماکے کے بعد یہ ایئر پورٹ عارضی طور پر بند کر دیا گیا اور ایئر ٹریفک کو ایک نزدیکی ایئر پورٹ ٹینریف Tenerife پر منتقل کر دیا گیا اسی دن دو 747 جمبو جیٹ لاس پالماس ایئر پورٹ پر کچھ دیر رکنے کے لیے جزائر کیناری پہنچے مگر ایئر پورٹ کے عارضی طور پر بند ہونے کی وجہ سے انہیں ٹینریف ایئر پورٹ پر اترنا پڑا۔ ان میں سے ایک اس وقت کی مشہور ایئر لائنز پان ایم کا مسافر برادر جمبو جیٹ تھا جبکہ دوسرا 747 ہالینڈ کی قومی فضائی کمپنی KLM سے تعلق رکھتا تھا۔ پان ایم کے طیارے پر 380 مسافر اور عملے کے 14 ارکان سوار تھے۔ جبکہ ان مسافروں میں زیادہ تر امریکی ریاست کیلی فورینا سے تعلق رکھنے والے معمر افراد شامل تھے جو بحیرہ روم کی سیر کے لیے لاس پالماس پہنچے تھے۔ انہوں نے یہ سیر بعد ازاں ایک بحری جہاز پر سوار ہو کر کرنا تھی جبکہ KLM کے مسافر برادر طیارے میں زیادہ تعداد کم سن بچوں کی تھی جو اسکول کے طالب علم تھے۔

ان دونوں طیاروں میں سے پہلے KLM کے طیارے جمبو جٹ 747 نے ٹینریف ایئر پورٹ پر لینڈ کیا۔ اس طیارے کے لینڈ کرنے سے پہلے اس ایئر پورٹ پر 10 اور طیارے لینڈ کر چکے تھے اور اس چھوٹے سے ایئر پورٹ پر طیارے پارک کرنے کی تمام جگہ بھر چکی تھی۔ یہاں تک کہ کچھ جہازوں کو ٹیکسی وے پر بھی کھڑے کر دینے کی اجازت دینا پڑی تھی جس کی وجہ سے ٹیکسی وے سے رن وے تک آنے جانے کا راستہ بند ہو چکا۔ ان حالات میں جن طیاروں نے ٹیک آف کرنے کے لیے رن پر پہنچنا تھا ان کے لیے صرف یہی راستہ بچا تھا کہ جہاز رن وے پر ایک طرف سے داخل ہو کر رن وے پر ہی ٹیکسی کرتا ہوا دوسرے سرے تک پہنچے پھر وہاں سے یک دم 180 ڈگری پر مڑ کر ٹیک آف کرنے کے لیے ایئر کنٹرولر سے اجازت طلب کرے۔

کے ایل ایم کے طیارے کے کپتان نے اس ایئر پورٹ پر قیام کے دوران ہالینڈ واپس جانے کے

لیے ایندھن بھی طیارے میں بھروالیا۔ اس کے ایندھن لینے کے دوران ہی پان ایم کا جمبو جیٹ بھی ٹینریفے ایرپورٹ پر لینڈ کر گیا اور اس کے کپتان نے اپنے طیارے کو KLM کے طیارے کے قریب ہی پارک کرلیا۔ پھر اچانک اطلاع آئی کہ لاس پالماس ایرپورٹ کھولدیا گیا ہے۔ اس دن یعنی 27 مارچ کو صبح ہی سے سمندری دھند ٹینریفے ایرپورٹ کے رن وے پر چھائی ہوئی تھی کبھی کبھی ہوائیں اس دھند کو کسی اور سمت میں لے جاتیں تو مطلع قدرے صاف ہو جاتا مگر کچھ دیر بعد یہ دھند پھر واپس لوٹ آتی تو ہاتھ کو ہاتھ تک سجائی نہ دیتا تھا۔

KLM کے طیارے نے پان ایم کے طیارے سے پہلے ٹیک آف کرنا تھا اس لیے اس نے کنٹرل ٹاور سے ٹیک آف کرنے کی اجازت طلب کی جس پر اسے بتایا گیا کہ وہ رن وے پر ہی ٹیکسی کرتا ہوا ٹیک آف پوائنٹ تک پہنچے اور وہاں 180 درجے مڑ کر ٹیک آف کے لیے مزید ہدایات کا انتظار کرے۔ اس دوران رن وے پر ایک بار پھر دھند چھا گئی اور حد نظر 450 فٹ سے بھی کم رہ گئی اس ایرپورٹ پر کوئی گراؤنڈ ریڈار بھی نصب نہیں تھا جس کی مدد سے ایر ٹریفک کو دیکھا جاسکتا۔ ادھر رن وے پر نصب زیر سطح روشنیاں جو دھند میں کپتان کی مدد کرتیں ہیں کسی وجہ سے اس دن کام نہیں کر رہی تھیں۔ دوسری طرف ایر کنٹرول ٹاور کے ڈیوٹی پر موجود لوگ اسپین اور ہنگری کے درمیان کھیلا جانے والا فٹ بال میچ دیکھنے میں مصروف تھے اور کام کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

KLM کے طیارے کے پیچھے پیچھے ہی پان ایم کا طیارہ بھی روانہ ہوگیا اور رن وے پر ٹیکسی کرتا ہوا تیسرے موڑ پر پہنچ گیا اسے ایر کنٹرول نے ہدایات دیں تھیں کہ وہ اس موڑ پر پہنچ کر ٹیکسی وے پر چلا جائے۔ اس رن وے سے ٹیکسی وے پر جانے کے لیے چار موڑ تھے جن کا نام CI ، CII ، CIII اور CIV تھا۔ CIV ٹیک آف پوائنٹ کے نزدیک واقع تھا۔ چونکہ CI پارک شدہ جہازوں کی وجد سے بند تھا، اس لیے پان ایم کا کیپٹن غلطی سے CIV کو تیسرا موڑ سمجھا جبکہ KLM کے کپتان نے یہ تصور کیا کہ پان ایم کا طیارہ CIII پر رن وے کو خالی کر دے گا۔ اگرچہ دونوں پائلٹ ایک ہی فریکوئنسی پر ٹاور سے بات کر رہے تھے اور ایک دوسرے کی گفتگو بھی سن سکتے تھے لیکن ہوئی اپنے بل ہی چلتی۔ پین ایم کا طیارہ CIV سے ابھی کچھ ہی دور تھا کہ اسے اچانک KLM کے جمبو کی لائٹس دکھائی دیں اور پھر سے یہ طیارہ پین ایم کی طرف بڑھا دراصل KLM کے طیارے کے کپتان نے پان ایم کے طیارے تیزی CIV موڑ سے ٹیکسی وے پر چلے جانے سے پہلے ہی ٹیک آف کرنا شروع کر دیا تھا جب KLM کے کپتان کو پان ایم کا طیارہ نظر آیا تو اس وقت بڑی دیر ہو چکی تھی اس نے پان ایم سے متوقع ٹکراؤ سے بچنے کے لیے اپنے جہاز کو بلند کرنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہوسکی اور KLM کا طیارہ پین ایم کے طیارے سے ٹکرا

کر ون وے سے 300 فٹ دور جا گرا۔ چونکہ دونوں طیاروں کے ٹینک ایندھن سے لبریز تھے اس ٹکراؤ کے فوراً بعد ہی ایک زور دار دھماکہ ہوا اور KLM کے طیارے میں آگ لگنے سے اس کے تمام مسافر اور عملے کے ارکان جاں بحق ہوگئے دوسری طرف پان ایم پر سوار 394 افراد میں سے صرف 66 زندہ بچے۔ بعد ازاں ان میں سے بھی دو مسافر ٹیز یفے ہسپتال میں دم توڑ گئے اور ایک مسافر اس خصوصی طیارے میں فوت ہوگیا جو بچے کھچے زندہ افراد کو واپس امریکہ لے جارہا تھا۔ مزید تین معمر افراد امریکہ پہنچ کر چل بسے۔ اس طرح دنیا کے اس بدترین فضائی حادثے میں جو زمین پر ہی رونما ہوا تھا کل 582 افراد ہلاک ہوگئے اور یہ دنیا کا سب سے زیادہ شرح اموات رکھنے والا فضائی حادثہ قرار پایا۔

1978ء..... لو کینال، نیویارک کی تابکاری سے آلودگی

1892ء کی دہائی میں آبشار نیاگرا کے نزدیک واقع ایک سابقہ صنعتی علاقے کو نیاگرا فال اسکول بورڈ کے حوالے کیا گیا تھا۔ اس علاقے میں اسکول بورڈ نے ایک ایلمنٹری اسکول تعمیر کیا جس کے بعد بہت سے امریکی خاندان اس علاقے میں آ کر بس گئے۔ 2 اگست 1978ء کو اس علاقے میں واقع صنعتی فضلے کے مضر صحت اثرات ظاہر ہوئے تو اس علاقے کی قریبی آبادیوں کو خالی کروالیا گیا۔

آبشار نیاگرا کے قریب واقع اس علاقے کا نام لو کینال Lovecanal تھا جو اس علاقے کے آباد کار ولیم لو William Love کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ امریکہ میں صنعتی فضلے کا سب سے بڑا ڈپو تھا۔ اس علاقے کی تاریخ یہ تھی کہ انیسویں صدی کے آخر میں ولیم لو نے دریائے نیاگرا کے کنارے ایک آبادی آباد کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے ایک نہر تعمیر کرائی تھی جو اس کے نام پر لو کینال کہلاتی تھی۔ مگر اس علاقے میں ہائیڈرو پاور سے بجلی پیدا کی جانے کی وجہ سے ولیم لو کا ایک آبادی قائم کرنے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور اس کی بجائے بجلی کی فراوانی ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں صنعتی یونٹ لگا دیئے گئے اور اسی وجہ سے لو کینال محض ایک خندق 60x1300 کی حیثیت سے موجود رہی 1920ء میں اسے سٹی آف نیاگرا فال نے خرید لیا اس خندق میں میونسپل کمیٹی کے فضلے کا ڈپو قائم کر دیا۔ 1940ء کی دہائی میں اس کے آس پاس کا علاقہ ہوکر الیکٹرو کیمیکل نامی کمپنی نے خرید لیا اور یہاں ایک فیکٹری لگائی، اپنی فیکٹری کے کیمیائی فضلے کو لو کینال میں ڈالنے لگی۔ 1942ء سے 1954ء سے 25000 ٹن کیمیائی فضلہ جزوی طور پر ڈرموں میں بند کر کے ڈالا گیا۔ اس کے علاوہ سٹی آف نیاگرا نے بھی اسے اپنا فضلہ ڈپو بنا لیا تھا۔

اس وقت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہوکر کمپنی کے فضلہ میں کونسے کیمیائی مرکبات شامل ہیں تاہم بعد ازاں یہ دریافت ہوا کہ ہوکر کمپنی کے فضلے میں ڈایوکسین Dioxion بھی شامل تھی جو دنیا کے انتہائی سرطان کا مرض پیدا کرنے والے کیمیکل میں سے ایک زہریلا ترین کیمیائی مرکب ہے۔ اس کیمیکل نے صرف دو سال پہلے اٹلی کے قصبے سیوسو میں بے پناہ نقصان پہنچایا تھا۔ ڈایوکسین کی جو مقدار لو کینال میں موجود تھی وہ کم از کم 120 پونڈ تھی جو سیوسو میں کیمیائی دھوئیں کی صورت میں پھیلنے والی مقدار سے کہیں

زیادہ تھی۔ 1954ء میں ہوکر کمپنی نے اپنے کارخانے کی زمین نیاگرا فالز اسکول بورڈ کو بیچ دی تاکہ وہاں ایک نیا اسکول تعمیر کیا جاسکے کمپنی نے اپنی اس زمین کی قیمت انتہائی کم یعنی صرف ایک ڈالر لی تھی کیونکہ اس علاقے میں ایک اچھے اسکول کی ضرورت تھی۔ تاہم ہوکر کمپنی نے کیمیائی فضلے کو صاف کرنے کی ذمہ داری اسکول بورڈ کو دیدی۔ اسکول کی تعمیر کے بعد اس علاقے میں لوگ رہنے کے لیے خود بخود آنے لگے۔

اسکول اور دیگر رہائشی تعمیرات عین لو کینال کے اوپر تعمیر کی گئیں۔ لو کینال اب ہزاروں ٹن کیمیائی فضلے کا مدفن تھی جس کے اوپر یہ سب تعمیرات کی گئیں تھیں۔ 1970ء کی دہائی تک بالاخر نامیاتی کیمیائی مادوں کے اس آبادی پر اثرات ظاہر ہونے لگے۔ اس علاقے میں تقریباً آٹھ گھر اور 25 اپارٹمنٹس تعمیر ہو چکے تھے۔ اس جگہ کیمیائی مادوں کی موجودگی کی شکایات 1954ء سے ہی جاری تھیں۔ 1975 اور 1976ء میں اس علاقے میں بہت سی موسلادھار بارشیں ہوئیں جن سے زمین میں پانی کی سطح بلند ہوگئی۔ ادھر اسی وجہ سے لو کینال میں دفن کیمیائی فضلے کے ڈرم بھی سطح پر آ گئے۔ 55 ایسے ڈرم تھے جن سے بدبودار کیمیائی سیال بہہ رہا تھا جس سے پورے علاقے میں ناگوار بو پھیل گئی۔ اس علاقے کے مکینوں نے شکایات کے ڈھیر لگا دیئے۔ آخر کانگریس کا ایک رکن اور فیڈرل ماحولیات کی حفاظت کے محکمے EPA نے ان شکایات پر توجہ دی اور لو کینال کے نزدیک تعمیر کئے گئے مکانات کے تہہ خانوں کا معائنہ کرایا گیا۔

اس معائنہ میں انسانی صحت کے لیے انتہائی مضر کیمیکل دریافت ہوئے جس کے بعد نیویارک کے محکمہ صحت نے اسے ایک ضرر رساں علاقہ قرار دیدیا اور اس کے گرد جنگلہ لگا دیا گیا جس کے بعد یہاں تعمیر کردہ اسکول بند کر دیا گیا اور اس علاقے سے بچوں اور حاملہ خواتین کو دوسرے مقامات پر منتقل کرنا شروع کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس علاقے کا گذشتہ دو سال کا صحت کا ریکارڈ چیک کیا گیا تو انتہائی خوفناک بیماریوں کے پھیلنے کا سراغ ملا جو بالکل ویسی تھیں جیسی سیوسو، اٹلی میں پھیلیں تھیں جس کے بعد محکمہ صحت نے انتہائی اقدام اٹھایا اور لو کینال کے مکینوں کو آگاہ کیا گیا کہ وہ اپنے گھروں کے تہہ خانے استعمال نہ کریں اور نہ اپنے گھروں میں سبزیاں اور دیگر اشیا اگائیں۔ پھر جب لو کینال میں مدفون فضلے کا معائنہ کرایا گیا تو وہاں ڈایوکسین کی مزید اضافی مقداریں دریافت ہوئیں تو لو کینال کے رہائشی علاقے کے مکینوں کو اس اضافی خطرہ سے بچانے کے لیے مزید اقدامات کئے گئے اور یہ علاقہ مکمل طور پر خالی کرا لیا گیا۔

1979ء..... امریکہ کی تاریخ کا بدترین، ایٹمی حادثہ

امریکہ کی تاریخ کا بدترین ایٹمی حادثہ ایک کمرشل نیوکلیئر پاور اسٹیشن پر 28 مارچ کی صبح 4 بجے رونما ہوا، یہ پاور اسٹیشن جزیرہ تین میل پر مڈلٹن، پنسلوانیا میں واقع تھا۔ یہ حادثہ اس وقت رونما ہوا جب اس پلانٹ کے غیر ایٹمی حصے میں کوئی خرابی رونما ہوئی جس سے ایٹمی اری ایکٹر کو پانی سپلائی کئے جانے کے دو بڑے پائپ بند ہوگئے۔ یاد رہے کہ ایٹمی ری ایکٹر میں چین ری ایکشن کو کم یا زیادہ کرنے کے لیے پانی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ پانی کے پمپ بند ہو جانے کے بعد ری ایکٹر میں چین ری ایکشن جاری رہا۔ پانی کی سپلائی کے بغیر جلد ہی ری ایکٹر سے ریڈیو ایکٹو Radioactive گیس خارج ہونے لگی اور آس پاس کے علاقے میں پھیل گئی۔ اس تابکار گیس کے پھیلنے سے اس علاقے کے مکینوں کی زندگی کو سخت خطرہ درپیش آ گیا تاہم خوش قسمتی سے ایٹمی ری ایکٹر سے خارج ہونے والی گیس میں تابکاری کی مقدار کم تھی اور اس سے علاقے میں اموات واقع نہیں ہوئیں۔ گورنر پنسلوانیا نے علاقے کے مکینوں کو گھر چھوڑنے کا حکم نہیں دیا اس کی بجائے صرف چھوٹے بچوں اور حاملہ خواتین کو گھروں میں رہنے کا حکم دیا۔

امریکہ میں درجنوں کی تعداد میں نیوکلیئر پاور پلانٹ کام کرتے ہیں۔ اور تقریباً امریکہ کی آدھی ریاستوں کو بجلی فراہم کرتے ہیں۔ آج کل ان پاور پلانٹوں میں ایسا سسٹم رکھا گیا ہے کہ اگر ان میں سے کسی میں بھی کوئی خرابی واقع ہو جائے تو پورے امریکہ میں خطرے کا الارم بجنے لگتا ہے۔ یہ نظام مارچ 1979ء میں جزیرہ تین میل پنسلوانیا کے نیوکلیر پلانٹ میں خرابی واقع ہونے کے بعد درپیش آنے والے خطرات کی وجہ سے متعارف کرایا گیا تھا۔ ایک ماہر کے نزدیک جزیرہ تین میل پر جو ایٹمی حادثہ پیش آیا تھا وہ عام قسم کا ایٹمی حادثہ تھا جو کسی بھی دوسرے پاور پلانٹ پر پیش آ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ایٹمی حادثات سے بچاؤ کے اقدام کے طور پر الارم کا یہ سسٹم متعارف کرایا گیا ہے۔ جزیرے 3 میل کے نیوکلیئر پلانٹ پر ایٹمی حادثہ مکینکل ناکامی اور انسانی غفلت یا غلطی سے رونما ہوا تھا۔

جو پائپ ایٹمی ری ایکٹر کے ایندھن سیل Fuel cell کو پانی فراہم کرتے ہیں ان کو باقاعدگی سے ایک مخصوص وقفے کے بعد صاف کیا جاتا ہے۔ اسی صفائی کے دوران کسی ورکر نے غلطی سے ری ایکٹر کو پانی کی سپلائی معطل کر دی جس سے یہ پاور پلانٹ بند ہوگیا۔ موقع پر موجود ورکروں نے ایک بلند شور کی

آواز سنی جس سے پلانٹ بند ہونے کی تصدیق ہوگئی۔ یہ واقعہ 28 مارچ 1979ء کو تقریباً صبح 4 بجے پیش آیا تھا۔ پاور پلانٹ کے ہنگامی طور پر بند ہو جانے کے تھوڑی دیر بعد پانی کی سپلائی بحال ہوگئی جس کے بعد اس پلانٹ کے تیار کرنے والوں کے مطابق اسے دوبارہ کام شروع کرنا چاہئے تھا مگر یہ صرف ایک نظریہ تھا۔ اگرچہ اس پلانٹ کے تمام حصے صحیح حالت میں تھے مگر پانی کی سپلائی کے اس کے کام کرنے کے دوران اچانک بند ہو جانے کی وجہ سے اس پلانٹ میں جو پریشر پیدا ہوا اس سے ایک ریلیف والو Relief valve کھل گیا اور اس سے تابکار ریڈیو ایکٹو گیس خارج ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی 200 گیلن فی منٹ کے حساب سے ری ایکٹر کی کور میں موجود پانی بھی بہنے لگا در اصل یہ اس غفلت کا نتیجہ تھا کہ جب ری ایکٹر کو پانی کی سپلائی معطل ہوئی تھی تو انجانے میں کسی ورکر نے ایٹمی پلانٹ سے خارج کیے جانے والے پانی کی ایک ڈرین لائن Drain line کو غلطی سے کھول دیا تھا۔ ٹھنڈا پانی ری ایکٹر سے باہر بہہ جانے کی وجہ سے ری ایکٹر کی کور بہت زیادہ گرم ہوگئی اور اس کا درجہ حرارت 5 ہزار فارن ہائیٹ تک پہنچ گیا جس سے اس میں موجود کچھ فیول راڈ پگھل گئے اور اس طرح تابکار گیس اور پانی اس علاقے میں پھیل گئے۔ ایٹمی ماہرین کے نزدیک اگر یہ کور پوری طرح پگھل جاتی تو پھر دھماکا ہو جاتا جس سے یہ پوری عمارت تباہ ہو جاتی جس سے سینکڑوں میل دور تک تابکاری پھیل جاتی۔ روسی ایٹمی حادثے میں جو چرنو بائل یوکرین میں رونما ہوا تھا ایسا ہی ہوا تھا جس سے نہ صرف یوکرین بلکہ پورے یورپ میں تابکار گیس پھیل گئی تھی۔ اگر اس امریکی پلانٹ میں ایسا ہوتا تو تابکاری کیلی فورنیا تک پھیل جاتی۔

تین میل کے اس ایٹمی حادثے کے بعد صفائی کا عمل گیارہ سال میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور اس پر 973 ملین ڈالر خرچ آئے۔ ماہرین کا دعویٰ تھا کہ اس حادثے میں تابکاری کی بہت معمولی سی مقدار خارج ہوئی تھی۔ مگر اس سے ظاہر ہونیوالے اثرات پر امریکہ بھر میں بڑی مدت تک مباحثے جاری رہے۔

1982ء..... افغانستان میں سرنگ کا حادثہ

دنیا کا بدترین روڈ ایکسیڈنٹ جو افغانستان کی ایک سرنگ میں رونما ہوا تھا وہ بڑے عرصے تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا کیونکہ اس کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ کوئی حادثہ تھا یا جان بوجھ کر کیا گیا حملہ؟ یہ حادثہ 3 نومبر 1982ء کو افغانستان میں موجود اکلوتی روڈ سرنگ میں رونما ہوا تھا۔

1.7 میل طویل یہ سیلنگ Salang نامی سرنگ 1964ء میں تعمیر کی گئی تھی اور 11000 فٹ کی بلندی پر پہاڑوں میں واقع تھی یہ دارالحکومت کابل کے 70 میل شمال میں واقع تھی۔ اس سرنگ سے روسی ریڈ آرمی کا ایک کانوائے Convoy گذر رہا تھا کہ یہ حادثہ پیش آیا۔ باغیوں کے حملے سے ڈرتے ہوئے روسیوں نے اس سرنگ کو سیل کر دیا۔ روسی فوج نے اس سرنگ سے دھواں نکلتا دیکھا تھا اور انہیں سرنگ کے اندر سے رپورٹ ملی تھی بہت سے موٹر کار سوار حضرات اپنی گاڑیوں میں منجمد کر دینے والی سردی سے بچنے کے لیے بیٹھے رہے وہ یا تو آگ لگنے کی وجہ سے گاڑیوں سمیت جل گئے یا پھر سرنگ میں دھواں پھیل جانے کی وجہ سے دم گھٹ کر ہلاک ہوگئے۔

کچھ افغان مہاجرین نے بتایا تھا کہ روسی فوجی کانوائے میں شامل ایک تیل سے بھرا ہوا ٹینکر ایک دوسرے فوجی ٹرک سے ٹکرا گیا تھا جس سے سرنگ میں ایک زور دار دھماکہ ہوا اور آگ لگ گئی تھی۔ کچھ اور رپورٹوں میں بتایا گیا ہے کہ سرنگ سے گذرنے والی گولہ بارود سے بھری ہوئی لاری میں آگ لگ گئی تھی جس کے بعد یہ لاری دھماکہ سے اڑ گئی۔ ایک چشم دید گواہ کے مطابق وہ سرنگ میں داخل ہونے والے راستہ سے صرف بیس گز کے فاصلے پر تھا جب سرنگ کے اندر سے دھماکے کی آواز آئی اور پھر سرنگ سے سیاہ رنگ کا دھواں نکلنے لگا۔ اس دھماکے سے بس کے مسافر شدید متاثر ہوئے اور کم از ایک مسافر کی موت واقع ہوگئی تھی۔ کچھ بیانات کے مطابق دھماکہ کے بعد بھی گاڑیاں سرنگ میں داخل ہونے لگیں تھیں کہ روسی فوج نے سرنگ کو سیل کر دیا۔ کچھ چشم دید گواہوں کے مطابق بعد ازاں تقریباً آدھی درجن ٹرک انسانی لاشوں اور اعضا سے بھرے ہوئے نکلتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ ان ٹرکوں میں صرف روسی فوجیوں کی لاشیں لدی ہوئیں تھیں۔ ایک افغان جو حادثے کے اگلے دن جائے وقوع پر پہنچا تو اس نے

دیکھا کہ فوجی اور سویلین ڈرائیور گاڑیوں کے ٹائروں سے چمٹے ہوئے تھے۔

یہ افواہ بھی پھیلی ہوئی تھی کہ افغان باغی اس سرنگ کو اڑانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ جس کے بعد افغانستان میں موجود ایک لاکھ روسی فوج کو ہر قسم کی سپلائی معطل ہو جانا تھی۔ اس حادثے کے فوراً بعد ایک باغی افغان گروہ نے اس حادثے کی ذمہ داری بھی قبول کرلی تھی تاہم دوسرے باغی گروہوں نے اس حادثے میں ملوث ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس حادثے میں کتنی گاڑیاں تباہ ہوئیں تھیں اس کا ریکارڈ روسیوں نے کبھی شائع نہیں کیا تھا۔ تاہم یہ اندازہ ضرور تھا کہ اس حادثے میں کم از کم 2000 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ اس حادثے کے بعد کئی دن تک کابل سوگوار رہا تھا کیونکہ اس حادثے میں کابل سے تعلق رکھنے والے بہت سے خاندانوں کے افراد ہلاک ہوگئے تھے۔

یہ سرنگ بعد ازاں دوبارہ کھول دی گئی تھی تاہم روسیوں کے 1989ء میں انخلاء کے بعد اس سرنگ کی دوبارہ مرمت نہیں کی گئی تھی۔ اس کے تقریباً 9 سال بعد اس سرنگ کا ایک حصہ افغانستان میں ہونے والی خانہ جنگی میں تباہ ہوگیا تھا۔ مرمت کے بعد اس سرنگ کو 2002ء میں دوبارہ کھولدیا گیا مگر لوگ اس سرنگ سے گذرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اس سرنگ کو ہوا دار اور روشن رکھنے والا نظام بالکل خراب ہو چکا تھا بی بی سی کے ایک نمائندے نے بتایا کہ وہ اپنی کار میں اس سرنگ سے گذر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ کار کی بتیاں روشن رکھنے کے باوجود اسمیں اندھیرا تھا اور میں ایک میٹر سے زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے کچھ دن بعد اس سرنگ میں کچھ لوگ دم گھٹنے اور سردی کی وجہ سے جاں بحق ہوگئے پھر ایک لینڈ سلائیڈ میں اس سرنگ کا ایک سرا بند ہوگیا تھا۔

1982ء..... کینیڈا میں آئل پلیٹ فارم کی غرقابی

اوشین رینجر Ocean ranger نامی ایک آئل ڈرلنگ رگ جنوبی بحر اقیانوس میں نیو فائیڈ لینڈ کے 170 میل مشرق میں کینیڈا کی سمندری حدود میں تعمیر کیا گیا تھا۔ 15 فروری 1982ء کو یہ آئل پلیٹ فارم ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والے طوفان میں پھنس گیا۔ ادھر طوفانی لہروں نے اس پلیٹ فارم کے اوپری عرشہ تک کو پانی میں چھپا لیا جس کے بعد یہ رگ RI6 ایک پہلو پر جھکنا شروع ہوگیا۔ ایک دو گھنٹہ کے بعد اندھیرے میں یہ پلیٹ فارم سمندر میں غرقاب ہوگیا اور اس کے ساتھ اس پر کام کرنے والے 84 افراد بھی سمندر میں لاپتہ ہوگئے۔ تمام امدادی کاروائیاں لاحاصل رہیں۔ اس آئل رگ کا وزن 16500 ٹن تھا اور اس وقت یہ ایک دنیا کا بڑا خود کار سمندر میں کام کرنے والا ڈرلنگ یونٹ تھا۔ اسے 1976ء میں سمندر میں اتارا گیا تھا اور یہ اپنے پہلے تین سالوں میں الاسکا کے ساحل کے قریب بحیرہ بیرنگ Bering sea میں تیل نکالتا رہا تھا۔ پھر اسے نیو جرسی کے ساحل کے قریب سمندر میں منتقل کر دیا گیا تھا جہاں یہ ایک سال تک کام کرتا رہا۔ جہاں سے اسے آئرلینڈ منتقل کر دیا گیا۔ پھر 1980ء میں اسے نیو فاؤنڈ لینڈ کے قریب نسبتاً کم گہرے سمندر گرینڈ بینک، کینیڈا منتقل کر دیا گیا۔

اوشین رینجر اپنے عملے 84 ارکان کے ساتھ سمندر کی تہہ میں 250 فٹ کی گہرائی سے تیل نکالتا تھا۔ اس کے عملے کے ارکان میں سے 69 افراد کینیڈا سے تعلق رکھتے تھے۔ بحر اوقیانوس کے اس حصے میں تیل کی بہت بڑی ذخائر موجود ہے مگر اس علاقے کے طوفانی موسم کی وجہ سے یہاں سے تیل نکالنا ایک دشوار گذار کام ہے۔ اس سمندر میں آئل پلیٹ فارم کے سطح سمندر میں تیرتے رہنے کے لیے دو دو سہارا دینے والی چپٹے پینڈے کی کشتیاں Pontoous تھیں جو سمندری موجوں کے نیچے رہ کر تیرتی رہتی تھیں ان کشتیوں میں سے ہر ایک 400 فٹ لمبی اور 60 فٹ کشادہ تھی جبکہ ان کی بلندی 20 فٹ تھی۔ ان کشتیوں میں آئل رگ پر روز مرہ کام آنیوالا سامان اور اوزار اور مختلف قسم کے واٹر ٹینک اور فیول ٹینک رکھے گئے تھے۔ ان کشتیوں سے آئل رگ کے زیریں و بالائی عرشے تک 8 آب کسا Watertight نلکی نما سلنڈر چلے گئے تھے جن میں سے کچھ کا قطر 40 فٹ اور کچھ کا 25 فٹ تھا۔ ان میں رگ کے 12 لنگروں کے ڈالنے کے لیے سینکڑوں فٹ طویل لوہے کی زنجیریں رکھی گئیں تھیں۔ جن میں سے ہر ایک کا وزن 23 ٹن

تھا۔ انہیں سلنڈروں میں سے ایک کے اوپر پانی کی سطح کے قریب کنٹرول روم واقع تھا جسے رگ کا دماغ کہا جاتا تھا۔ حادثے کی رات رگ کے اسی حصے کو نقصان پہنچا تھا۔

رگ کا بالائی عرشہ سمندر کی سطح سے 70 فٹ بلند اور 200x100 تھا جبکہ اس کی بلندی 380 فٹ تھی۔ اس کے نیچے زیریں عرشہ تھا جس پر آئل ڈرلنگ کے آلات نصب تھے آئل رگ کے تمام معاملات کو کنٹرول روم سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔

اس رگ پر کام کرنیوالے افراد کو معاوضے پر بھرتی کیا جاتا تھا مگر انہیں ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کی کشتی رانی کی کوئی تربیت نہیں دی جاتی تھی۔ طوفان میں گھر جانے کی صبح سویرے اس پلیٹ فارم پر موجود ہر شخص اس اعلان کے ساتھ بیدار ہوگیا تھا جس میں لائف جیکٹ پہننے اور گرم کپڑوں میں ملبوس رہنے کی ہدایات دیں گئی تھیں۔ اس کے علاوہ لائف بوٹ اسٹیشن پر فوری پہنچنے کی ہدایات بھی دیں گئیں تھیں ہر 65 افراد کو تیار ہو کر لائف بوٹ اسٹیشن پر پہنچنے میں دو گھنٹے لگے۔ دوسرے ٹائی ٹینک کی طرح یہاں صرف 55 افراد کے لیے لائف بوٹ میں جگہ تھی۔

پھر 14 فروری 1982ء کی شام کو ایک شدید سمندری طوفان نے اوشین رینجر کو گھیر لیا ہوا کی رفتار 100 میل فی گھنٹہ تھی اس لیے احتیاطاً زیرین عرشے پر آئل ڈرلنگ پائیپ نکالے گئے۔ طوفانی موجیں 40 فٹ بلند تھیں۔ ان حالات میں سطح سمندر سے ڈرلنگ پائپ علیحدہ کرنے کے ساتھ ہی اوشین رینجر طوفانی ہوا کے خلاف مزاحمت نہ کرسکا اور بری طرح ڈولنے لگا۔ ایک طوفانی لہر نے کنٹرول روم کی دیوار سے ٹکرا کر اس میں سوراخ کر دیا جس سے پانی کنٹرول روم میں داخل ہونے لگا۔ تاہم اس کے تین گھنٹے بعد ریڈیو آپریٹر نے ساحل پر اطلاع بھیجی کہ اس سوراخ کی مرمت کرلی گئی ہے اور اب کنٹرول روم میں پانی بھی نہیں کھڑا ہے۔ مگر کنٹرول روم میں پانی کے داخل ہو جانے کی وجہ سے اس کی برقی تنصیبات کو پہلے ہی نقصان پہنچ چکا تھا جس کی وجہ کنٹرول روم میں بجلی فیل ہوگئی جس کے بعد سہارا دینے والی کشتیوں پر کنٹرول کرنا مشکل ہوگیا پھر جب آدھی رات تک اس آئل پلیٹ فارم پر حالات مزید خراب ہوگئے تو آس پاس موجود امدادی جہاز کو طلب کیا گیا مگر طوفان نے اس جہاز کو بھی آئل رگ کے آس پاس نہیں رہنے دیا تھا پھر جب اوشین رینجر سمندر میں دس درجہ جھک گیا تو اس پر ہنگامی حالت نافذ کر دی گئی۔ ایک گھنٹے بعد جب امدادی جہاز اس کے مقام پر پہنچا تو ہر چیز غرقاب ہو چکی تھی۔

1984-86ء.....جھیل نیوس کا اسرار

دنیا کا سب سے عجیب وغریب معماتی سانحہ افریقہ کے ملک کیمرون کے ایک مغربی پہاڑی سلسلے میں واقع ایک خوبصورت جھیل نیوس Nyos میں رونما ہوا تھا یہ جھیل سرسبز پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک خاموش آتش فشاں کے دہانے میں واقع تھی اور ایک میل کشادہ اور 600 فٹ گہری تھی اس جھیل کی تہ میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اس کے نیچے واقع آتش فشاں چٹانوں سے نکلتی رہتی تھی اور اس طرح یہ دنیا کی گہری جھیل تھی جس کی تہہ سے یہ گیس خارج ہوتی تھی۔ جبکہ گیس کے اخراج والی دوسری جھیل مونون Monoun ہے جو اس سے صرف 60 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس علاقے میں 34 مقامی افراد اچانک پر اسرار طور پر مردہ پائے گئے۔ (1984ء) ان کے متعلق افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ یہ کیمیائی ہتھیاروں کے ٹیسٹ کئے جانے کی وجہ سے ہلاک ہوگئے ہیں یا پھر انہیں دہشت گردوں نے قتل کر دیا ہے۔ پھر 21 اگست 1986ء کی شب نو بجے جھیل نیوس کے قریب سے ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ اس وقت بہت سے مقامی باشندے اپنے بستروں میں محوخواب تھے۔ جو لوگ بیدار تھے وہ اس شور کو آسمانی بجلی کی گرج سمجھے۔ مگر ان میں سے کوئی نہ سمجھ سکا کہ یہ کیا ہے۔ پھر بہت کم وقت میں 1700 مقامی باشندے ہلاک ہوگئے اور اس علاقے میں بہت کم لوگ یہ بتانے کے لیے زندہ بچے کہ وہاں آخر کیا ہوا تھا؟ تاہم زندہ بچنے والے ایک آدمی نے بتایا کہ اس نے دھماکے اور گرج سے ملتی جلتی آواز سنی تھی اور پھر جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ باہر صحن میں بندھی ہوئی تمام گائیں ہلاک ہو چکی ہیں اور زمین پر گری پڑی ہیں۔ پھر جب وہ واپس گھر کے اندر آیا تو اس نے اپنی بیوی اور ایک بیٹی کو بھی مردہ پایا ایک اور زندہ بچنے والے شخص کے مطابق اس نے ایک سفید بادل دیکھا تھا جو کسی سفید کپڑے کی طرح سفید تھا۔ یہ بادل اوپر فضا میں بلند نہیں ہوا بلکہ نیچے زمین پر پھیل گیا۔ ایک زندہ بچ جانے والی عورت نے بتایا کہ اس نے خود کو کسی طرح مردہ لوگوں کے درمیان بیٹھا ہوا پایا تھا۔ کچھ لوگ گھر کے اندر مردہ پائے گئے اور کچھ گھروں کے باہر۔ اس کے علاوہ ہر طرف مویشی اور دیگر جاندار ہر طرف مرے پڑے تھے۔ کہیں گائیں مردہ پڑیں تھیں تو کہیں کتے اور دیگر جاندار۔ اس عورت کا خاندان 56 افراد پر مشتمل تھا ان میں سے تقریباً 53 افراد اس لمحاتی موت کا شکار ہوگئے۔ تھے۔ فرانسس فینگ ان

کاشتکاروں میں سے ایک تھا جو اس علاقے کی زرخیز زمینوں سے متاثر ہو کر یہاں رہنے لگے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کی بیوی نے خون کی قے کی اور وہ مردہ ہوگئی۔ اس کے بچے سانس میں جلن کی شکایت کر رہے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو ہسپتال لے گیا راستے میں شاہراہوں پر ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اسے بہت سی لاشوں پر سے گذر کر ہسپتال جانا پڑا۔

جھیل کے کناروں پر واقع تین گاؤں اس واقعے سے متاثر ہوئے۔ ان میں رہنے والے 1800 افراد میں سے صرف 14 افراد زندہ بچے۔ جھیل نیوس سے 16 میل دور تک کے علاقوں میں اموات ہوئیں۔ ایک سرکاری ملازم جو اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اس علاقے میں پہنچا پہلا شخص تھا جسے اس سانحے کے بارے میں علم ہوا۔ اسے ایک ہرن مردہ حالت میں روڈ پر پڑا ہوا ملا اس نے اسے اپنے خاندان کو تحفہ کے طور پر دینے کے لیے اسے ساتھ اٹھا لیا۔ پھر جب وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو اس پر خوف طاری ہوگیا ہر طرف انسانی لاشے بکھرے پڑے تھے۔ وہ واپس چلا گیا جب اس کی کہانی حکام کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے اس علاقے میں ایک تحقیقات کمیشن بھیجا۔ اس کمیشن نے اس علاقے میں بہت سی لاشیں پڑیں دیکھیں ان میں جو لوگ زندہ تھے وہ خون کی قے کر رہے تھے۔ پھر جلد ہی ایسے مریضوں سے ہسپتال بھر گئے جن کی آنکھیں اور ناک درد کی جلن سے جل رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے ان کے طبی معائنے کے بعد بتایا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے باورچی خانے میں رکھے ہوئے گیس اسٹوو کی گیس پی لی ہو ڈاکٹروں کے اس بیان کے بعد اس علاقے میں کام کرنے والی جماعتوں کو گیس ماسک فراہم کر دیئے گئے اور گیس سے متاثرہ افراد کے لیے آکسیجن گیس کے سلنڈر فراہم کیے گئے تاکہ ان کی زندگیاں بچائی جاسکیں۔ امدادی جماعتوں نے دیکھا کہ جھیل کے کناروں پر بہت سے جاندار مرے پڑے تھے مگر ان کا گوشت نوچنے کے لیے کوئی گدھ بھی موجود نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے میں رہنے والے گدھ بھی اسی موت کا شکار ہو چکے جس کا یہ جاندار ہوئے تھے۔

کچھ مقامی لوگوں نے اس سانحے کی عجیب وغریب توضیح کی تھی وہ یہ کہ تین سال پہلے اس علاقے کے ایک قبائلی سردار نے بستر مرگ پر یہ وصیت کی تھی کہ اس کے بعد اس کے بہترین پالتو مویشی کو جھیل میں ڈبو دیا جائے تاکہ جھیل کی تہہ میں رہنے والی مردہ لوگوں کی روحوں کو سکون میسر آسکے۔ لیکن اس کے عزیز و اقارب نے اس کی وصیت پر عمل نہیں کیا جس کا خوفناک انتقام ان روحوں نے اس علاقے کے لوگوں سے اس طرح لیا تھا۔

جبکہ اس علاقے کے حکام کے مطابق اس جھیل کی تہہ میں موجود آتش فشاں پھٹ پڑا تھا مگر سائنسدانوں کے نزدیک وہ ایک مردہ آتش فشاں تھا۔ تفتیش کرنے والوں کو چشم دید گواہوں نے بتایا کہ

جھیل کا پانی اس سانحہ سے پہلے ہمیشہ صاف و شفاف دیکھا گیا تھا مگر اس سانحہ کے بعد اس کا رنگ سرخی اور بھورا ہوگیا اور تیز ہواؤں کے اخراج سے اس میں موجیں پیدا ہونے لگیں اس کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ اندازہ لگایا گیا کہ اس جھیل کے پانی میں گیس کی بھاری مقدار جذب ہوگئی تھی جو شاید تیز بارش کی وجہ سے ہائینڈ سلائیڈ کی وجہ ایک بڑے حباب میں تبدیل ہوگئی جس کے پھٹنے سے ایک بے رنگ و بو گیس، کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہوئی۔ اس گیس کے اخراج سے جھیل کے پانی میں جوش پیدا ہوگیا جس سے جھیل کی تہہ میں موجود لوہے کی آمیزش والا سرخی مائل بھورا جھیل کی سطح پر آجانے سے جھیل کے پانی کا رنگ بھی بدل گیا۔ دوسری طرف ہوا سے بھاری ہونے کی وجہ سے یہ گیس اس پہاڑ کے دامن میں واقع گاؤں تک پہنچ گئی۔ اس گیس نے اپنے راستے میں آنے والے ہر ذی روح کا دم گھوٹ دیا۔ اس تجزیے سے یہ بات بھی واضح ہوگئی دو سال پہلے جھیل مونون کے علاقے میں جو لوگ جاں بحق ہوئے تھے ان کی ہلاکت کا سبب بھی یہی گیس تھی۔

اس ہلاکت خیز واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے بعد سائنسدانوں نے پیش گوئی کی تھی کہ اس واقع کے بعد بھی جھیل نیوس سے زہریلی گیس کے اخراج سے بڑے پیمانے پر ہلاکتوں کا خطرہ موجود ہے اس خطرہ سے بچنے کے لیے سائنسدانوں نے جھیل کی تہہ میں ایسے پائپ لگانے کی تجویز پیش کی جن سے گیس کو فضا میں چھوٹی چھوٹی مقداروں میں خارج کرکے آئندہ ایسے واقعات سے بچایا جاسکتا ہے 2001ء میں جھیل مونون کی تہہ میں نصب کیا گیا۔ اس کے عبد امریکی سائنسدانوں نے جب ان دونوں جھیلوں کا معائنہ کیا تو بتایا کہ ایسے سنگل پائپ اس جھیل سے نکلنے والی گیس کے اخراج کے لئے ناکافی ہے۔ اس لیے دونوں جھیلوں میں چار چار مزید پائپ نصب کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔

ڈاکٹر تھامس گیس کا شکار ہونے والوں کا طبی معائنہ کیا اور بتایا کہ ان میں سے بہت سے لوگ زندہ بچ گئے تھے اگر یہ گیس ان کے پھیپھڑوں میں چلے جانے کے بعد نہیں بھاگتے۔ ہوا یہ تھا کہ جب زہریلی گیس نے اس شہر کے لوگوں کو گھیرا تو ان میں سے بہت سے جان بچانے کے لیے بھاگنے لگے جس سے ان کا سانس پھول گیا اور زہریلی گیس پھیپھڑوں میں پوری طرح سرایت کر گئی۔ اگر یہ لوگ آرام سے چلتے ہوئے جائے حادثہ سے دور چلے جاتے تو ان کے پھیپھڑوں میں اس گیس کی کم مقدار جاتی جس سے ان کے بچ جانے کے امکانات روشن رہتے تھے جب مقامی ہسپتالوں نے گیس کا شکار ہو کر مسموم ہونے والے مریضوں کے علاج کے لیے یونین کاربائیڈ کے ڈاکٹروں سے رابطہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ میتھائل آئسوسیانیت گیس دراصل آنسو گیس کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے اور اس کا علاج بھی صرف مریضوں پر پانی چھڑک کر کیا جاسکتا ہے، مگر پانی چھڑکنا بھی بے سود ثابت ہوا اور شرح اموات تیزی سے بڑھنے لگی۔ بھوپال کے کارخانے کو فوری طور پر بند کر دیا گیا اور بھارت میں پیش آنے والے حالات سے نمٹنے کے لیے امریکہ سے یونین کاربائیڈ کمپنی کا چیف ایگزیکٹو واران اینڈرسن ہندوستان پہنچ گیا مگر ہندوستانی حکومت نے اسے گرفتار کرلیا اور پھر ضمانت پر رہا کر دیا۔ جس کے بعد وہ امریکہ لوٹ گیا۔

بعد ازاں 10 مئی 1988ء کو بھوپال میں رونما ہونے والے اس کیمیائی حادثے کی وجوہات پر مشتمل ایک رپورٹ پیش کی گئی تھی جس میں گیس کے لیک ہو جانے میں کارخانے کے ایک ناراض ملازم کا ہاتھ بتایا گیا تھا۔ تاہم اس عذر کو عدالتوں نے قبول نہیں کیا کیونکہ یونین کاربائیڈ نے خود کو بچانے کے لیے اس حادثہ کا الزام اپنے ملازم کے سر تھوپ دیا تھا اور کبھی اس ملازم کو گرفتار کروانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

5 سال کی مقدمہ بازی کے بعد یونین کاربائیڈ ہندوستان کی حکومت کو 47 کروڑ ڈالر کا ہرجانہ ادا کرنے پر رضامندی ہوگئی جس کے بعد 5500 متاثرین میں 850 ڈالر فی کس کے حساب سے ادا کئے گئے اس ادائیگی کے بعد یونین کاربائیڈ تمام فوجداری الزامات سے مبرا ہوگئی تاہم متاثرین نے اس ڈیل کو بھی عدالتوں میں چیلنج کر دیا جس پر عدالت نے فوجداری کے مقدمات بحال کر دیئے۔ ہندوستانی حکومت نے اینڈرسن پر قتل کا مقدمہ دائر کر دیا مگر وہ روپوش ہوگیا۔

1985ء..... سب سے زیادہ شرح اموات والا فضائی حادثہ

فضائی حادثات کی تاریخ میں کسی سنگل ہوائی جہاز کو پیش آنے والے حادثے میں سب سے زیادہ شرح اموات رکھنے والا خوفناک حادثہ 12 اگست 1985ء کی شام کو جاپان کی سرزمین پر پیش آیا تھا۔ اس حادثے میں 520 افراد جاں بحق ہوگئے تھے۔ اس دن ٹوکیو کا ہینیڈا ایرپورٹ تین روزہ بدھست تہوار کے آغاز کی وجہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ 6:12 منٹ پر جاپان ایر لائنز کے ایک جمبو جیٹ 747 نے اوساکا جانے کے لیے ٹیک آف کیا۔ یہ اس کی ایک گھنٹے کی پرواز تھی۔ اس جہاز پر 509 مسافر اور عملے کے 15 ارکان سوار تھے۔ بہت سے مسافر خاندانوں کے ساتھ ان کے بچے بھی تھے۔ جب یہ طیارہ 24000 فٹ کی بلندی پر پہنچا تو ٹوکیو ایر ٹریفک کنٹرول کو اس طیارے سے ایک پیغام ملا جس میں جہاز کے کپتان نے واپس ٹوکیو لوٹنے کی اجازت طلب کی تھی۔ کپتان نے اپنے پیغام میں واپسی کی وجہ یہ بتائی تھی کہ جہاز پر اس کا کنٹرول نہیں رہا تھا اور اس طیارے کے آلات صحیح طور پر کام نہیں کر رہے تھے۔ جبکہ ایر ٹریفک کنٹرول کے ریڈار کی اسکرین پر یہ طیارہ غلط سمت میں سفر کر رہا تھا۔ پھر اس نے بلندی کم کرتے ہوئے ایک پورا موڑ کاٹا اور اس کی رفتار خطرناک حد تک کم ہوگئی۔

حقیقت یہ تھی کہ اس طیارے کے ٹیک آف کرنے کے صرف 12 منٹ بعد فضا میں بلند ہوتے ہوئے اس طیارے کے عقبی حصے میں ایک بڑا زوردار دھماکہ ہوا تھا جس سے عقبی حصے کی چھت اڑ گئی تھی جس کے بعد جہاز کے کیبن میں سفید رنگ کی دھند پھیل گئی تھی۔ پھر جیسے ہی کیبن میں موجود آکسیجن باہر نکلی آکسیجن ماسک آٹو میٹک طور پر مسافروں کی نشستوں پر لٹک گئے اور مسافر ان کی مدد سے سانس لینے لگے جو لوگ امراض دل میں مبتلا تھے وہ بیچارے فوراً چل بسے اس پرواز کو کنٹرول کرنے والے بیشتر آلات کام کرنا چھوڑ گئے طیارے کے ہائیڈرولک سسٹم کی لائنیں منقطع ہوگئیں تھیں جہاز کے لڑکھڑانے کی وجہ سے جہاز کا ایک دروازہ بھی اکھڑ کر گر گیا تھا۔ جہاز کا کیپٹن مسامی ٹیک ہاما masami takhama نے ان حالات میں جہاز کی رفتار کو کم کیا اور وہ 10 ہزار فٹ کی بلندی پر آ گیا۔ تاکہ نقصان زدہ عقبی حصے پر زور نہ پڑے۔ دھماکہ کے 23 منٹ بعد جب ٹوکیو ٹاور نے کپتان سے پوچھا کہ کیا اب وہ طیارے پر کنٹرول کر پا رہا ہے؟ تو کپتان نے جواب دیا کہ طیارہ پر کنٹرول نہیں ہو پا رہا اور سامنے پہاڑ آ گئے ہیں

ہن کو ہموار کرنا لازمی ہے۔ اس کے صرف 9 منٹ بعد یہ جہاز ریڈار کی اسکرین سے غائب ہوگیا۔ دھماکے کے آدھا گھنٹہ بعد تک کپتان اس ٹوٹے پھوٹے طیارے کو فضا میں بلند رکھنے میں کامیاب رہا تھا مگر آخر کار یہ طیارہ ایک 5 ہزار فٹ بلند چٹان سے ٹکرا گیا جو ٹوکیو سے صرف 70 میل کے فاصلے پر کواوستا کے قریب میں واقع تھی۔ چٹان سے ٹکرا کر یہ جہاز شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ایک جاپانی فوجی ہیلی کاپٹر نے اسے کرش ہوتے ہوئے دیکھا مگر حد نظر اتنی کم تھی کہ ہیلی کاپٹر کو لینڈ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تاہم ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ کچھ مسافروں کے زندہ بچ جانے کے امکانات موجود ہیں۔ تاہم اگلی صبح نو بجے آگ بجھانے والا عملہ اس وقت تک سلگتے ہوئے جہاز کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوسکا۔ جبکہ ملٹری کے پیرا ٹروپس ہیلی کاپٹروں سے رسیوں کے ذریعے لٹک کر جائے حادثہ تک پہنچے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ جہاز اس چٹان کو عبور کر چکا تھا کہ مگر اس کا عقبی حصہ اس چٹان پر کھڑے ہوئے درختوں سے الجھ گیا جس سے ایک انجن طیارے سے الگ ہو کر گر پڑا جس کے بعد یہ طیارے تباہ ہوگیا۔

ناقابل یقین طور پر امدادی کارکنوں کو جہاز پر سوار 524 افراد میں سے صرف چار افراد زندہ ملے جو شدید طور پر زخمی تھے جبکہ اس جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہونے والے 520 افراد میں جاپان کا ایک مشہور گلوکار بھی شامل تھا۔

جائے حادثہ سے جو سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز ملی وہ کچھ مسافروں کے اپنے عزیزوں کے نام آخری لمحات میں لکھے ہوئے خط تھے ایک شپنگ کمپنی کے مالک نے جو اس جہاز پر سوار تھا لکھا تھا کہ اگر وہ زندہ بچ گیا تو پھر کبھی ہوائی جہاز پر سوار نہیں ہوگا۔ اپنے بچوں کو محنت سے کام کرنے کی تلقین کے بعد اس نے اپنے بچوں کو ان کی والدہ کا خیال رکھنے کی وصیت بھی کی تھی۔ اس حادثے کے بعد پہلے پہل تفتیش کرنے والوں کا خیال تھا کہ شاید 747 جمبو جیٹ کے بنانے میں کوئی سقم رہ گیا تھا جو اس حادثے کا باعث بنا مگر جلد ہی پتا چلا کہ اس طیارے کی دم اور ایک رڈر Rudder گم تھے جو بعد ازاں سمندر سے ملے۔ یہی اس حادثے کا اصل سبب تھا۔

1985ء..... فضائی دہشت گردی جو 331 کی جان لے گئی

سکھ دہشت گرد (یا علیحدگی پسند) جو کینیڈا منتقل ہوگئے تھے وہاں کینیڈا کی شہریت رکھتے تھے۔ انہیں ہندوستان کی حکومت کے 1984ء میں کیے گئے گولڈن ٹیمپل میں فوجی ایکشن کے خلاف ہندوستانی حکومت پر بڑا غم وغصہ تھا کہ سکھوں کے مقدس ترین مقام کے تقدس کو پامال کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ کینیڈا میں رہنے والے ان سکھوں نے انتقامی کاروائی کرتے ہوئے 23 جون 1885ء کو وینکور کینیڈا سے بمبئی جانے والی ایر انڈیا کی فلائٹ 182 میں بم نصب کر دیا یہ کینیڈا میں فضائی دہشت گردی کی پہلی واردات تھی۔ اس فضائی دہشت گردی کی واردات میں ایر انڈیا کا مسافر بردار بوئنگ طیارہ تباہ ہونے سے پانچ اقوام عالم سے تعلق رکھنے والے اس طیارے کے 331 معصوم مسافر بمعہ عملے کے ارکان ہلاک ہوگئے تھے۔ اس سارے معاملے کا جو سب سے بدترین پہلو تھا وہ یہ تھا کہ کینیڈا کی سکیورٹی سروسز بہت کمزور تھیں انہیں کی وجہ سے دہشت گردی کی یہ واردات کامیاب ہوئی تھی۔ کینیڈا کی حکومت کی طرف سے سکیورٹی سروسز کو انتباہ دیئے جانے کے باوجود وہ ان سکھوں کے خلاف کوئی ایکشن نہ لے سکی تھیں جنہوں نے وینکور میں واقع ہندوستانی دفاتر میں کی دہشت گردی کی تھی۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے فضائی دہشت گردی کے خلاف گواہی دینے والے دو گواہوں کو بھی قتل کر دیا اور مزید گواہوں کو جان کی دھمکیاں دے کر خاموش کر دیا۔

تاہم اس فضائی دہشت گردی نے کینیڈا کی حکومت کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ دہشت گردی کی وارداتوں کو کہیں بھی مزید وقوع پذیر نہیں ہونے دیا جائے گا۔ حکومت نے سکیورٹی سروسز کو بھی الرٹ کر دیا کہ آئندہ کینیڈا میں کوئی ایسی واردات کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ 1985ء میں بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی نیویارک کے دورے پر آنے والے تھے۔ جرمنی سے ایک سکھ نے عام ٹیلی فون پر وینکور کے دہشت گردی میں ملوث سکھوں کو پیغام دیا کہ وہ نیویارک جائیں اور بھارتی وزیراعظم کو قتل کر دیں۔ کینیڈا کی سکیورٹی سروسز نے یہ ٹیلی فون کال مانیٹر کی تاہم وہ ایک ماہ تک نیویارک کے حکام کو اس کی اطلاع نہ بھجوا سکے آخر کار راجیو گاندھی کی آمد سے صرف دو دن پہلے کینیڈا سکیورٹی سروسز نے نیویارک والوں کو وارننگ بھجوا دی مگر جرمنی سے کال کرنے والے یا سننے والے کے خلاف کوئی

اقدام نہیں کیا گیا۔

اسی طرح بھارتی حکومت نے کینیڈین حکام کو متنبہ کیا تا کہ کینیڈا کی سکھ آبادی سے بھارتی ایئر لائن کو خطرہ ہے مگر بھارتی حکومت کے اس انتباہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی 22 جون کو ایئر انڈیا فلائٹ 182 جمبو جیٹ 747، 329 مسافروں کے ساتھ ٹورنٹو سے بمبئی جارہا تھا۔ اس پر 12 سکھ مسافر بھی سوار تھے اور اس جہاز کا نائب کپتان بھی ایک سکھ تھا۔ ٹورنٹو سے روانگی کے وقت ایرپورٹ پر مسافروں کے سامان کو کمپین Scan کرنے والے آلات خراب تھے اس لیے مسافروں کا سامان دستی طور پر چیک کیا گیا۔ روانگی سے پہلے ایک سکھ مسافر کا سامان بھی طیارے پر پہنچ گیا اور اس نے بورڈنگ کارڈ بھی حاصل کرلیا مگر اس کے بعد وہ غائب ہوگیا اور جہاز پر اس کی سیٹ خالی ہی رہی۔

اسی دن کینیڈین پیسفک ایر لائنز کے ایک جہاز پر جو وینکور سے ٹوکیو جارہا تھا۔ ٹوکیو پہنچنے پر جب اس طیارے سے مسافروں کا سامان اتارا جارہا تھا تو ایک سوٹ کیس میں رکھا ہوا بم پھٹ گیا تھا جس سے دو قلی ہلاک اور 5 زخمی ہوگئے تھے۔ جاپانی پولیس کو اس سوٹ کیس پر ایک ایسے شخص کی انگلیوں کے نشانات ملے جو امریکی ادارے ایف بی آئی کو وزیراعظم راجیو گاندھی کے قتل کرنے کی سازش میں مطلوب تھا بعد ازاں اس فلائٹ پر بمبئی جانے والے دو سکھ مسافر بھی غائب ہوگئے تھے فلائٹ 182 اتوار 23 جون کی صبح آئر لینڈ کے قریب بحر اوقیانوس پر 31000 فٹ کی بلندی پر محو پرواز تھی۔ مسافروں نے گذشتہ رات مکمل طور پر آرام دہ اور پرسکون گذاری تھی اور ان کا کینیڈا سے براعظم یورپ تک کا یہ سفر انتہائی خوشگوار تھا۔ کچھ ہی دیر میں یہ جہاز لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر لینڈ کرنے والا تھا اور اس نے آئر لینڈ کے ایرٹریفک کنٹرول سے بھی رابطہ کیا ابھی یہ جہاز آئر لینڈ کے ساحل کے قریب پہنچا ہی تھا کہ جہاز میں دوران پرواز ایک زور دار دھماکہ ہوا اور جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہوکر سمندر میں گر پڑا اس پر سوار مسافر اور عملے کے ارکان جاں بحق ہوگئے۔

کئی دنوں کی تلاش کے باوجود 331 افراد میں سے صرف 131 کی لاشیں سمندر سے نکالی جاسکیں۔ بہت تلاش کے بعد 6000 فٹ کی گہرائی سے اس جہاز کا بلیک باکس ملا لیکن حادثہ کی وجہ معلوم نہ ہوسکی۔ سمندر سے جہاز کا ایک بڑا تختہ بھی ملا جس پر دھماکہ کی وجہ سے 13 سوراخ ہوگئے تھے۔ حادثہ سے پہلے کپتان کو کوئی دھمکی بھی نہیں ملی تھی۔ تاہم بہت سے لوگوں کی رائے یہی تھی کہ یہ سکھوں کی دربار صاحب امرتسر میں کی جانے والی کاروائی کے خلاف انتقامی کاروائی ہے۔

1986ء..... خلائی شٹل، چیلنجر کی تباہی

28 جنوری کو دوپہر سے ذرا پہلے کینیڈی اسپیس سنٹر واقع کیپ کینورل سے خلائی شٹل چیلنجر
سے فضا میں بلند ہوئی اس خلائی شٹل پر سات افراد سوار تھے جن میں سے پانچ باقاعدہ تربیت یافتہ خلا باز
تھے اور دو سویلین تھے۔ صرف ایک منٹ سے بھی کم عرصے تک پرواز کے بعد یہ خلائی شٹل شعلوں میں گھر
گئی۔ چیلنجر پر دھماکہ صرف 73 سیکنڈ کی پرواز کے بعد ہوا۔ زمین پر سے لی جانے والی تصویروں سے پتہ
چلتا ہے کہ دھماکے کے بعد بھی خلا بازوں نے ہر ممکن طریقے سے شٹل کو بچانے کی کوشش کی مگر وہ ناکام
رہے انہوں نے اسے بوسٹر راکٹ سے علیحدہ بھی کرلیا مگر اس کے باوجود یہ دس منٹ کی فری فال کے بعد
سمندر میں گر گئی۔ اگر اس پر سوار افراد دھماکے کے بعد زندہ بھی بچ گئے تھے تو سطح سمندر سے شٹل کے
ٹکرانے کے فوراً بعد ہلاک ہوگئے۔ چیلنجر پر ہونے والے اس دھماکے کی وجہ یا امریکہ کے خلائی ادارے
ناسا کے مطابق چیلنجر میں ہونے والے اس دھماکے کا سبب دائیں طرف کے سولڈ بوسٹر راکٹ میں اورنگ
Oring کی خرابی تھی جبکہ سرد موسم کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوئی تھی۔

جو خلا باز اور سویلین چیلنجر پر سوار تھے ان کے نام یہ تھے۔ (۱) مائیکل اسمتھ (۲) ڈاک اسکوبی
(۳) جوڈتھ ایسنک (۴) رونالڈ سیکنائر (۵) ایلین او میزویکا (۶) گریگوری جاوس، (۷) اور اسکول ٹیچر
کرسٹا میکالف

ان خلابازوں کی باقیات کو جو پہچان لی گئیں وہ ان کے عزیزوں کے حوالے کردی گئیں جبکہ نہ پہچانی
جانے والی باقیات کو امریکہ کے قومی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔

28 جنوری کو چیلنجر کی پرواز کے وقت فلوریڈا کے ساحل پر درجہ حرارت 29 درجہ فارن ہائیٹ تھا جو
خلائی شٹل کی پرواز کے لیے موزوں نہیں تھا۔ ایسے ہی موسم کی وجہ سے ایک دوسری خلائی شٹل ڈسکوری کی
پرواز ملتوی کر دی گئی تھی۔ سرد موسم میں سولڈ راکٹ بوسٹر کے اورنگ کام نہیں کرتے اس خطرے کے پیش
نظر پہلے چیلنجر کی پرواز کو ملتوی کرنے کا پروگرام تھا مگر پروجیکٹ منیجروں نے انجینئروں کے اس عذر کو تسلیم
نہیں کیا اور پروگرام کے مطابق 28 جنوری کو 11 بج کر 30 منٹ پر چیلنجر کو خلا کی طرف روانہ کر دیا گیا
اس طرح اس غلط فیصلے کی وجہ سے سات انسانوں کی جانوں کا زیاں ہوگیا اور کئی ارب ڈالر کی مالیت کا

مالی نقصان بھی چیلنجر کی تباہی کی صورت میں برداشت کرنا پڑا۔ اس حادثے کے بعد ناسا کا اسپیس شٹل پروگرام دو سال تک معطل رہا۔ آئندہ کے لیے یہ طے کیا گیا کہ شیڈول کے مطابق پرواز کو خلا میں بھیج کر زائد خرچ سے بچنے کی بجائے پرواز کی سلامتی کو ترجیح دی جائے گی۔

چیلنجر کی پرواز سے امریکی عوام کو دلچسپی اس وجہ سے بھی تھی کہ اس میں پہلی مرتبہ ایک عام شہری اسکول ٹیچر کرسٹا میکالف کو خلا میں بھیجا جا رہا تھا۔ کرسٹا نے خلا سے اپنے طلبا کو ٹیچ کرنا تھا۔ اس لیے امریکی قوم اس نئے پروگرام میں دلچسپی لے رہی تھی مگر ایسا نہ ہو سکا اور بے چاری کرسٹا ناسا کے منیجروں کے غلط فیصلے کی نذر ہو گئی۔

چیلنجر کی تباہی کو دنیا کے سو بڑے حادثات میں سے ایک تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر یہ مشن مکمل ہو جاتا تو انسان کو ایک نئی جہت میں کامیابی حاصل ہو جاتی مگر سردی کی وجہ سے راکٹ میں نصب اورنگ راکٹ کے آتش گیر مادوں کو آگ پکڑنے سے نہ روک سکے جس نتیجے میں دھماکہ ہوا اور چیلنجر حادثے کا شکار ہو گئی۔

چیلنجر کی تباہی کے متعلق ایک اور معمہ یہ تھا کہ آیا کیا دھماکے کے بعد خلا باز زندہ تھے؟ ماہرین کے مطابق اس سوال کا جواب اثبات میں دیا گیا کہ دھماکہ کے بعد خلا باز نہ صرف زندہ تھے بلکہ ہوش و حواس میں بھی تھے۔ اس حادثے کی تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ دھماکے کے بعد تین ایمرجنسی پیکس کو کھولا گیا تھا جس سے ثابت ہوا کہ خلا باز دھماکے کے بعد تک زندہ تھے اور کام کر سکنے کی حالت میں تھے۔ ان کی موت خلائی شٹل کے 207 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پانی کی سطح سے ٹکرانے کے بعد واقع ہوئی تھی یہ بات بھی یقینی ہے کہ وہ کچھ لمحوں کے لیے شاید بے ہوش بھی ہوئے تھے مگر سمندر کی سطح سے ٹکرانے کے بعد ہی ایسا ہوا تھا۔

1986ء..... چرنوبائیل، یوکرین کا نیوکلیئر حادثہ

26 اپریل 1986ء کو ایک نیوکلیئر پاور اسٹیشن واقع چرنوبائیل، یوکرین، (سوویت یونین) میں دنیا کا بدترین ایٹمی حادثہ رونما ہوا۔ یہ سانحہ اس وقت رونما ہوا جب اس پاور اسٹیشن پر معمول کے مطابق مرمت کا کام کیا جارہا تھا۔ چرنوبائیل پاور پلانٹ میں اس وقت کی ایٹمی طاقت سوویت یونین میں تیار کردہ ایٹمی ری ایکٹر R.B.M.100 سے بجلی پیدا کی جاتی تھی۔ اس ایٹمی ری ایکٹر میں اندرونی فیوزن سیل کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کی بجائے گریفائٹ کے بلاک استعمال کیے جاتے تھے۔ اس ساخت کے ری ایکٹر دنیا میں متروک ہو چکے تھے اور روس کے سوا دنیا کے کسی اور ملک میں استعمال نہیں کیے جارہے تھے۔ روس نے یہ ری ایکٹر دو وجوہات کی بنا پر تیار کیا تھا اس سے بجلی بھی پیدا کی جاتی تھی اور یہ جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے لیے اعلیٰ درجے کی پلوٹونیم بھی فراہم کرتا تھا 1970ء کی دہائی میں امریکہ اور روس میں ہونے والی سرد جنگ کے دوران روس کا عزم تھا کہ وہ امریکہ سے زیادہ جوہری ہتھیار کرکے یہ جنگ جیت لے گا۔ پلوٹینیم کی مستقل فراہمی کی وجہ سے روس اپنے جوہری ہتھیاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ کررہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے شہری علاقوں کے لیے بڑی مقدار میں بجلی بھی اسی ری ایکٹر سے فراہم کرتا تھا۔

ماہرین کے مطابق R.B.M کا ڈیزائن انتہائی خطرناک تھا اور اس ڈیزائن میں آپریٹروں کی طرف سے کی جانے والی غلطیوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت مفقود تھی۔ امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں جوایٹمی ری ایکٹر بجلی پیدا کرنے کے لئے مستعمل تھے ان میں گریفائٹ کے بجائے ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی استعمال کیا جاتا تھا اگر کسی وجہ سے پانی کی فراہمی بند ہو جاتی تو ایٹمی پلانٹ بھی آٹو میٹک طور پر کام کرنا چھوڑ دیتا تھا اور اس وجہ سے متوقع ایٹمی حادثات سے بچاؤ کا عمل جاری تھا۔ جب کہ روس کے ساختہ ایٹمی ری ایکٹر میں اگر اس کے فیوزن سیل کو ٹھنڈا کرنے کے لیے گریفائیٹ کے بلاکوں کی فراہمی کسی وجہ سے رک جاتی تو اس میں ایٹمی عمل تیز تر ہو جاتا تھا جو زیادہ حرارت پیدا کرنے کا سبب بنتا اور یقینی طور پر دھماکہ اس کا مقدر بن سکتا تھا۔ ایٹمی صلاحیت رکھنے والے بہت سے ممالک نے سوویت یونین کو اس ساخت کے خطرناک ایٹمی ری ایکٹر متروک کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر سوویت یونین اپنی پلوٹونیم کی

جاری کو بند کرنے کے لیے رضا مند نہیں تھا۔

R.B.M کے ساتھ ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ جدید طرز کے ایٹمی ری ایکٹروں کی تنصیبات میں جو کنکریٹ ڈوم یا اسٹیل ڈوم رکھا جاتا ہے وہ بھی موجود نہیں تھا کہ کنکریٹ کی یہ عمارت حادثے کی صورت میں فضا میں پھیلنے والی تابکاری کو روکتی۔ سوویت یونین نے اس حوالے سے بھی کوئی احتیاطی اقدام نہیں اٹھایا تھا جس کے نتیجے میں جمعہ 26 اپریل 1986ء کے دن ایک بجکر چوبیس منٹ پر چرنوبائیل پاور پلانٹ کا یونٹ نمبر 4 دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ اس کے تین سیکنڈ کے اندر مزید دھماکے ہوئے اور انہوں نے اس عمارت کی چھت کو اڑا دیا۔ اس کے بعد تابکار گیسیں اور دوسرے تابکار مادے فضا میں دو تہائی میل کی بلندی تک بلند ہوتے چلے گئے۔ ری ایکٹر کا فیوزن سیل پھٹنے سے اس میں موجود انتہائی گرم جوہری راڈ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس عمارت سے تقریباً ایک میل دور جا گرے اور انہوں نے اس علاقے میں تابکار آگ بھڑکا دی۔

پاور پلانٹ میں کام کرنے والے دو افراد تو موقع پر ہلاک ہوگئے جبکہ مزید 29 ورکر تابکار کے اثرات سے اگلے دو ہفتے میں ہسپتال میں دم توڑ گئے اور ان کو بچانے کی کوششیں ناکام ہوگئیں اور وہ تابکاری کی وجہ سے انتہائی درجے کی مسمومیت کا شکار ہوگئے۔ اس ایٹمی حادثے کے رونما ہونے کے بعد احتیاطی اقدام کے طور پر ارد گرد کے شہروں سے لاکھوں افراد کو محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا گیا۔ تابکاری سے متاثرہ ہزاروں مویشیوں کو تلف کر دیا گیا۔ دوسری طرف یوکرین سے برآمد کیے جانے والے اناج کو آس پاس کے یورپی ملکوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یورپی ممالک نے اپنے شہریوں کو ہدایت کی کہ وہ تابکاری کے اثرات سے بچنے کے لیے مقامی سبزیوں کو بھی انتہائی احتیاط سے استعمال کریں۔ ادھر چرنوبائیل کے ایٹمی حادثے کے بعد فضا میں پھیلنے والی تابکاری کے اثرات کو امریکہ تک میں ریکارڈ کیا گیا۔

سوویت یونین نے ہر چیز کو راز میں رکھنے والی حکمت عملی پر عمل پیرا رہتے ہوئے دو دن تک اس حادثے کے متعلق کوئی خبر نشر نہیں کی۔ 28 اپریل کو نزدیکی ملک سویڈن کے محکمہ موسمیات نے جب اپنے ملک کی فضاؤں میں تابکاری کو بڑھتے ہوئے ریکارڈ کیا تو سویڈن کے سائنسدانوں نے اس کا سبب معلوم کیا تو پتا چلا کہ یہ تابکاری چرنوبائیل (سوویت یونین) کے مقام سے پھیل رہی ہے۔ ادھر سوویت یونین کے پاس اس ایٹمی حادثے سے نمٹنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی اس لیے بالآخر اسے مغربی ممالک سے اس مسئلے کو نمٹانے کے لیے مدد طلب کرنا پڑی۔

چرنوبائیل کے ایٹمی ری ایکٹر کو 'سارے کوفیگس' کا نام دی جانے والی ایک عمارت میں بہ ہزار

دشواری ایک کنکریٹ کے ڈھانچے میں بند کر کے مزید تابکاری پھیلنے کو کم کیا گیا۔ اس کنکریٹ کے
یا انکلوژر کو چھ ہزار ورکروں کی مدد سے تعمیر کیا گیا مگر یہ عمارت بھی انتہائی بودی ثابت ہوئی اور چند سال
کے بعد اس سے تابکاری خارج ہونے لگی تو اس کو مضبوط بنانے کے لیے اقدامات کیے گئے مگر اس کے
باوجود خدشات باقی رہے۔

چرنوبائیل میں جدید تاریخ عالم کا سب سے بدترین ایٹمی حادثہ رونما ہوا تھا۔ ادھر خود امریکہ میں بھی
تین میل نامی جزیرے پر ایک ایٹمی حادثے رونما ہو چکا تھا۔ ان حادثوں کے بعد دنیا میں رائے عامہ
نیوکلیئر پاور پلانٹس کی تعمیر کے خلاف ہوگئی اور بہت سے ممالک میں ایسے پلانٹ کو چلانے کے لیے سخت
ترین قوانین نافذ کر دیئے گئے۔

ادھر چرنوبائیل کے ایٹمی حادثے کی وجہ سے 1990ء سے 1998ء تک اس پلانٹ کے اردگرد
کے علاقوں میں جو بچے پیدا ہوئے وہ تھائی راڈ کے کینسر میں مبتلا تھے۔ تھائی راڈ کینسر کے کم از کم 1791
کیس ان علاقوں میں سامنے آنے کے بعد اس بیماری کا سبب چرنوبائیل کے ایٹمی حادثے کو قرار دیا گیا۔
روسی حکومت نے اگرچہ 3 لاکھ پینتیس ہزار لوگوں کو اس پلانٹ کے اردگرد کے علاقوں سے نکال کر محفوظ
مقامات پر منتقل کر دیا تھا مگر تابکاری کے اثرات پھر بھی ظاہر ہو کر رہے اور بہت سے معصوم بچے اس کی زد
میں آ گئے۔

1988ء..... آرمینیا میں آنے والا ہولناک زلزلہ

7 دسمبر 1988ء کو میگا نیوٹ 6.9 Magnitude درجے کا ایک ہولناک زلزلہ آرمینیا کے 40 فی صد علاقوں میں آیا۔ آرمینیا ان دنوں سوویت یونین (روس) میں شامل ایک سوویت تھا۔ اس ملک کی آبادی 2 کروڑ 20 لاکھ افراد پر مشتمل تھی جس میں سے 55 ہزار افراد اس زلزلے میں جاں بحق ہو گئے۔ ان دنوں آرمینیا اپنے ہمسائے آذر بائیجان کے ساتھ ایک جنگ میں ملوث تھا۔ اس زلزلے میں آرمینیا کے چار شہر اور قصبے اور 58 کے قریب گاؤں تباہ ہو گئے۔ ان شہروں میں تقریباً 70 فی صد عمارات زمین بوس ہو گئیں جس کے بعد 10 لاکھ سے زائد افراد بے گھر ہو گئے۔

اس زلزلے میں بچے بڑوں کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں جاں بحق ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ زلزلہ اسکول ٹائم میں آیا تھا اور آرمینیائی بچوں کی بڑی تعداد اسکولوں میں موجود تھی۔ ان اسکولوں کی عمارتیں گرنے سے سب سے زیادہ نقصان بچوں کو پہنچا۔ صرف ایک اسکول کی عمارت زمین بوس ہونے سے اس میں موجود 302 بچوں میں سے 285 بچے ہلاک ہو گئے تھے۔ یاد رہے کہ اس زلزلے میں کل 380 اسکولوں اور انسٹی ٹیوٹوں کی بلڈنگیں بیٹھ گئیں تھیں۔ زلزلے کے بعد 32000 بچوں کو روس کے مختلف مقامات میں منتقل کر دیا گیا جبکہ زلزلے کی آفت کے بعد 6000 بچے لا پتہ بھی ہو گئے تھے۔

سپٹک spitak 20500 افراد پر مشتمل آبادی کا ایک قصبہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا اور اس کو دوبارہ بھی تعمیر نہ کیا جا سکا۔ اس کی بجائے اس شہر کے ملبے پر ایک نیا شہر تعمیر کیا گیا۔ لینن آکان نامی شہر جس کی آبادی 29000 نفوس پر مشتمل تھی۔ اور سٹیناوان نامی قصبہ اور کیروو کان جو شمالی آرمینیا میں واقع تھا ان سب کو شدید نقصان پہنچا۔

ریکٹر اسکیل پر 6.9 درجے شدت کے اس زلزلے کا مرکز آرمینیا کے لینیا کان کے 25 میل شمال مشرق میں واقع تھا۔ زلزلہ دن کے گیارہ بج کر اکتالیس منٹ پر آیا۔ اس وقت تمام لوگ فیکٹریوں اور کارخانوں میں مصروف کار تھے۔ یہ زلزلہ ایک منٹ سے بھی کم مدت تک جاری رہا۔ اس کے 4 منٹ بعد 5.8 درجے کا دوسرا جھٹکا آیا جس کے بعد زلزلے کے مرکز کے اردگرد تیس میل دائرے میں واقع تمام دو منزلہ عمارات تک گر گئیں۔ اور ان میں موجود افراد زندہ ملبے میں دفن ہو گئے۔ کنکریٹ کے ملبے کے بوجھ

کے نیچے دب کر بہت سے لوگ مر گئے۔ اس زلزلے میں 15 ہزار سے زائد لوگ شدید زخمی ہوگئے۔ المیہ یہ تھا کہ ان زخمیوں کے علاج کے لیے اس ملک میں اینٹی سپیٹک ادویات بھی موجود نہیں تھیں۔ یہ سے خود ساختہ ایٹمی طاقت سوویت یونین کی ترقی کا راز افشا ہوگیا تھا آرمینیا میں موسم سرما بڑا شدید ہے۔ یہ موسم بھی امدادی کاروائیوں میں تاخیر کا سبب تھا۔ اس کے علاوہ اس ملک میں ناقص طور پر تعمیر کردہ عمارات سب سے زیادہ جانی و مالی نقصان کا باعث بنی تھیں۔ کثیر منزلہ عمارات کے انہدام سے بہت سے لوگ ملبے میں دب گئے اور بہت سے لوگ اوپر والی منزلوں کے گرنے کی وجہ ہلاک ہوگئے تھے۔ آرمینیا میں زلزلے کی آمد کے وقت سوویت یونین کے سربراہ میخائیل گورباچوف امریکہ کے دورے پر تھے وہ اپنا دورہ منسوخ کرکے فوراً واپس آئے۔

آرمینیا کا زلزلہ گورباچوف کے متعارف کرائے پروگرام پیراسٹرائیکا کے دوران آیا تھا۔ اس پروگرام کے معنی تھے کہ سوویت نظام کی تشکیل نو۔ اسی وجہ سے آرمینیا میں آنے والے زلزلے کے بعد غیر ملکی امداد کو قبول کرلیا گیا تھا۔

بہت جلد امدادی پارٹیوں نے خیمے لگا کر نئی بستیاں آباد کر دیں مگر اس کے باوجود 5 لاکھ افراد بے گھر تھے۔ اور پورے پورے شہر اور قصبے ملبے کے ڈھیر بن گئے تھے۔ اس زلزلے کے کئی سال بعد تک آرمینیا اس زلزلے کے اثرات سے نکلنے کے لیے کوشاں رہا مگر اس کے باوجود کئی قصبے دوبارہ تعمیر نہ کیے جاسکے۔

آرمینیا ایک بڑی طاقت کا حصہ ہونے کے باوجود ایک غریب ملک تھا اور ایسے ملکوں میں شہریوں کو اکثر بنیادی سہولتیں تک میسر نہیں ہوتیں۔ اس زلزلے کی آمد کے دس سال بعد تک سپیٹک جیسے قصبوں میں ہزاروں شہری جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور دیکھے گئے تھے۔

1989ء.....تیانن مین اسکوائر کا قتل عام

تیانن مین اسکوائر Tiananmen.es کا مطلب چینی زبان میں سماوی امن کا دروازہ بنتا ہے۔ یہ چین کے دارالحکومت، بیجنگ کا دل بھی کہلاتا ہے اور عین بیجنگ کے وسط میں پرانی عمارتوں کے جھرمٹوں میں گھرا ہوا ایک بڑا چوک ہے۔ اس چوک کا چین کی قدیم و جدید تاریخ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ 1949ء میں کمیونسٹ انقلابی حکومت کے قیام کے بعد سے چین کے قومی دن کی سرکاری تقریبات منعقد کرنے اور جلوس وغیرہ نکالنے کا مرکزی مقام رہا ہے۔ 4 جون 1989ء تک اس چوک کو چینی طلبا نے چینی حکام کی بدعنوانیوں اور ان کی شکایات کا ازالہ نہ کرنے والے سرکاری حلقوں کے خلاف احتجاجی مظاہرے کرنے کے لیے بھی احتجاجی مرکز کے طور پر استعمال کیا تھا۔ جب یہ احتجاجی مظاہرے بہت بڑھنے لگے اور شدید تر ہوتے چلے گئے تو آخر کار چینی حکومت نے چینی فوج کو ان مظاہروں سے سختی سے نمٹنے کا حکم دے دیا۔ چینی فوج نے احتجاجی مظاہرین سے باغیوں جیسا سلوک کیا اور ہزاروں کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا اور ہزاروں طلبا 4 جون کو ہونے والے اس فوجی ایکشن میں شدید زخمی ہوگئے۔ تیانن مین اسکوائر اور اس کی ملحقہ سڑکوں پر بے شمار انسانی لاشے اپنے ہی خون میں لت پت بکھرے ہوئے تھے۔ جدید تاریخ کا یہ ایک خونچکاں منظر تھا جب ایک مخبوط الحواس حکومت نے اپنے ہی مستقبل کے معماروں کو خون میں نہلا دیا تھا۔

چین میں جدید زمانے کی اس بے چینی کا آغاز 15 اپریل 1989ء کو اس وقت ہوا تھا جب برسر اقتدار کمیونسٹ پارٹی کے برطرف راہنما ہو یاؤ بنگ کا انتقال ہوا۔ چینی طلبا آنجہانی راہنما کی یاد میں تیانن مین اسکوائر میں معمولی تعداد میں جمع ہوئے۔ ان کی تعداد مورخین کے نزدیک صرف ایک ہزار تھی۔ ان طلبا نے آنجہانی راہنما کو خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ جمہوریت کے قیام کے حق میں نعرہ بازی کی جو چین کی ڈکٹیٹر شپ کو انتہائی گراں گزری مگر اس کے باوجود طلبا کو کچھ نہیں کہا گیا۔ جب یہ طلبا دوسری مرتبہ اس چوک میں جمع ہوئے تو ان کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ پھر جب تیانن مین اسکوائر میں ہو یاؤ بنگ کی یاد میں سرکاری تقریب منعقد ہوئی تو اس تقریب میں تقریباً دو لاکھ طلباء و طالبات نے بھی شرکت کی۔ سرکاری تقریب کے باوجود طلبا نے جمہوریت کا حق میں نعرہ بازی کی اور انسانی حقوق آزادی

کا مطالبہ کیا۔ 4 مئی کے دن ایک بار پھر تیانن مین میں طلبا کی ایک بڑی تعداد جمع ہوئی اور اس نے اپنے مطالبات کے حق میں نعرہ آرائی کی۔ اس کے بعد تو معمول بن گیا کہ طلبا اکثر بڑی تعداد میں یہاں جمع ہوتے اور حکومت کے خلاف نعرے لگاتے اور ڈینگ اور لی پھنگ جیسے برسراقتدار لیڈروں کی مذمت کرتے۔ جمہوریت اور انسانی حقوق آزادی کا مطالبہ کرتے جب مظاہرین کی تعداد حد سے تجاوز کرنے لگی تو بیجنگ میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ ژاؤ زیانگ اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے اور ان کو حکومت نے ان کے گھر پر ہی نظر بند کر دیا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جب فوج چوک کی طرف بڑھی تو عوام نے فوج کے راستے میں رکاوٹیں بھی کھڑی کر دیں مگر دوسری طرف عوام فوج کے حق میں نعرے بھی لگانے لگی عوامی فوج عوام سے پیار کرتی ہے وغیرہ وغیرہ ان نعروں کا فوج پر کافی اثر ہوا اور فوج چوک میں داخل نہیں ہوئی نہ ہی اس نے چوک میں موجود طلبا کے خلاف طاقت استعمال کی۔ لیکن ہائی کمانڈ کو تو کچھ اور ہی منظور تھا اور وہ ہر قیمت پر طلبا کی ان باغیانہ سرگرمیوں کو کچل دینا چاہتی تھی۔

اسی دوران طلبا نے اپنے مطالبات کے حق میں بھوک ہڑتال کر دی۔ شروع میں بھوک ہڑتال کرنیوالے طلبا کی تعداد ایک ہزار تھی پھر یہ دوگنا ہوگئی۔ یہ طلبا چین کی ایک معروف رسم کا احیا کر رہے تھے۔ ماضی میں جب کسی ظالم شہنشاہ کے خلاف احتجاج کیا جاتا تھا تو احتجاجی شہنشاہ کے خلاف لڑنے کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے تھے تاکہ شہنشاہ اپنے مظالم سے ہاتھ کھینچ لے۔ یہی رسم اب جدید زمانے میں چینی طلبا اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ادا کر رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ طلبا کے ساتھ دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد بھی اس احتجاج میں شامل ہوتے چلے گئے۔ مزدور، کسان، ڈاکٹر اور صحافی سب حکومت کے خلاف میدان میں اترتے چلے گئے۔ پھر یہ ہنگامے چین کے دوسرے شہروں اور قصبوں تک پھیلنے لگے تو حکومت کے کان کھڑے ہوئے۔

پھر متضاد خبریں آنے لگیں۔ ایک خبر آئی کہ حکومت کے حکم پر فوج نے عوام اور طلبا پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ پھر یہ خبر آئی کہ طلبا نے تیانن مین اسکوائر خالی کرنا شروع کر دیا اور حکومت کے خلاف متوقع بغاوت کا خطرہ ٹل گیا مگر جب 3 جون 1989ء کی صبح کا سورج تیانن مین چوک پر طلوع ہوا تو منظر کچھ اور ہی تھا فوج ہر طرف مورچہ بندی کر چکی تھی اور بیجنگ میں ہر طرف خوف و ہراس پھیل گیا پھر اس دن دوپہر دو بجے چشم فلک نے ایک عجیب منظر دیکھا عوامی فوج نے عوام کی آنکھوں میں آنسو گیس جھونک دی تاکہ عوام کو تیانن مین اسکوائر کی طرف نہ بڑھنے دیا جائے۔ پھر فوج نے متشددانہ کارروائی شروع کر دی اور کمر سے بیلٹیں نکال کر عوام پر کوڑوں کی مانند برسائی جانے لگیں۔ لوگ وقتی طور پر تو اس کارروائی سے منتشر ہوگئے مگر جلد ہی پھر چوک میں ڈٹ گئے۔

۴ جون کی صبح دو بجے فوجیوں سے بھرے ہوئے بے شمار ٹرک تیانن مین کی طرف بڑھنے لگے اور ہر سمت سے فوجیوں نے اس چوک کو گھیرے میں لے لیا کہ اس چوک میں وہ سرخ کھیل حکومت کے اصرار کے باوجود ختم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں گریٹ عوامی ہال اور دوسرے اہم مقامات پر پوزیشنیں سنبھال لیں جیسے وہ کسی دشمن پر حملہ کرنے والے تھے۔ ہزاروں طلبان کی پلکیں نیند سے بوجھل تھیں ابھی سنبھل نہ پائے تھے کہ ظالم فوج نے ان نہتے طلبا پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ہر طرف خون میں نہائے ہوئے طلبا میں بھگدڑ مچ گئی بے چارے ان حالات میں مزید لوگوں کو تاڑنے لگے۔ فوج ہر سمت میں AK-47 رائفلوں سے گولیوں کا مینہ برسا رہی تھی جس سے نوجوان طلباء و طالبات کے لاشے تڑپتے ہوئے سماوی امن کے چوک میں گر کر ظالم حکمرانوں کا منہ چڑا رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے فوج کو اس ظالمانہ کاروائی سے باز رکھنے کی کوشش کی تو ان پر ٹینک چڑھا دیئے گئے۔ آپریشن کلین اب پوری رفتار سے جاری تھا۔ 3 گھنٹے تک مسلسل موت کا یہ کھیل کھیلا جاتا رہا۔ صبح 5 بجے تک یہ چوک زندہ انسانوں سے تو خالی ہو چکا تھا مگر ہر طرف کشتوں کے پشتے لگ چکے تھے اور انسانی لاشوں اور فوجی ہیلمٹوں کے سوا چوک میں اب کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ اس خونی آپریشن کے بعد اگرچہ چینی حکومت اپنے خلاف ہونے والے احتجاجی مظاہرے دبانے میں کامیاب ہوگئی مگر جمہوریت کے ان ان گنت شہیدوں کا خون بھی ضائع نہیں گیا اور آخر آزادی کی صبح طلوع ہو کر رہی۔

1989ء..... الاسکا کے ساحل کی تیل سے آلودگی

24 مارچ 1989ء کو سہ پہر 12:04 منٹ پر آئل ٹینکر بحری جہاز ایکسن والڈیز exxon valdez پرنس ولیم ساؤنڈ الاسکا میں ایک چھوٹے سے جزیرے پر خشکی پر چڑھ گیا اس وقت اس بحری آئل ٹینکر 53094510 گیلن خام تیل لدا ہوا تھا جو الاسکا کی سرزمین سے ہی نکالا گیا تھا۔ خشکی پر چڑھ جانے کے بعد اس جہاز سے لیک ہو جانے کی وجہ سے تقریباً 257000 بیرل تیل سمندر میں بہ گیا۔ یہ تیل کی بڑی مقدار تھی کہ اس سے اولمپک کھیلوں کے لیے بنائے جانے والے پیراکی کے 25 تالاب بھر سکتے تھے۔ ایکسن والڈیز سے تیل کا یہ اخراج امریکی تاریخ کا تیل کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ اور ماہرین کے مطابق اگرچہ یہ تیل کے اخراج کا چونتیسواں عالمی حادثہ تھا مگر اسے ماحولیات کو آلودہ کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا حادثہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ پرنس ولیم ساؤنڈ، الاسکا کے ساحل کا تقریباً 1300 میل کا طویل علاقہ اس تیل کے اخراج سے آلودہ ہوگیا۔ 200 مربع میل رقبے کو اس تیل نے بری طرح آلودہ کر دیا جس میں بحری حیاتیات کو شدید نقصان پہنچا۔ اور اس علاقے کے حیاتیاتی فطری نظام کو اس آلودگی نے تباہ کر ڈالا۔

تیل کے سمندری پانی میں مل جانے کی وجہ سے پرنس ولیم ساؤنڈ کے علاقے میں رہنے والی 36 قاتل وہیل مچھلیوں Killer whals میں سے تقریباً 13 مچھلیاں اس آلودگی سے مر گئیں۔ یہ اتنی بڑی تعداد تھی کہ اگلے دس سال میں مچھلیوں کے اس گروہ کی تعداد اتنی نہ ہوسکی جو اس حادثے سے پہلے تھی۔ سمندر میں آلودگی پھیلنے کے بعد وہیل مچھلیوں کی پیدائش کی شرح اتنی کم ہوگئی کہ اتنے طویل عرصے میں صرف تین وہیل مچھلیوں نے جنم لیا۔ سب سے بڑی دکھ کی بات یہ تھی کہ بہت سی وہیل مچھلیاں اپنے بچوں سمیت یہ علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں منتقل ہوگئیں۔ قاتل وہیل مچھلیوں میں ہجرت کرنے کا رجحان اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

ایکسن والڈیز سے بہنے والا 2 کروڑ گیلن سے زائد تیل سمندری پانی میں مل گیا جبکہ 216000 گیلن تیل ساحلوں کو آلودہ کرنے کا سبب بنا۔ مگر یہ اس تیل کی پوری مقدار نہیں تھی جو اس بحری جہاز سے بہہ گیا تھا۔ ماہرین کے نزدیک باقی ماندہ تیل یا تو پٹرولیم کی اڑ جانے کی خصوصیت کی وجہ سے ہوا میں اڑ گیا یا پھر موسم سرما کے شدید سمندری طوفانوں اور بارشوں اور سمندری لہروں کی نذر ہوگیا۔ اس تیل کے اخراج سے سمندری حیاتیات پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے وہ اگلے دس سال تک محسوس کیے جاتے رہے

ایکسن والڈیز کو یہ حادثہ کس وجہ سے پیش آیا تھا اس کی تفتیش کی گئی تو پتہ چلا کہ الاسکا کے ساحل سے تیل لے کر روانہ ہونے کے بعد جہاز کا کپتان، جوزف ہیزل وڈ اپنے دو نائبین کو ہدایات دے کر خود اپنے کیبن میں آرام کرنے چلا گیا۔ یہ دونوں نائبین کپتان کی ہدایات کے مطابق ایک مقام پر درست طریقے سے موڑ کاٹنے میں ناکام رہے جس کی وجہ سے یہ جہاز خشکی پر چڑھ گیا جہاز کے کپتان پر یہ الزام بھی تھا کہ حادثے کے دن وہ شراب کے نشے میں بری طرح مدہوش تھا مگر کپتان کے خون کے تجزیئے سے یہ الزام غلط ثابت ہوا تاہم کپتان پر تیل کے اخراج سے اور اپنے فرض سے کوتاہی برتنے کی ذمہ داری عائد کی گئی جس کی پاداش میں اس کو 50 ہزار ڈالر کا جرمانہ ادا کرنا پڑا اس کے علاوہ الاسکا کی سرزمین پر ایک ہزار گھنٹے تک فلاحی کام کرنے کی سزا بھی اسے دی گئی۔

ایکسن والڈیز کے خلاف ریاست الاسکا کی حکومت اور خود جمہوریہ امریکہ کی وفاقی حکومت نے کافی پیچیدہ اور سنگین مقدمات قائم کئے جن سے نمٹنے میں اسے دو سال کا عرصہ لگا۔ کہیں جا کر اکتوبر 1991ء میں ایک امریکی عدالت نے تیل کمپنی اور جہازراں کمپنی اور امریکی حکومت کے درمیان ایک معاہدہ کرایا جو تین حصوں پر مشتمل تھا۔ اس معاہدہ یا عدالتی فیصلے کی رو سے ایکسن کو 15 کروڑ ڈالر جرمانہ کیا گیا جس میں آدھا بعد ازاں اس کمپنی کی سمندر سے آلودگی صاف کروانے کی کارکردگی کے پیش نظر معاف کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایکسن کمپنی نے وفاقی حکومت کو تیل کے اخراج سے زمین اور بحری حیاتیات کو پہنچنے والے نقصان کے ہرجانے کے طور پر 10 کروڑ ڈالر علیحدہ ادا کرنے پڑے۔

اسی معاہدے کی تیسری شق کے مطابق ایکسن کمپنی نے منظور کیا کہ وہ الاسکا کی ریاستی حکومت کو بھی آئندہ دس سال میں 90 کروڑ ڈالر جرمانہ ادا کرے گی۔

اتنے بڑے جرمانے ایکسن کے خلاف اس لئے عائد نہیں کئے گئے تھے کہ ایکسن والڈیز سے بہنے والے تیل کی مقدار بہت زیادہ تھی تاہم اس سے پہنچنے والے نقصانات دیگر ایسے حادثوں میں پہنچنے والے نقصانات سے بہت شدید تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ تیل دنیا کے ایک انتہائی خوبصورت خطے کو آلودہ کر گیا تھا اگر یہ تیل دنیا کے کسی اور سمندر یا خطے میں بہا ہوتا تو شاید اتنے شدید حیاتیاتی نقصانات کا سبب نہ بنتا۔ مگر جب الاسکا میں پرنس ولیم ساؤنڈ کا علاقہ اس سیاہ تیل سے آلودہ ہوا تو دنیا کو شدید دھچکا پہنچا اسی طرح دنیا کو ان تصاویر اور مناظر نے بہت متاثر کیا جن میں بے بس جنگلی جانوروں کو بری طرح اس تیل میں لت پت دکھایا گیا تھا۔ خود تیل بھی ایک قیمتی ذریعہ توانائی ہے اس قیمتی سیال کے زیاں سے بھی شدید مالی نقصانات پہنچے تھے۔ ماہرین نے اس حادثے کی وجہ سے ہونے والے مالی نقصانات کا اندازہ 3.03 سے 8.03 ارب ڈالر لگایا تھا۔ جو ایک نا قابل تلافی نقصان تھا۔

1990ء.....حج کے موقع پر بھگدڑ مچنے کی وجہ سے ہلاکتیں

حج اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار حج کرنا فرض ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک حج کا سفر کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا اور اکثر حجاج اپنے اعزاء و اقربا کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلتے تھے۔ پھر حج کے سفر میں سہولتیں پیدا ہوتیں گئیں جس کے بعد مکہ معظمہ میں حاجیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ 2 جولائی 1990 کو مناسک حج کی ادائیگی کے تقریباً 40 لاکھ افراد جمع تھے۔ ان میں سے تقریباً 50 ہزار حاجی ایک پیدل سفر کرنے والوں کی 500 گز طویل سرنگ میں پھنس گئے جو منیٰ میں حاجیوں کے شہر خیام تک جاتی تھی۔ اس دن مکہ میں درجہ حرارت 44 سنٹی گریڈ تھا اور گرمی ناقابل برداشت ہو چلی تھی۔ اوپر سے حجاج کرام تعداد کی زیادتی کی وجہ سے ایک دوسرے کو دھکیلتے چل رہے تھے جس کی وجہ سے کئی ایک گر پڑے۔ ادھر اس سرنگ میں صرف پانچ ہزار افراد کی گنجائش تھی مگر دس گنا زائد افراد اس سرنگ میں موجود تھے۔ ان حالات میں جب سرنگ کا ایرکنڈیشننگ سسٹم اچانک خراب ہوگیا جس کی وجہ سے حبس دم کا شکار ہوکر حجاج کرام کا دم گھٹنے لگا۔ اس پریشانی سے بچنے کے لیے حجاج کرام سرنگ سے باہر نکلنے کے لیے بھاگ اٹھے۔ ان میں کچھ جب واپس جانے کے لیے مڑے تو ان حجاج سے ٹکرا گئے جو ابھی آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ایک زندہ بچنے والے حاجی نے بتایا کہ مجھے دھکا لگا تو میں 110 حاجیوں کی نیچے پڑی ہوئی لاشوں پر گرا تو دونوں سمتوں میں بھاگنے والے حجاج مجھے بھی لتاڑنے لگے۔ جب امدادی کارکنوں نے ٹھنڈے پانی کے تھیلے سرنگ میں پھینکے تو لوگ سرنگ کے اندر پھنسے ہوئے اور زخمی افراد کی چیخ و پکار کے باوجود ان تھیلیوں کو سرنگ میں انڈیلنے لگے۔

اگلے دن سعودی عرب کے وزیر داخلہ نے بیان دیا کہ سرنگ میں بھگدڑ مچ جانے کی وجہ سے 1426 حجاج کرام شہید ہوگئے جبکہ اس سرکاری اعداد و شمار سے حاجیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ وزیر داخلہ نے بتایا کہ سرنگ میں ایک دو افراد کے گرنے سے خوف و ہراس پیدا ہوگیا اسی خوف و ہراس کی کیفیت میں جان بچانے کے لیے بھاگتے ہوئے حجاج کرام کے بڑے بڑے جمگھٹے ایک دوسرے پر چڑھ گئے اور پھر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے سعودی عرب کے شاہ فہد نے اس حادثہ کو خدا کی رضا اور اس حادثے میں مرنے

والے حجاج کرام کو شہید قرار دیا اور کہا کہ سب سے بڑی چیز ان لوگوں کا مقدر تھا جو ان کو ملنا تھا۔ جو لوگ یہاں جاں بحق ہوگئے اگر وہ اسی لمحے کہیں اور بھی ہوتے تو ان کو موت آنا ہی تھی۔ تاہم چونکہ حجاج کرام سعودی عرب کے بنائے ہوئے سیفٹی رولز کو اپنانے میں ناکام رہے تھے لہٰذا اس حادثے کی ذمہ داری کوئی شخص بھی سعودی عرب پر نہیں ڈال سکتا۔ دوسری طرف ایران جو سعودی عرب کا روائتی حریف ملک تھا اور مقامات مقدسہ کو سعودی عرب کے کنٹرول سے نکالنا چاہتا تھا اس نے اس حادثے کا الزام سعودی عرب پر لگایا۔ کچھ دن کے بعد ایرانی وزیر خارجہ اور ایرانی صدر علی اکبر رفسنجانی نے اس حادثہ کو ایک تلخ ترین واقعہ قرار دیا اور کہا کہ اس واقعہ کے رونما ہونے کی وجہ سے سعودی عرب تمام عالم اسلام کے سامنے جوابدہ ہے۔

1990ء کے بعد بھی وقتاً فوقتاً حج کے موقع پر سانحے وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً 1994ء میں ایک اور بھگدڑ مچ جانے سے 270 حاجی شہید ہوگئے تھے۔ جبکہ 1997ء میں منیٰ میں لگے ہوئے خیموں میں لگنے والی آگ سے 343 حجاج شہید ہوگئے تھے۔ اس کے سات سال بعد پھر ایک بھگدڑ میں 244 افراد شہید ہوگئے یہ واقعہ شیطان کو کنکریں مارنے کے مناسک کی ادائیگی کے دوران پیش آیا تھا۔ 2000 میں بھی اسی مناسک حج کی ادائیگی کے دوران بھگدڑ مچ جانے کی وجہ سے 345 حجاج کرام شہید ہوگئے تھے۔ حج کی تاریخ میں 2015ء ایسا سال تھا جب حجاج کرام کو دہرے حادثات کا سامنا کرنا پڑا اور بہت سے حجاج شہید ہوگئے۔ دیکھئے 2015ء

1991ء..... اور خلیج فارس تیل کا جہنم زار بن گیا

2 اگست 1990ء کو عراقی فوج کے دستوں نے کویت پر اس کے تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کر دیا ساتھ ہی عراق کویت کو اپنا صوبہ قرار دینا چاہتا تھا۔ اقوام متحدہ نے فی الفور عراق کے اس اقدام کی مذمت کی اور پھر جب اس بحران کو حل کرنے میں سفارتی کوششیں ناکام ہوگئیں تو اقوام متحدہ کے رکن ممالک کا ایک فوجی اتحاد قائم کیا گیا تاکہ کویت کو عراق سے بذریعہ طاقت چھڑوا کر آزاد کرایا جائے۔ اس فوجی اتحاد نے جنوری 1991ء سے عراق پر فضائی حملوں کا آغاز کر دیا اور بعد ازاں اس کی بری افواج کویت میں داخل ہوگئیں اور ایک مختصر بری جنگ کے بعد فروری 1991ء کے آخر تک کویت میں موجود عراقی فوجی یونٹوں کو مکمل طور پر شکست دیدی گئی۔ اس مختصر جنگ میں بہت سے عراقی فوجی مارے گئے مورخین نے ان کی تعداد 100000 کے لگ بھگ بتائی ہے۔ جبکہ اتحادی افواج کے فوجیوں کی ہلاکتیں صرف دو سے تین سو کے قریب بتائی گئیں تھیں۔

اگرچہ عراق کی اس عسکری شکست کے ساتھ یہ کہانی اختتام کو پہنچ گئی تھی مگر اپنی اس شکست کا بدلہ چکانے کے لیے عراق نے ماحولیاتی دہشت گردی کا سہارا لیا۔ اس نے تیل کی ایک بڑی مقدار خلیج کے پانیوں میں چھوڑ دی جس سے خلیج میں موجود مختلف انواع زندگی کو شدید نقصان پہنچا۔ تقریباً اسی دوران عراق نے کویت کے سینکڑوں تیل کے کنوؤں میں آگ لگا دی جس سے اس پورے علاقے میں پٹرولیم کے کثیف سیاہ دھوئیں کا ایک گہرا بادل چھا گیا تیل کے کنوؤں میں لگنے والی اس آگ نے کویت کو ایک بڑے سیاہ کمبل کی شکل دیدی جس میں ہر طرف وقتاً فوقتاً آگ کے شعلے بھڑکتے نظر آتے تھے۔ عراق کے یہ دونوں اقدامات اس علاقے کی ماحولیات کو آلودہ بلکہ تباہ کرنے کی سازش اور دہری دہشت گردی تھی جس کا موازنہ چرنوبائیل کے ایٹمی حادثے میں ماحولیات کو پہنچنے والے نقصانات سے کیا جاسکتا تھا اور یہ تاریخ عالم میں تیل کے اخراج کے حادثہ سے زیادہ نقصان دہ اثرات کا حامل تھا۔

دھوئیں کا کثیف بادل ہر وقت چھائے رہنے سے اس علاقے میں رہنے والے انسانوں اور دیگر خاندانوں کو سانس لینے میں دشواری پیش آنے لگی۔ ہر طرف ایک ناگوار بو کی چبھن پھیلی ہوئی تھی جو انسانوں اور جانداروں کے پھیپھڑوں کو نقصان پہنچا رہی تھی۔ اردگرد زمین پر ہر طرف تیل کے جوہڑ بنے

ہوئے تھے جو وقتاً فوقتاً آگ پکڑ لیتے اور دھواں دینے لگتے تھے درخت، عمارات گاڑیاں اور جو کچھ بھی سطح زمین پر موجود تھا سب کچھ کویت سے اٹا ہوا تھا۔ پوری دنیا سے تیل کے کنوؤں کی آگ بجھانے والے ماہرین بلوا لئے گئے تھے۔ مگر آگ بجھانے کا عمل اتنا دشوار تھا کہ انہوں نے پہلے پہل اس آگ کو بجھانے کے لیے جو مدت تجویز کی تھی وہ پانچ سال تھی۔ انہیں بہت سے انتظامی مسائل کا سامنا تھا۔ دھواں ہر سمت میں پھیلنے کی وجہ سے ایر پورٹ بند پڑے ہوئے تھے جس کی وجہ سے آگ بجھانے کا سامان اور افراد کو کویت لے آنا دشوار کن کام تھا اس لئے اس کام میں کافی وقت لگا۔

عراقیوں نے کویت پر اپنے مختصر قبضہ کے دوران کویت میں رسل و رسائل کے ہر ذریعے کو نقصان پہنچادیا تھا۔ ایک تیل کنویں سے دوسرے کنویں تک پہنچنے کے اب نئی سڑکیں تعمیر کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ کویت کی شاہراہوں پر فوجیوں نے دفاعی خندقیں کھود ڈالیں۔ تھیں عراقی فوج نے کویت سے نکلتے ہوئے ہر طرف گولہ بارود کے ذخیرے اور خراب گاڑیاں چھوڑ دیں تھیں جو آگ بجھانے کا سامان لائے اور لے جانے میں رکاوٹ بنیں ہوئیں تھیں۔ ہر طرف بارودی سرنگیں بچھی ہوئیں تھیں اور ان کا صاف کیا جانا بھی رسل و رسائل کے لیے ضروری تھا۔ اس کے علاوہ فوجیوں کی کھودی ہوئیں خندقیں پاٹنا بھی آگ بجھانے والوں کے لیے سردرد بن گیا تھا۔ خندقیں پاٹنے اور بارودی سرنگوں کو ناکارہ بنانے کے لیے انہیں ریت کے ڈھیروں سے کام لینا پڑا تھا۔

عراقیوں نے اس بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائی تھی کہ ہر ممکن طریقہ اس تباہی سے بچنے کے لیے آزمایا جارہا تھا۔ دنیا میں جو تیل روزانہ استعمال ہوتا تھا اس کا 15 فی صد روزانہ جل کر ضائع ہو رہا تھا۔ اس ضائع ہونے والے تیل کی مقدار کا اندازہ ماہرین نے 3 کروڑ بیرل روزانہ لگایا تھا۔ یہ تیل کی اتنی مقدار تھی جو امریکہ میں پٹرولیم کی طاقت سے چلنے والی گاڑیوں میں روزانہ استعمال ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ دوماہ تک جاری رہا جب دو ماہ بعد پہلے کنوؤں کی آگ بجھائی گئی تو نقصان کا سلسلہ کچھ کم ہوا۔ دو ماہ تک کویت سے تیل برآمد کرنے والے یورپی ممالک اپنے ذخیرہ کئے ہوئے تیل کو استعمال کرتے رہے عراق کی اس ماحولیاتی تخریب کاری سے صرف کویت ہی متاثر نہیں ہوا بلکہ آس پاس کے دوسرے خلیجی ممالک بھی تیل کے کنوؤں سے اٹھنے والے اس مضر صحت دھوئیں کا بری طرح شکار ہوئے اور ان ممالک میں بھی بہت سے لوگ اس سیاہ کثیف دھوئیں کی وجہ سے مختلف بیماریوں کا شکار ہوئے۔

کویت کے بہت سے کنوؤں میں تیل زیر زمین پریشر سے نکلتا تھا۔ عراقیوں نے جن کنوؤں کو کم نقصان پہنچایا وہاں تو آگ پر قابو جلدی پا لیا گیا مگر جہاں نقصانات شدید تھے۔ وہاں کافی جدوجہد کرنا پڑی اور کافی لوگ بھی آگ بجھانے کے عمل میں اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اس ماحولیاتی تباہی کا

دوسرا پہلو خلیج کے پانیوں میں عراق کا تیل چھوڑ دینا تھا۔ اس سے جو سمندر میں آلودگی پیدا ہوئی اس سے وہ چھاڑیاں جو سمندری دلدلوں پر اگی ہوئیں تھیں اور مونگا اور مرجان کی زیر آب چٹانوں میں رہنے والے بحری جاندار ہلاک ہوگئے۔ خلیجی سمندر میں کچھوؤں کی جو نسلیں پائی جاتیں ہیں وہ بھی تباہ ہوگئیں۔ اس آلودگی سے مرنے والے آبی پرندوں کی تعداد 30000 سے تجاوز کر گئی۔ خلیجی ساحلوں کے ساتھ ساتھ ماہی گیری ایک بڑی صنعت کی حیثیت رکھتی۔ سمندری پانی میں تیل کی آلودگی پھیلنے کے بعد اس صنعت سے وابستہ ہزاروں لوگ بے کار ہوگئے اور خلیج کے پانیوں سے ملنے والے جھینگے اور مچھلیاں عنقا ہوگئیں۔

الاسکا کے ساحل پر ایکسن والڈیز سے بہنے والے تیل سے 40 گنا تیل عراق نے خلیج میں بہا دیا تھا۔ اس سے پہلے ایران عراق جنگ میں بھی عراقی میزائلوں سے ایران کے دو آئل پلیٹ فارموں سے تیل کی ایک بڑی مقدار خارج ہو کر خلیج کے پانیوں میں بہہ گئی تھی۔ ایک دہائی بعد تیل کا ایک بڑا سیلاب خلیج میں داخل ہوگیا تھا جس میں سے تقریباً 20 لاکھ بیرل تیل سطح سمندر پر پھیل گیا تھا۔ اس سے سعودی عرب کے سمندری پانی کو صاف کرنے کے پلانٹ بھی بہت متاثر ہوئے تھے۔

1992ء.....ہری کین، اینڈریو سے فلوریڈا میں ہونے والی تباہی

ریاست ہائے متحدہ میں بیسویں صدی میں جو ہری کین یا طوفان آئے ان میں سب سے زیادہ تباہ کن ہری کین اینڈریو Hurrican andrew تھا۔ یہ 24 اگست 1992ء کو جنوبی فلوریڈا میں ٹھیک شام پانچ بجے آیا۔ اس طوفان میں ہوا 165 میل سے 175 میل فی گھنٹہ تک تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ اس تیز رفتار ہوا نے بلند و بالا عمارتوں کو یوں زمین بوس کر دیا جیسے وہ کنکریٹ کی بجائے کاغذ سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ہری کین اینڈریو کیٹیگری 4 کا ہری کین تھا۔ اس نے کیلی فورنیا کی جنوبی ڈیل کاؤنٹی اور مزید جنوب میں بڑھتے ہوئے ریاست لوئزیانہ میں بڑے پیمانے پر تباہی مچادی تھی۔

ہری کین اینڈریو فلوریڈا میں 27 سال بعد آنے والا شدید طوفان تھا۔ اس سے پہلے 1965ء میں کیٹیگری 3 کے ایک ہری کین جس کو بیٹسی کا نام دیا گیا تھا، تباہی مچائی تھی۔ اس ہری کین سے 75 افراد ہلاک ہوئے تھے جبکہ ہری کین اینڈریو سے ہونے والی ہلاکتیں امریکہ میں 23 تھیں۔ مزید تین افراد جزائر بہاماس میں ہلاک ہوگئے تھے اس ہری کین سے ہونے والا مالی نقصان تقریباً 30 ارب ڈالر تھا جبکہ دو ارب ڈالر کا نقصان صرف ریاست لویزیانہ میں ہوا تھا۔ سب سے زیادہ نقصان فلوریڈا میں ہواؤں کی تیز رفتاری کی وجہ سے ہوا تھا۔ جنوبی فلوریڈا اپنے موبائل گھروں کے لیے مشہور ہے اس طوفان کے بعد فلوریڈا میں ایک بھی موبائیل گھر باقی نہیں بچا تھا۔ ہری کین اینڈریو ایک ٹراپیکل سمندری لہر کے طور پر اگست میں افریقہ کے مغربی ساحل پر واقع کیپ وردی سے شروع ہوا تھا۔ بحیرہ اوقیانوس کو عبور کر کے یہ ہری کین جب فلوریڈا پہنچا تو اس کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ سوموار 24 اگست کو یہ بوقت شام پورے غیض و غضب کے ساتھ فلوریڈا کے شہر میامی سے ٹکرایا۔ اینڈریو کے ساتھ چلنے والی تیز ہواؤں نے اس شہر کی 90 فی صد عمارتوں کو زمین بوس کر دیا۔ طوفان کے آغاز میں ہواؤں کی رفتار 190 میل فی گھنٹہ تھی۔ جزیرہ نما فلوریڈا کا ایک پتلا سا سرا تین اطراف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔ اکثر بہت سے ہری کین اس علاقے میں پہنچ کر اپنی شدت کھو بیٹھتے ہیں۔ تاہم اینڈریو کی شدت پوری طرح برقرار تھی۔ یہ طوفان اسی رفتار سے صرف چار گھنٹے میں جنوبی فلوریڈا کو عبور کر کے خلیج میکسیکو سے گذرتا ہوا لوئزیانہ جا پہنچا پھر وہاں سے اس نے شمال کا رخ کیا اور دریائے مسسپی اور الباما تک جا پہنچا یہاں اس کی

وجہ سے موسلا دھار بارش برسی۔ یہ ہری کین ریاست جارجیا کے قریب پہنچ کر ختم ہوا تھا۔ اینڈریو دراصل لوئزیانہ تک پہنچنے کے بعد سے ہی کمزور پڑنے لگا تھا۔ دس گھنٹے تک شمالی امریکا کی سیاحت کرنے کے بعد اس کی شدت خاصی کم ہوگئی تھی تاہم کمزور حالت میں بھی یہ 10 انچ بارش برسانے کا سبب بنا۔

جنوبی فلوریڈا میں اسی ہری کین سے سب سے زیادہ نقصان پہنچا تھا ہوم اسٹیڈ ایئربیس پر کھڑے ہوئے F16 اور C130 طیاروں کو اس کی آمد سے پہلے محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ ہوم اسٹیڈ ایئربیس اس طوفان میں گھر کر مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا۔ ایئربیس کی تباہی سے ڈیل کاؤنٹی کی معیشت کو بری طرح نقصان پہنچا۔ پانچ سال بعد یہ ایئربیس دوبارہ تعمیر کیا گیا تو کہیں جا کر یہاں کی معیشت کو سہارا ملا۔

ہری کین اینڈر سے 14 لاکھ مکانوں اور دوکانوں کی بجلی معطل ہوگئی تھی۔ اندھیرا چھا جانے کے سبب یہاں لوٹ مار شروع ہوگئی جس کی روک تھام کے لیے میامی کے کئی اضلاع میں کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ خلیج میں کھڑے ہوئے 100 سے زائد آئل رگ یا تو مکمل طور پر تباہ ہوگئے یا پھر انہیں شدید نقصان پہنچا تھا۔ فلوریڈا کے دیہی علاقوں میں کھڑی فصلیں تباہ ہوگئیں جبکہ لوئزیانہ میں یہ طوفان ڈھائی لاکھ سے زائد افراد کو بجلی سے محروم کرنے کا سبب بنا۔

طوفان گذرنے کے بعد جو مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا وہ عمارتی ملبے کا تھا۔ بے شمار چوہے اور مرطوب موسم کی وجہ بے شمار مچھر بھی طوفان زدگان کو نقصان پہنچانے کے لیے یہاں پرورش پا گئے تھے۔ وبائی امراض پھیلنے کا خوف الگ پھیل گیا تھا۔ تاہم فیڈرل حکومت اور مقامی انتظامیہ کی مشترکہ کوششوں سے جلد از جلد بہت سے ہسپتالوں کو کھول دیا گیا تھا۔ ڈیل کاؤنٹی Dale county جہاں میامی واقع ہے یہاں تقریباً 63 ہزار مکانات تباہ ہوگئے تھے جبکہ مزید 110000 مکانوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ ہری کین اینڈریو امریکہ تاریخ میں 2005ء میں آنے والے ہری کین کیٹرینہ کی آمد سے پہلے سب سے تباہ کن ہری کین تسلیم کیا گیا تھا۔

1991ء.....فلپائن میں ہونے والی بیسویں صدی کی دوسری بڑی آتش فشانی

15 جون 1991ء کو شروع ہو کر اگلے آٹھ گھنٹے تک جاری رہنے والی بیسویں صدی کی دوسری بڑی آتش فشانی، فلپائن کے جزیرہ لوزوں پر کوہ پیناٹیوبو Mount pinatubo پر وقوع پذیر ہوئی۔ یاد رہے بیسویں صدی کی سب سے بڑی آتش فشانی کوہ کتمائی Mount katmani کی الاسکا میں ہونے (1912) والی آتش فشانی تھی۔ کوہ پیناٹیوبو فلپائن کے دار الحکومت منیلا سے صرف 50 میل کی دوری پر واقع ہے۔ اس آتش فشانی سے تقریباً 800 افراد ہلاک اور 100000 کے قریب بے گھر ہوئے تھے۔ اس آتش فشانی سے ہزاروں ٹن سلفر ڈایو اوکسائیڈ فضا میں معلق ہوگئی جس سے پورے کرہ ارض پر اگلے کئی سال کے لیے درجہ حرارت کم ہوگیا تھا۔

جزائر فلپائن کے اہم ترین جزیرہ لوزون کے مغربی ساحل پر آتش فشاں پہاڑوں کا ایک پورا سلسلہ واقع ہے جس میں کوہ پیناٹیوبو سب سے بڑی چوٹی ہے۔ یہ آتش فشاں پہاڑوں کا سلسلہ بھی کوہ ہیلین کی طرح ارضیاتی پرتوں کے متحرک ہونے کی وجہ سے وجود میں آیا تھا۔ جون 1991ء میں رونما ہونے اس آتش فشانی کا آغاز جولائی 1990ء 7.8 درجے کے ایک زلزلہ سے ہوا تھا جو کوہ پیناٹیوبو سے 62 میل دوری پر واقع علاقے میں آیا تھا۔ یہ زلزلہ کوہ پیناٹیوبو کے ایک طویل عرصے کے بعد بیدار ہو جانے کی وجہ سے آیا تھا۔ مارچ 1991ء سے کوہ پیناٹیوبو کے آس پاس کے علاقوں میں اکثر و بیشتر زلزلے محسوس کئے جانے لگے اور آتش فشاں ماہرین نے اس آتش فشاں کا قریبی مطالعہ شروع کر دیا۔ اس آتش فشانی کے شروع ہونے سے پہلے تقریباً 30 ہزار افراد اس پہاڑ کے دامن میں آباد تھے۔ 21 اپریل 1991ء کے بعد اس آتش فشاں کے دہانے میں چھوٹے موٹے دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جن سے آتش فشاں راکھ اڑ کر اس پہاڑ کے دامن میں آباد گاؤں پر گرنے لگی جس کے بعد پہاڑ کے دامن میں آباد گاؤں سے پہلے 5000 افراد محفوظ مقامات پر منتقل کئے گئے۔ 1991ء میں رونما ہونے والی اس تباہ کن آتش فشانی سے پہلے کوہ پیناٹیوبو کوئی معروف پہاڑ نہیں تھا اور یہاں تک کے آس پاس کے لوگ بھی اس کے وجود

سے آگاہ نہیں تھے مگر اس آتش فشانی کے بعد یہ اس جزیرہ کا معروف ترین پہاڑ بن گیا۔ اس پہاڑ کی چوٹی سطح سمندر سے 57.25 فٹ بلند ہے مگر یہ چوٹی اپنے دامن میں واقع میدانوں سے صرف 1800 فٹ بلند ہے۔ جبکہ اس کے قریب واقع دوسری چوٹیوں سے یہ صرف 600 فٹ بلند ہے اسی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ اس علاقے کے کچھ مقامی باشندے صدیوں سے اس پہاڑ کی ڈھلوانوں پر آباد چلے آرہے تھے۔ یہ ہسپانوی نو آبادکاروں کے مظالم سے تنگ آ کر اپنے علاقوں سے بھاگ کر اس پہاڑ کی ڈھلوانوں پر آباد ہوگئے تھے۔ اپریل 1991ء میں شروع ہونے والے دھماکوں کے بعد یہ لوگ بھی پہاڑ سے زیادہ دوری پر واقع گاؤں میں منتقل ہوگئے۔ دھماکے اور زلزلے شروع ہو جانے کے بعد 5 جون 1991ء کو حکومت کی طرف کسی بڑی آتش فشانی کے متوقع ہونے کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا گیا۔ پھر 7 جون کو اس پہاڑ کے دہانے سے لاوا بہنے کے بعد اس علاقے کے لوگوں کو مزید خبردار کر دیا گیا۔ 10 جون کو امریکی ایربیس کلارک کو جو اس پہاڑ کے قریب واقع تھا احتیاطی طور پر خالی کر دیا گیا۔ 12 جون کو جب آتش فشانی کا خطرہ مزید بڑھا تو اس علاقے کے 58000 مکینوں کو یہاں سے نکالنا شروع کر دیا گیا۔

پھر جب 15 جون کو آتش فشانی شروع ہوئی تو بدقسمتی سے اس پہاڑ سے صرف 43 میل دور شمال مشرقی علاقے میں ایک سمندری طوفان آ گیا جو اس علاقے میں شدید بارش کا باعث بنا۔ اس دوران پہاڑ کے دہانے سے نکلنے والی راکھ اس بارش میں مل کر دور دور تک پھیل گئی۔ اس آتش فشانی کی وجہ سے ہلاک ہونے والے 800 افراد میں سے زیادہ تر مکانوں کی چھتوں پر آتش فشاں راکھ گرنے کی وجہ چھت بیٹھنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے تھے۔ اگر اس دن یہ سمندری طوفان نہ آتا تو شاید ہلاکتوں کی شرح بھی کم ہی ہوتی۔

اس پہاڑ کے ماضی میں ہونے والی آتش فشانی تقریباً 500 سال پہلے سولہویں صدی میں رونما ہوئی تھی جس کے بعد یہ آتش فشاں 15 جون 1991ء کو پھٹا تھا اور تقریباً پانچ سو سال تک خوابیدہ رہ کر بیدار ہوا تھا۔

1994ء..... روانڈا میں ہونے والی گردوہی نسل کشی

جب ایک انتہا پسند گروپ نے 6 اپریل 1994ء کو روانڈا میں اقتدار پر قبضہ کر لیا تو اس کے بعد ہوتو قبائل کی اس حکومت نے ایک دوسرے افریقی قبیلے توت سیس Tutsis کو مٹا دینے کے لیے ایک نسل کش مہم شروع کر دی۔ تین مہینے کے مختصر عرصے میں توت سیس قبیلے کے 2 لاکھ افراد قتل کر دیئے گئے۔ اس دوران ہوتو قبیلے کے لوگ نعرہ زنی بھی کرتے رہے اور قومی ریڈیو کی براڈ کاسٹ پر بھی یہ نعرے شریک گئے۔ ''ان سب کو قتل کر دو۔ یا'' آدھی خالی قبروں کو بھرنے میں ہماری کون مدد کرے گا۔

شمالی امریکہ میں اس قبائلی نفرت کو سمجھنا بہت مشکل ہے جس کے تحت افریقہ میں ایک قبیلے کے لوگ دوسرے قبیلے کے وجود

کو صفحہ ہستی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریک براعظم میں آج بھی گروہی حقوق اور گروہی وفاداری سب سے اولین معاملہ ہے۔ افریقہ میں شخصی یا ذاتی حقوق اور وفاداری پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی اور آج قبائلی عصبیت اور رسم و رواج ہی بنیادی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ بیلجیم سے آزادی کے حصول کے بعد کے 30 سالوں میں افریقی ملک روانڈا Rwandai میں قبائلی عصبیت بھی برقرار رہی اور اس ملک کے دونوں بڑے قبیلے گروہی نفرت اور جھگڑے کا شکار رہے۔ 1994ء میں روانڈا کی قبائلی عصبیت کے بدترین واقعات رونما ہوئے۔ یہ براعظم افریقہ کی جدید تاریخ کے انتہائی بربریت انگیز واقعات ہیں۔

نسل کشی Genocide کسی گروہ یا قوم کو جان بوجھ کر مٹانے کی کوشش یا مہم کو کہتے ہیں۔ یہی نام مورخین نے 1994ء میں روانڈا میں کئے جانے والے قتلوں کو دیا ہے۔ تاہم یہ نسل کشی کی یہ کوشش تاریخ عالم میں نئی نہیں۔ صرف بیسویں صدی میں نسل کشی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ کمبوڈیا میں نسل کشی کی مثال پول پاٹ حکومت کی طرف سے کمبوڈیا کے لوگوں کے بڑے پیمانے پر قتل عام کئے جانے میں بھی ملتی ہے۔ مشرقی ترکی میں آرمینیائی نسل کے لوگوں کی نسل کشی کی جانے کی مثال بھی ملتی ہے۔ سابقہ سوویت یونین میں یوکرین کے کسانوں کو اسٹالن نے فاقہ کشی کے ذریعے مرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بیسویں صدی ہی جرمنی میں ہٹلر نے گیس چیمبرز کے ذریعے بڑے پیمانے پر یہودیوں کی نسل کشی بھی کی تھی۔ بوسینیا میں سربوں نے مسلمانوں کی نسل کشی بھی کی تھی۔ روانڈا کے اس مسئلے کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب یہ بلجیم کی

نو آبادی تھا۔ نو آبادی کے منتظمین نے ملک کا نظام چلانے والے ان دو بڑے قبائل میں سے ایک یعنی
توت سیس قبیلے کی پشت پناہی اور حمایت کی تھی۔ توت سیس قبیلے کے لوگ خوبصورت اور دراز قد تھے جبکہ ہوتو
ایک اقلیتی قبیلے کے افراد تھے۔ ان کی بے جا حمایت کیے جانے کی وجہ سے اکثریتی قبیلے ہوتو کے افراد
ناراض ہوگئے تھے۔ بلجیم کی حکومت کی طرف سے ملک میں 1930ء کی دہائی میں جب شناختی کارڈ کا
نظام متعارف کرایا گیا تو شناختی کارڈ میں اس کے حامل کا نام اور قبیلے کا نام بھی درج کیا گیا۔ اس نے
جلتی پر تیل کا کام کیا اور دونوں قبیلوں میں اختلاف اس وقت مزید بڑھ گئے جب ہوتو لوگوں نے اپنے
شناختی اندراج میں خود کو توت سیس لوگوں کے مقابلے میں دوسرے درجے کا شہری پایا۔

یاد رہے کہ یورپی نو آبادیاتی طاقتیں دونسلی گروہوں میں اختلاف کو ہوا دے کر دونوں پر حکومت
کرنے کے معاملے میں بدنام رہی ہیں۔ اسی نظام کو پھوٹ ڈال کر حکومت کرنا بھی کہتے ہیں۔ دو مخالف
گروہ آپس میں لڑنے میں اتنے مصروف رہتے کہ انہیں کبھی تیسرے گھس بیٹھیے یعنی یورپی نو آبادکاروں کو
اپنے ملک سے متحدہ ہو کر نکالنے کا خیال تک آتا ہی نہیں تھا اور یورپی آسانی سے حکومت کرتے رہتے
تھے۔ اس وقت کسی کے خیال میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ جب یورپی طاقتوں کے چنگل سے یہ ملک آزاد
ہو جائے گا تو دونوں مخالف قبائل میں باقاعدہ جنگ و جدل اور قتل و غارت کا سلسلہ چل نکلے گا۔ روانڈا
میں یہ معاملہ انتہائی سنگین صورت اختیار کر گیا 1960ء کی دہائی میں آزادی حاصل کرنے کے بعد جب ہو
تو انتہا پسند اکثریت کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئی تو انہوں نے توت سس قبیلے کے لوگوں کو نہ
صرف غیر ملکی حملہ آور کہنا شروع کر دیا اور انہیں برابر کے شہری حقوق دینے سے بھی انکار کر دیا۔ صرف چھ
ماہ کے اندر حکومتی فوجی دستوں کے ہاتھوں 10 ہزار توت سس لوگ مارے گئے۔ جس کے بعد 350000
کے قریب توت سس لوگ ہمسایہ ممالک کی طرف بھاگ گئے اور انہوں نے یوگنڈا اور برونڈی میں پناہ
لی۔ اگلے بارہ سال تک یوگنڈا اور برونڈی سے توت سس آف مفرور روانڈا پیٹریوٹک فرنٹ نامی تنظیم کے
نام سے ہوتو اکثریت سے خانہ جنگی لڑتے رہے۔ مگر جلد ہی ان کے یہ حملے اس وقت رک گئے جب
انہوں نے دیکھا کہ روانڈا میں رہ جانے والے توت سس قبیلے کے لوگوں کو اس کاروائی کا موردِ الزام ٹھہرا
کر ہوتو قبیلہ قتل کر رہا ہے۔ 1963ء میں 6500 توت سس لوگ روانڈا میں قتل کر دیئے گئے جبکہ بعد
ازاں مزید 10 ہزار لوگوں کا بھی یہی حال ہوا۔ 1979ء میں ہوتو قبیلے کا ایک ایسا گروہ برسرِ اقتدار آیا جو
انتہا پسند نہیں تھا اس لیے توت سس قبیلے کے لوگوں کا قتل عام بند کر دیا گیا۔ اسی دوران یوگنڈا اور برونڈی
سے بہت سے توت سس لوگ واپس اپنے وطن آ گئے تاہم ان سے غیر ملکیوں جیسا سلوک ابھی تک جاری
تھا۔ اگلے 14 سالوں میں RPF اس قابل ہوگئی کہ اس نے حملہ کر کے حکومتی فوج کو دارالحکومت، کیگالی

15 میل باہر دھکیل دیا۔ اس کامیابی کے بعد انتہا پسند ہوتو لیڈر ہیپیاری مانا RPF کے راہنما پال گیگمی
سے امن کا معاہدہ کرنے پر مجبور ہوگیا اور حکومت میں توت سس لوگوں کو شامل کرلیا گیا اقوام متحدہ کی
طرف سے امن قائم رکھنے کے لیے کینیڈا کے فوجی دستے کیگالی میں متعین کر دیئے گئے۔ دونوں قبیلوں
میں معاہدہ امن ''اروشا اکارڈ'' طے پانے کے باوجود ہوتو راہنما جنرل ہیپیاری مانا اور اس کے حکومت میں
موجود دوست توت سس لوگوں کی نسل کشی کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے جاری
کی جانے والی ایک رپورٹ میں ان قتلوں کا حال درج تھا جو ہوتو لوگوں کے ہاتھوں توت سس لوگوں کا
جاری تھا۔ 6 اپریل 1994ء کو جس واقعہ سے توسس لوگوں کی نسل کشی کے منصوبے پر عمل شروع ہوا وہ
جنرل ہیپیاری مانا کے جہاز کا گرایا جانا اور اس کی موت تھی۔ اگرچہ اس بات کی شہادت موجود تھی کہ توت
سس لوگوں کا اس ہوتو جنرل کی موت کے پیچھے کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ مگر جنرل کا جہاز کرش ہونے کے صرف
چند گھنٹے بعد قتل عام شروع ہوگیا حکومت میں موجود معتدل خیال کے لوگوں کو اس مہم میں سب سے پہلے
نشانہ بنایا گیا۔ پھر سرکاری ریڈیو سے اعلانات شروع کر دیئے گئے کہ یہ ہر ہوتو مرد کا مقدس فرض ہے کہ
وہ کسی نہ کسی توت سس فرد کو قتل کرے۔ پھر نعرے شروع ہوگئے ''کسی کو نہ چھوڑو۔ تمام خالی قبروں کو توت
سس لوگوں سے بھر دو وغیرہ وغیرہ۔

1995ء.....کوبے، جاپان میں آنے والا ہولناک زلزلہ

17 جنوری کو صبح سویرے جاپان کے شہر کوبےKobe میں جاپان کی تاریخ کا 1946ء میں آنے والے زلزلے کے بعد دوسرا بڑا زلزلہ آیا۔ یہ جاپان کی تاریخ کا سب سے بدترین زلزلہ تھا۔ اس زلزلے کا مرکز Epicenter کوبے سے 10 میل دور آواجی Awaji کے مقام پر سمندر میں زیرِ آب واقع تھا۔ اس زلزلے سے پہنچنے والا جانی اور مالی نقصان اتنا شدید تھا کہ اس زلزلے کو مورخین نے جاپان کی تاریخ کا سب سے مہنگا زلزلہ قرار دیا ہے۔ یہ زلزلہ ریکٹر اسکیل پر 7.2 درجے کا زلزلہ تھا۔ مگر اتنا شدید تھا کہ صرف 20 سیکنڈ میں اس زلزلے نے نہ صرف 5400 افراد کو ہلاک کر دیا بلکہ 105000 عمارات کو بھی زمین بوس کر دیا اور 26800 افراد شدید طور پر زخمی ہوگئے۔ مالیاتی طور پر 150 ملین امریکی ڈالر کا نقصان پہنچا تھا۔

جب جاپان کے لوگوں نے اس زلزلے سے کوبے میں ہونے والے نقصانات کا اندازہ لگایا تو ہر طرف مایوسی پھیل گئی۔ اتنی قلیل مدت میں اتنا شدید نقصان انسان کو پاگل کر دیتا ہے اور شدید جذباتی اثرات مرتب کرتا ہے۔ اتنی شدید بربادی میں زندہ بچ جانے والے افراد میں شعوری طور پر ایک نئی تہذیبی تبدیلی نے جنم لیا۔

جاپانی زبان میں ایک کہاوت ہے کہ حادثے اجنبیوں کو ساتھ ملا دیتے ہیں۔ کوبے میں آنے والے زلزلے کے بعد بہت سی انسان دوست تنظیموں نے امدادی کاروائیوں میں حصہ لیا۔ امدادی کاروائیوں میں حصہ لینے والا ایک انسان دوست گروپ یاماگوچی گومی ایک جرائم پیشہ گروہ تھا۔

تاریخ جاپان کے اس دوسرے بڑے زلزلے نے صرف سال 1995ء کے مالی سال کی حکومتی آمدنی یعنی ٹیکسیشن 7 ارب ڈالر کم کر دی تھی۔ کوبے جاپان کا بر منگھم ہے اور یہاں ملک کی بڑی بڑی صنعتیں۔ جہاز سازی، فولاد سازی، کیمیکل اور فوڈ مینوفیکچرنگ اور پروسیسنگ کی صنعتیں اس شہر میں لگائی گئیں تھیں۔ ان کو شدید نقصان پہنچا اور کئی فیکٹریاں کئی دن تک بند پڑی رہیں۔ بجلی کی سپلائی بحال کیے جانے کے بعد بھی جو کارخانے چلائے گئے ان کا پروڈکشن لیول بہت کم تھا۔ کئی کارخانوں میں پیداوار کا گراف 60فی صد سے بھی کم رہ گیا۔ صرف جوتا سازی کی صنعت کو 90 فی صد نقصان پہنچا۔ دوسری بڑی

صنعتیں اس سے بھی زیادہ متاثر ہوئیں۔ کئی چھوٹی صنعتیں صفحہ ہستی سے عنقا ہوگئیں۔ کوبے میں سمندر سے موتی نکالنے کی صنعت بھی بڑی اہم ہے۔ یہ صنعت اگلے چھ ماہ تک بند پڑی رہی۔

زلزلے کی آمد کے بعد کاروبار زندگی معطل ہوگیا اور سب بڑا مسئلہ خوراک، رہائش اور پانی کا کھڑا ہوگیا۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوچکے تھے۔ ان میں سے کچھ نے شہر کے سٹی ہال کے باہر خیموں کی بستی آباد کرلی۔ باقی لوگ نقصان زدہ اور غیر محفوظ عمارتوں میں رہنے پر بھی مجبور تھے۔ اس قدرتی آفت نے کوبے میں ڈھائی لاکھ سے زائد افراد کو بے گھر کر دیا تھا۔ زلزلے کے چند دن بعد متاثرہ افراد کے لیے امدادی سامان پہنچنا شروع ہوگیا جہاں کھانے پینے کی بہت سی دوسری اشیا بھیجیں گئیں ہیں جاپان کی ایک مشہور بیئر ساز کمپنی کیرن بیوریز نے بیئر کی بوتلیں کوبے کے لوگوں کو ذہنی کوفتوں سے بچانے کے لیے بھجوائیں۔ مگر ساتھ ہی اپنی کمپنی کی ایک لٹر سائز کی بوتلوں میں صاف شدہ پانی بھر کر بھی بھجوادیا۔

زلزلوں کے بعد اکثر شہروں میں پائپ لائنیں وغیرہ پھٹنے سے آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ کوبے میں بھی ایسا ہی ہوا اور زلزلے کے بعد آگ کی آفت نے متاثرہ شہر کو گھیر لیا۔ جاپانی حکومت کے ایک اندازے کے مطابق کوبے کا دس لاکھ مربع میٹر علاقہ آگ کی نذر ہوگیا۔

شہر میں موجود 18 ہزار عمارات یا زمین بوس ہوگئیں تھیں یا پھر انہیں شدید نقصان پہنچا تھا۔ کوبے کی بندرگاہ کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ بالشین موٹروے کئی مقامات سے ٹوٹ جانے کی وجہ سے رسل و رسائل مشکلات کا شکار ہوگئے۔

گنجان آباد علاقوں میں ایسی قدرتی آفات کے بعد انسانی لاشوں کی تدفین کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے کیونکہ انسانی لاشوں کو جلد دفن نہ کیا جائے تو یہ گلنے سڑنے لگتی ہیں جس سے وبائی امراض پھیل جاتے ہیں۔ کوبے کے ایک سرکاری اسکول کے ایک بڑے ہال کو مردہ خانہ قرار دے دیا گیا جہاں دفنانے سے پہلے لاشوں کو اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ موسم سرما کی شدت کی وجہ سے نمونیا اور انفلوائنزا جیسے وبائی امراض پھیل گئے۔ امدادی کاروائیوں کے باوجود اس شہر کے متاثرہ افراد ایک سال تک بے گھر پڑے رہے۔

1995ء..... اوکلاہاما میں ہونے والی دہشت گردی

19 اپریل 1995ء کی صبح الفریڈ پی، میورا فیڈرل بلڈنگ اوکلاہاما میں داخلے کے راستہ پر ایک بڑی طاقت کا بم پھٹا جس سے سرخ نارنجی رنگ کے شعلوں کی ایک بڑی گنبد نما چھتری فضا میں بلند ہوئی جبکہ داخلی راستہ پر ایک گہرا گڑھا پڑ گیا اور عمارت کی کھڑکیوں کے تمام شیشے اور کنکریٹ کی بالکونیاں تمام ٹوٹ کر گر پڑیں۔ نزدیکی تین بلاکوں میں اس دھماکے کی شدت سے تقریباً دس عمارات زمین بوس ہوگئیں اور سینکڑوں عمارات کو شدید نقصان پہنچا۔ دھماکے کی آواز چالیس میل کے دائرے میں سنی گئی ایک سو ساٹھ افراد موقع پر ہلاک ہوگئے اور پانسو سے زائد افراد شدید زخمی ہوئے۔ یہ 1995ء تک ہونے والی امریکہ کی تاریخ کی بدترین دہشت گردی تھی۔ اسوقت اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ اس دھماکے کے پیچھے غیر ملکی دہشت گرد تنظیموں کا ہاتھ ہے یا یہ کسی امریکی دہشت گرد کا کارنامہ ہے۔

27 سالہ سابقہ امریکی فوجی ٹموتھی میکوائی نے جون 2001 میں ایک عدالت میں بیان دیتے ہوئے اس دھماکے کی ذمہ داری قبول کی اور اعتراف کیا کہ اس نے یہ طاقتور بم دھماکہ اپریل 1993ء میں امریکی حکومت کی طرف سے ڈیوڈ کوریش کے واکو میں واقع ہیڈ کوارٹر پر کی گئی کاروائی کے انتقام کے طور پر کیا تھا۔ یاد رہے کہ حکومت کی اس کاروائی کے نتیجے میں ڈیوڈ کوریش اور اس کے بہت سے پیروکار ہلاک ہوگئے تھے۔ اور اسے واکو کا المیہ قرار دیا گیا تھا۔ اس المیہ کے دو سال بعد 19 اپریل 1995ء کو میکوائی ایک ٹرک کرائے پر لے کر اوکلاہاما سٹی میں واقع الفرڈ پی مرے فیڈرل بلڈنگ کے سامنے پہنچا اور اس نے اپنا ٹرک بلڈنگ کے داخلی راستہ کے بالکل قریب کھڑا کر دیا۔ پھر کچھ دیر وہ اس ٹرک میں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد وہ انتہائی پرسکون انداز میں ٹرک سے اترا اور کچھ دور کھڑی ہوئی اپنی کار کی طرف چلا، ابھی کار تک پہنچا نہیں تھا کہ ٹرک میں رکھا ہوا دھماکہ خیز مواد پھٹ گیا۔ اس دھماکے کی آواز سے اپنے کانوں کے پردہ کو بچانے کے لیے میکوائی نے اپنے کانوں میں ایر پلگ ٹھونسے ہوئے تھے۔

میکوائی نے جو ٹرک اس وفاقی عمارت کے سامنے کھڑا کیا تھا اس میں تقریباً چار ہزار پونڈ دھماکہ خیز مادہ اور ہوا تھا۔ جب یہ مواد کسی بڑے بم کی مانند پھٹا تو اس سے وفاقی عمارت کا اگلا حصہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ یہ دھماکہ صبح 9:20 منٹ پر ہوا تھا۔ ابھی اس عمارت میں کام کرنے والے اپنی نشستوں پر بیٹھنے نہ

پائے تھے کہ یہ دھماکہ ہوگیا اس کے علاوہ جو شہری اس عمارت میں داخل ہو رہے تھے وہ سب بھی بے وجہ مارے گئے۔ اس عمارت میں ان خواتین کے بچوں کے لیے ایک ڈے کیئر سنٹر بھی تھا جو اس عمارت میں کام کرتی تھیں۔ وہ بچے بھی اس دھماکے میں جاں بحق ہوگئے۔ ورلڈ ٹریڈ منسٹر پر دہشت گردی کے پہلے حملے کے بعد اوکلاہاما میں فیڈرل بلڈنگ پر اس براہ راست حملے نے امریکی حکومت کی بے چینی بڑھا دی اور امریکی شہریوں میں اضطراب نمایاں ہوگیا۔ امریکیوں کو یقین تھا کہ دہشت گردی کی وارداتیں مشرق وسطیٰ میں تو ہوسکتی ہیں امریکہ کی سرزمین پر نہیں مگر اب معاملہ برعکس تھا 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں دھماکے کے بعد بھی امریکیوں میں بے یقینی کی کیفیت نمایاں نہیں ہوئی تھی مگر اب وہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے پر مجبور تھے امریکیوں نے مرے فیڈرل بلڈنگ کو دوبارہ نہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی جگہ ایک چھوٹا سا پارک بنا دیا۔ اس پارک میں فیڈرل بلڈنگ کے دھماکے میں جاں بحق ہونے والے 168 افراد کی یاد میں 168 نشستیں رکھی گئیں جن میں سے 19 چھوٹی تھیں جو ان بچوں کی یاد میں تعمیر کی گئیں تھیں جو ڈے کیئر سنٹر میں ہلاک ہوگئے تھے۔

جائے حادثہ پر ملنے والے تباہ ٹرک کے ڈھانچے سے سراغ لگا کر بالآخر میکوائی کو گرفتار کرلیا گیا مگر حیرت انگیز بات تھی کہ وہ حادثے کے صرف دو گھنٹے بعد ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہوا پکڑا گیا تھا بعد ازاں اس پر اوکلاہاما میں ہونے والے اس بم دھماکے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا جس میں اس نے 2001ء میں اعتراف جرم کرلیا جس کے بعد اسے سزا دی گئی۔

1995ء..... زمین دوز ریلوے کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ

دنیا کا سب سے بدترین انڈر گراؤنڈ ریلوے کا حادثہ آذر بائیجان کے دارالحکومت باکو میں 28 اکتوبر 1995ء کو پیش آیا تھا۔ ایک کھچا کھچ بھری ہوئی زمین دوز گاڑی میں آگ بھڑک اٹھی جو چشم دید گواہوں کے مطابق ریلوے کے ہائی وولٹ تاروں میں سپارکنگ کی وجہ سے لگی تھی۔ ایلدوز Ulduz ریلوے اسٹیشن سے اس گاڑی کی روانگی کے فوراً بعد ایک ڈبے کو آگ کے شعلوں نے گھیر لیا، مسافروں کو گاڑی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر گاڑی کی بتیاں بجھ گئیں۔ لوگوں نے گاڑی سے نکلنے کے لیے کھڑکیاں توڑنے کی کوشش کی پھر اس کے بعد ڈبوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا دم گھٹنے لگا۔ ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی مگر اس کے آٹو میٹک دروازے جام ہو چکے تھے۔ دوسرے ڈبے میں بیٹھے ہوئے ایک زندہ بچ جانے والے مسافر نے بتایا کہ ہم نے کھڑکیاں توڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس مسافر نے گاڑی کے ایک روشن دان سے نکل کر سرنگ سے باہر جھانکنے کی کوشش کی جو کامیاب ہوگئی۔ ایک اور مسافر کے مطابق گاڑی میں پھنس جانے والے لوگ اس ٹرین میں دم گھٹ جانے کی وجہ سے مر رہے تھے۔ پھر اس گاڑی میں لڑائی پھوٹ پڑی۔ دروازے کے قریب کھڑے ہوئے ایک فوجی نے دروازے کے شیشے توڑنے کی کوشش کی مگر عوام کے اس پر گرنے کی وجہ سے وہ شیشے نہ توڑ سکا۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو وہ ریلوے لائن پر گرا پڑا تھا اور لوگ اس پر سے گذر رہے تھے۔ پھر اندھیرے میں کسی نے اس کو اٹھا لیا اور اسے جلتے ہوئے ڈبے سے دور لے گیا۔ اس کے دھوئیں سے بھری ہوئی سرنگ سے نکلنے میں اسے دو گھنٹے لگے۔ امدادی جماعتیں لوگوں کو بچانے کے لیے گھنٹوں تک آگ کے شعلوں سے جنگ لڑتی رہیں دوسری طرف سیکورٹی کے لوگ اخباری رپورٹروں کو گاڑی سے دور رکھنے کی کوششیں کرتے رہے۔

ریلوے کے اس سانحے میں مرنے والوں کی تعداد 337 تھی بہت سے مرنے والے کچل کر ہلاک ہوئے تھے جبکہ زیادہ تعداد گاڑی میں لگنے والی آگ سے پھیلنے والی زہریلی گیس کاربن مونوآکسائیڈ کی وجہ سے دم گھٹنے کی وجہ سے ہلاک ہوئی تھی۔ 1994ء میں باکو کے اندر گراؤنڈ ریلوے سسٹم میں دو افراد دہشت گرد حملے کی وجہ سے ہلاک ہوگئے تھے۔ اسی وجہ سے بعض رپورٹروں نے گاڑی میں آگ لگنے کی وجہ ایک بم دھماکہ قرار دی تھی مگر حکام نے گاڑی میں آگ لگنے کا سبب شارٹ سرکٹ کو بتایا تھا۔

1995ء..... بوسینیا ہرزیگوونیا میں مسلمانوں کی نسل کشی

7500 مسلمان مردوں کو صرف اس لئے قتل کر دیا گیا کہ وہ مسلمان تھے۔

بوسینیا کے شہر سر برینیکا کو اقوام متحدہ کی تحویل میں دے دیا گیا تھا مگر اقوام متحدہ کے امن قائم کرنیوالے دستوں کی تعداد بہت کم تھی اس لیے اس شہر کی حفاظت نہ ہوسکی اور سرب فوج نے آسانی سے اس شہر پر قبضہ کرلیا قبضہ کے بعد سربوں نے شہر کے 7500 مسلمان مردوں کو گرفتار کرلیا۔

بوسینیا ہرزیگوونیا میں 1990ء کی دہائی میں ہونے والی جنگ کے دوران اقوام متحدہ نے سربرنیکا Srebrenica کی کمیونٹی کو محفوظ مقام قرار دے دیا تھا۔ یہاں مرد وخواتین اقوام متحدہ کی زیر حفاظت پناہ لے سکتے تھے۔ مگر سرب فوج کو جب معلوم ہوا کہ اس محفوظ مقام کی حفاظت کے لیے اقوام متحدہ کے صرف چند فوجی متعین ہیں تو اس نے آسانی سے اس پر قبضہ کرلیا اور 7500 نہتے مسلمانوں کو گرفتار کر کے ان کا قتل عام کر دیا جو اقوام متحدہ کے اس محفوظ مقام میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ بوسینیا ہرزیگووینا سابقہ ریاست یوگوسلاویہ کا ایک صوبہ تھا۔ یوگوسلاویہ جنگ عظیم اول کے بعد وجود میں آیا تھا اور 60 سال تک قائم رہا۔ اس ملک کو متحدہ رکھنے والا جنرل مارشل ٹیٹو تھا۔ وہ ایک کمیونسٹ خیال ڈکٹیٹر تھا اور اس نے یوگوسلاویہ میں سوویت یونین سے ملتی جلتی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ 1980ء میں جب اس نے وفات پائی تو اس کے بعد یوگوسلاویہ کے بہت سے صوبوں نے آزادی کی خواہش کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ یوگوسلاویہ کے صوبوں میں آپس میں بہت سے اختلافات تھے مگر یہ نسلی امتیاز کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ کروٹس Croats مسلم اور سرب Serbs کی حیثیت سے یوگوسلاویہ کے لوگ مختلف المذاہب تھے۔ مگر اس ملک میں ایک ساتھ اور اکٹھے رہنے کی ان کی تاریخ کافی قدیم تھی۔ بوسینیا خاص طور پر ایک مسلمان اکثریت کا حامل صوبہ تھا جہاں سرب بھی آباد تھے۔ اس صوبہ کا سائز امریکی ریاست مغربی ورجینیا جتنا تھا۔

1991ء میں یوگوسلاویہ کے شمالی علاقوں میں کروشیا اور سلاوینا ایسے علاقے تھے جنہوں نے پہلے پہل اعلان آزادی کر دیا۔ سرب جو یوگوسلاویہ کے سب سے بڑے صوبے سربیا میں آباد تھے انہوں نے اس آزادی کے اعلان کے خلاف مزاحمت کی۔ سرب چاہتے تھے کہ ان کی قیادت میں یوگوسلاویہ متحد رہے۔ انہوں نے اس بات کا یقین بھی دلایا اور یوگوسلاویہ کی سابقہ سالمیت کو بحال رکھنے کے لئے ہتھیار

بھی اٹھا لئے۔ سربیا اور اعلان آزادی کرنے والے علاقوں میں اس معاملے پر کئی ماہ تک جنگ ہوتی رہی۔ پھر اقوام متحدہ کے امن قائم کرنے والے دستوں نے ان میں جنگ بندی کروا دی۔ ان دو علاقوں کے بعد بوسنیا، ہرزیگووینا تیسرا علاقہ تھا جس نے 1992ء میں اعلان آزادی کیا۔ یہ سرب راہنماؤں کو کسی طور بھی برداشت نہیں تھا کیونکہ بوسینیا میں ایک تہائی سرب لوگ بھی آباد تھے۔ بوسنیا کے سربوں کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان سے تھوڑی سی تعداد میں زیادہ مسلمان بوسینیا کے سیاہ و سفید کے مالک بن جائیں۔

مذہبی عناصر پہلی مرتبہ سطح پر آئے۔ جنوب مشرقی یورپ کی طویل تاریخ میں بہت سے لوگ مقدس رومی سلطنت کے زیر وساطت رومن کیتھولک مذہب اختیار کر چکے تھے۔ یہ لوگ کروٹس تھے جبکہ مشرقی علاقوں کے لوگ بازنطینی سلطنت کے زیر اثر آرتھوڈوکس مسیحیت کا مسلک رکھتے تھے یہ گروہ سرب کہلاتا تھا۔ عثمانی سلطنت کے زیر انتداب رہنے کی وجہ سے ان علاقوں کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ یہ لوگ بوسینیا کے مسلمان تھے۔ اگرچہ یہ تین مذہبی گروہ بہت عرصے سے اکٹھے رہتے چلے آرہے تھے مگر اب سرب یہ سمجھتے تھے بوسینیا میں مسلمانوں کے زیر انتداب رہنا بہت مشکل ہے۔ اس مسئلے کی وجہ سے بوسینیا میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اور نسل کشی کا باعث بنا۔

سربوں نے بوسینیا کے مسلمانوں کو ان کے علاقوں سے نکالنا بزور طاقت شروع کر دیا۔ یہ رویہ ویسی ہی گروہی نسل کشی کا تھا جیسا کہ روانڈا میں اختیار کیا گیا تھا۔ جب سربوں کے اس رویہ کے خلاف مزاحمت کی گئی تو شدید خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں جو متشددانہ طریقہ اختیار کیا گیا وہ روایتی جنگ سے بالکل علیحدہ تھا۔ جہاں جہاں مسلمانوں نے شدید مزاحمت کی ان علاقوں میں سربوں نے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام کیا اور دہشت پھیلانے کی پالیسی اختیار کی۔ سربرنیکا بوسینیا کا 40 ہزار کی آبادی کا حامل خوشحال صنعتی قصبہ تھا جو سربیا کی سرحد سے صرف دس میل کی دوری پر واقع تھا۔ اس قصبے کے لوگوں کو سربوں نے نسل کشی کا نشانہ بنایا۔ اپریل 1992ء میں سرب آرمی نے اس پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا جس کے بعد اس کے مسلمان باشندوں نے بھاگ کر اردگرد کے جنگلوں میں پناہ لی۔

صرف تین ہفتے کے بعد یہ قبضہ مسلمانوں کی ایک ہتھیار بند فوج نے سربوں سے واپس لے لیا اور زیادہ بھاری اسلحہ سے لیس سرب فوج کو سربیا کی سرحد کے اندر واپس دھکیل دیا۔ 1992ء کے آخر میں ٹینکوں سے مسلح ہو کر سرب فوج نے ایک بار پھر جوابی حملہ کیا اور مسلمان فوج کو نکال کر خود دوبارہ سربرنیکا پر قابض ہوگئے۔

مسلمان فوجی دستے جو بوسینیا کے اعلان آزادی کے وقت نہ تو پوری طرح مسلح تھے اور نہ ہی ان کو

کسی بڑی جنگ کو لڑنے کی تربیت دی گئی تھی اب اپنے ملک کا دفاع کرنے سے قاصر تھے۔ دوسری طرف سرب یوگوسلاویہ میں فوج کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے اور پوری طرح مسلح تھے۔ اس دوران اقوام متحدہ نے مداخلت کرتے ہوئے دونوں گروہوں کو اسلحہ بیچنے پر پابندی عائد کر دی اور اس بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ سربیا یوگوسلاویہ میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور پہلے ہی بھاری ہتھیاروں سے مسلح تھا۔ اقوام متحدہ نے مسلمانوں کے خلاف اور ایک اور اقدام یہ کیا کہ سربرنیکا کو اپنی تحویل میں لے لیا اور محفوظ مقام قرار دینے کے باوجود اس کی حفاظت نہ کر سکا سربوں کو معلوم تھا کہ اقوام متحدہ کی فوج کو آسانی سے ہٹایا جاسکتا ہے۔ سربرنیکا پر قبضے کے بعد سربوں نے ہزاروں مسلمانوں کو عمر اور صنف کے حساب سے الگ کرلیا اور عوتوں اور بچوں کو دوسری جگہ منتقل کر دیا۔ مردوں کے ہاتھ باندھ کر انہیں تفتیش کے لیے لے جایا گیا اور ان پر مختلف الزامات لگائے گئے۔

بریٹونیک Bratunac کے مقام پر جو سربیا کی سرحد کے قریب واقع تھا 7500 مسلم قیدیوں کو گولی سے اڑا دیا گیا سرب کمانڈروں کے نزدیک نسل کشی کا یہ اقدام کبھی دنیا کے سامنے نہیں آسکتا تھا۔ مسلمانوں کے اس اجتماعی قتل عام میں تشدد اور اذیت نمایاں چیزیں تھیں جن سے کام لیا گیا تھا۔ بہت سے مسلمانوں کو لوہے کی سلاخوں سے مار مار کر شہید کر دیا گیا اور بہت سوں کو نماز پڑھتے ہوئے سجدے میں گولی مار دی گئی۔ اس کے بعد اتنی بڑی تعداد کو ایک اجتماعی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ جہاں اس قتل عام کی خبر پھیلنے کے بعد ان کی لاشیں نکالیں گئیں تھیں اور مختلف مقامات پر دفنا دی گئیں مگر مصنوعی سیارے سے اس کا سراغ بھی لگ گیا۔ جس کے بعد یہ مسلم نسل کشی دنیا کے سامنے آ گئی۔

سربوں کے مسلمانوں پر کیے گئے مظالم کا ایک پہلو یہ بھی تھا سربوں نے مسلمان خواتین کی بے حرمتی کی اور ان سے اجتماعی طور پر زنا بالجبر کیا تا کہ مسلمانوں کی سماجی زندگی پر اس کے برے اثرات مرتب ہوسکیں۔ 2000 میں سربوں کے مسلمانوں پر کیے گئے ان مظالم کو انسانیت کے خلاف قرار دیا گیا اور ہیگ کی عالمی عدالت میں سرب راہنماؤں پر اس کے خلاف مقدمات بھی چلائے گئے تھے۔

اس طرح کے واقعات روانڈا اور جاپانی فوجیوں کے ہاتھوں چین کے شہر نانکنگ میں بھی انجام دیئے گئے تھے۔

سربرنیکا میں مسلمانوں کا قتل عام بوسنیا کی جنگ میں سب سے بڑا جرم تھا جس کی وجوہات میں اقوام متحدہ کا اس شہر کو محفوظ قرار دینا بھی شامل تھا۔

بعد ازاں 29 جون 2000 کو سابقہ یوگوسلاویہ کا سابقہ صدر میلا سوچ جسے سربیا کی نئی حکومت نے گرفتار کیا تھا۔ جنگی مقدمات میں ملوث ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی جنگی جرائم ٹربیونل کے حوالے کر دیا

گیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے کوسوو میں مسلمانوں کا قتل عام کرایا تھا اور بہت سے البانوی مسلمانوں کو ملک بدر کر دیا تھا۔ 2001ء میں ان سرب فوجی جرنیلوں پر بھی ہیگ کی عالمی عدالت میں مقدمات چلائے گئے جو سربرنیکا کے مسلمانوں کے قتل عام میں ملوث تھے۔ انہیں بھی گرفتار کر کے جنگی جرائم کے ٹریبونل کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ ایک سرب فوجی کمانڈر جنرل راڈی سلاو کرسٹک پر یہ فرد جرم عائد کی گئی کہ اس نے اپنے فوجی یونٹ کے ہاتھوں سربرنیکا میں 7500 مسلمانوں کو قتل کرایا تھا۔ اسے اس معاملے میں مجرم پایا گیا تاہم جنرل کرسٹک کا کہنا تھا کہ اسے اس قتل عام کی اس وقت خبر ملی تھی جب بہت دیر ہو چکی تھی اس نے اپنے فوجیوں کو اس کی سزا بھی دی تھی مگر اس کے باوجود اس جنرل کو اس سزا کی پاداش میں 46 سال کی سزائے قید سنائی گئی۔ بوسنیا کی جنگ میں جنگی جرائم میں ملوث کسی فرد کو دی جانے والی یہ اس وقت تک سب سے سخت سزا تھی۔

1997ء..... کینیڈا کے دریائے سرخ میں سیلاب

دریائے سرخ کے سیلاب سے جو 1997ء میں آیا کینیڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ دونوں متاثر ہوئے تھے۔ یہ ایک بڑا سیلاب تھا جو نارتھ ڈکوٹا، منی سوٹا اور مینی ٹوبا Manitoba میں آیا تھا۔ 1826ء کے بعد آنے والا یہ اس دریا کا شدید ترین سیلاب تھا۔ اس سیلاب نے امریکہ اور کینیڈا کے درمیان میں واقع سرحد کے دونوں طرف تباہی مچائی اور تقریباً 60 کروڑ ڈالر کا مالی نقصان پہنچا۔ دریائے سرخ امریکی ریاست منی سوٹا سے چلتا ہے اور شمالی سمت میں سفر کرتا ہوا کلیشیائی جھیل آگاسز Agassiz میں جا گرتا ہے۔ یہ بڑی گلیشیائی جھیل زمین پر آنے والے آخری برفانی دور میں وجود میں آئی تھی اور تقریباً دس لاکھ مربع میل کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ دریائے سرخ میں اکثر چھوٹے موٹے سیلاب آتے رہتے ہیں۔ مگر اتنا شدید سیلاب تقریباً پونے دو سو سال بعد آیا تھا۔ 1997ء میں پیش آنے والے حالات واقعات پچھلے سیلابوں سے کہیں بدتر تھے۔ دریائے سرخ میں آنے والے سیلاب کا پانی گرینڈ فورک Grandfork اور مشرقی گرینڈ فورک تک جا پہنچا دریا کے سیلابی پانی نے تیس میل تک راستے میں آنے والی ہر شے تباہ کر دی اور مذکورہ بالا دونوں شہروں میں گھس کر 40 ارب امریکی ڈالر کا نقصان پہنچایا۔ کینیڈا میں داخل ہونے کے بعد بھی اس دریا کے سیلابی پانیوں نے اسی قسم کی تباہی پھیلائی۔

چینیوں نے ان کے ملک میں آنے والے سیلابوں کو ناپیش گفتنی قرار دیا ہے۔ اسی طرح امریکہ میں دریائے مسسپی میں آنے والے سیلابوں کا حال ہے کہ ان کے بارے میں بھی کچھ بھی پیشین گوئی کے طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ 1826ء میں دریائے سرخ میں آنے والے سیلاب کے بعد میں کینیڈا کے موسمی حالات کے ماہرین نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایسا شدید سیلاب اب اس دریا میں آئندہ پانچ سو سال تک نہیں آئے گا مگر اس کے برعکس صرف 170 سال بعد ہی اس دریا میں ایک بار پھر شدید سیلاب آ گیا۔

گرینڈ فورک شہر کو آنے والے سیلاب سے شدید خطرہ درپیش تھا مگر قومی موسمیاتی سروس نے پیشین گوئی کی تھی کہ دریا میں آنے والی طغیانی 49 فٹ سے زیادہ نہیں بڑھے گی اور دریا کی سطح 1979ء میں آنے والے سیلاب کے برابر رہے گی۔ محکمہ موسمیات کی اس پیشین گوئی کے بعد اس شہر کے لوگوں نے خود سیلاب سے محفوظ قرار دیا اور شہروں کو سیلاب سے بچانے کے لیے جو پشتے تعمیر کیے گئے تھے انہیں

1979ء کی سطح پر رہنے دیا۔ مگر دریا میں 1997ء میں آنے والا یہ سیلاب پچھلی حدوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ محکمہ موسمیات کو حیران کرتا ہوا یہ دریا 16 اپریل 1997ء کو ہی 49 فٹ تک پہنچ گیا۔ اس دن تک محکمہ موسمیات اپنی سابقہ پیشین گوئی کو دوبارہ مرتب نہیں کر سکا تھا۔ گرینڈ فورک اور مشرقی گرینڈ فورک کے شہروں کے حفاظتی پشتے دریا کا سیلابی پانی اس دن پھلانگ چکا تھا۔ اور ان شہروں میں واقع ہزاروں مکانات سیلابی پانی میں ڈوب چکے تھے اور ان دونوں شہروں کے 75 فی صد باشندوں کو سیلاب سے بچانے کے لیے نکالنا ضروری تھا۔ دونوں شہروں میں اسکول بند کر دیئے گئے اور یونیورسٹی آف شمالی ڈکوٹا نے بھی اپنی کلاسز معطل کر دیں۔

چونکہ دونوں سیلاب زدہ شہروں میں ٹرانسپورٹ بھی شاہراہیں پانی میں ڈوب جانے کی وجہ سے معطل ہوگئی تھی اس لیے مشرقی گرینڈ فورک کے شہریوں کو نزدیکی قصبے کروک اسٹون میں منتقل کرنا پڑا۔ وہ سب یونیورسٹی آف منی سوٹا کی عمارتوں میں ٹھہرائے گئے جبکہ گرینڈ فورک شہر کے مکینوں کو گرینڈ فورک ایربیس پر منتقل کیا گیا جو سیلاب کی ریخ سے باہر تھا دریا کی طغیانی 21 اپریل 1997ء کو 54.35 فٹ تک پہنچ گئی اور اگلے 5 دن تک یعنی 26 اپریل تک نیچے نہیں آئی۔ کیونکہ پانی کو نکالنے کی رفتار بہت کم تھی اور یہاں تک کہ بہت سے لوگ تو مئی تک بھی اپنی جائیدادوں کی خبر لینے کے لیے نہیں آسکے۔ گرینڈ فورک اور مشرقی گرینڈ فورک میں پہنچنے والا مالی نقصان 10 کروڑ ڈالر سے تجاوز کر گیا۔ گرینڈ فورک کی تین فی صد آبادی کم ہوگئی جبکہ مشرقی گرینڈ فورک میں یہ شرح 17 فی صد تھی۔ کینیڈا کے صوبے مینی ٹوبا میں دریائے سرخ کا سیلابی راستہ 1968ء میں مکمل کیا گیا تھا اور وِنی پیگ winnipeg کے آٹھ قصبوں کے گرد حفاظتی پشتے بھی تعمیر کر دیئے گئے تھے تاہم ان تمام حفاظتی اقدامات کے باوجود 1997ء کے سیلاب سے نہیں بچا جاسکا۔ کینیڈا میں یہ سیلاب 4 مئی کو انتہائی شدید درجے پر پہنچا تھا۔ دریا کے سیلابی پانی نے تقریباً 1900 مربع میل کے علاقے کو گھیر لیا اور یہ سیلاب زدہ علاقہ بحیرہ قلزم کہلانے لگا۔ کینیڈا میں اس سیلاب کو صدی کا سب سے بڑا سیلاب قرار دیا گیا تھا۔

1998ء..... وسطی امریکہ میں ہری کین مچ سے تباہی

وسطی امریکہ کی تاریخ میں اس قدرتی آفات سے پہنچنے والے جانی و مالی نقصانات کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس طوفان سے اٹھارہ ہزار تین سو تیئیس 18323 اموات واقع ہوئیں جبکہ مالی نقصان اتنا زیادہ تھا کہ وسطی امریکہ کے ملک ہنڈراس کے وزیر مواصلات کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہنڈراس نے 35 سال میں جتنی ترقی کی تھی وہ اس طوفان نے صرف ایک دن میں ملیا میٹ کر دی۔

کرہ ارض کے نصف مغربی کرے میں دو سو سال میں آنے والا سب سے تباہ کن طوفان Much تھا جس نے صرف ہنڈوراس میں 4 ہزار افراد کو جاں بحق اور 21 شہروں کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ ہزاروں مکانات کو زمین بوس کر دیا تھا اور کھیتوں میں کھڑی تیار فصلیں تباہ ہوگئیں تھیں۔ اس طوفان کے ساتھ لینڈ سلائیڈز اور سیلاب کے حملے کی وجہ سے اس ملک میں لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑیں تھیں اس بات کا اعتراف خود اس ملک کے صدر نے کیا تھا۔ اس علاقے میں ایک سو سال پہلے 1870ء میں تقریباً اسی طاقت کا ایک اور طوفان آیا تھا جس سے 22 ہزار افراد ہلاک ہوئے تھے۔

ہری کین مچ کیٹیگری 5 کا طوفان تھا اور اس کا خصوصی ہدف وسطی امریکہ کے ممالک تھے۔ کیٹگری 5 کے طوفانوں میں ہوا کی رفتار کم از کم 175 میل فی گھنٹہ ہوتی ہے جو بڑی بڑی بلڈنگوں کو جڑ سے اکھاڑ کر قیامت برپا کر دیتی ہے۔ ہری کین مچ نے 22 اکتوبر کو جنم لیا اور یہ قیامت کی رفتار سے چلتا ہوا صرف چار دن بعد کیٹگری 5 کے طوفان کی حیثیت سے وسطی امریکہ کے ممالک سے ٹکرا گیا۔ وسطی امریکہ کے ممالک، ہنڈوراس، گواٹے مالا نکارا گوا اور ایل سلواڈور جیسے غریب ممالک اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ ان ملکوں میں شاہراہیں، پل، رسل و رسائل ٹرانسپورٹیں اور بجلی کے نظام تباہ ہوگئے۔ ان ملکوں میں پانی کی سپلائی کے نظام بہت فرسودہ تھے اس لئے اس طوفان بلاخیز کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ ہنڈوراس کے ساحلوں پر تعمیر کردہ مکانات صرف کھمبوں پر کھڑے تھے ہری کین نے ان کا صفایا کر دیا اور طوفان کے بعد صرف چند ہی مکان باقی بچے۔

سیلاب اور بارشیں ہری کین کے ساتھ ہی آتی ہیں اور یک نہ شد دو شد کے مصداق تباہی کو بھی دو گنا کر دیتی ہیں۔ ہری کین مچ کی آمد کے بعد وسطی امریکہ کے پہاڑی علاقوں میں 25 انچ سے زائد

بارشیں ہوئیں۔ ان بارشوں سے ان علاقوں میں لینڈ سلائیڈ اور مڈ سلائیڈ کے کئی واقعات رونما ہوئے جنہوں نے تباہی مچادی اور پورے پورے گاؤں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ رہی سہی کسر سیلاب نے پوری کر دی اور ہر طرف پانی پانی اور کیچڑ ہی کیچڑ ہوگیا۔ لوگ سیلاب سے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے بچوں کو درختوں سے باندھ دیا تاکہ وہ سیلاب کے ساتھ بہہ جانے سے بچ سکیں۔ یہ عالم تھا کہ لوگ اپنے ہمسایوں کی لاشوں کو سیلاب میں بہتا ہوا دیکھ کر کچھ نہیں کر سکتے تھے اور بے بس تھے۔ بینک اور دوسرے کاروباری ادارے بند تھے اور ان میں رکھا ہوا پیسہ کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ ہنڈوراس کا ایک قیدخانہ زمین بوس ہوگیا جس کے بعد قیدیوں نے راہ فرار اختیار کی پولیس نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے فائر کھول دیا جس سے مزید ہراس پھیل گیا۔

طوفان کے بعد ہر طرف موت اور تباہی پھیل گئی اور اس قدرتی آفت سے ہزاروں لوگ ہلاک ہوگئے۔ طوفان کے بعد وبائی امراض ایک دوسری آفت کی طرح نازل ہوگئے اور وسطی امریکہ کی حکومتوں کو ان کے خلاف جنگ لڑنا پڑی۔ ہیضہ ملیریا اور ڈینگی بخار سب سے بڑی بیماریاں تھیں۔ ہر طرف کیچڑ اور پانی ہو جانے کی وجہ سے مچھروں کی بہتات سے ان امراض کے پھیلنے کا سامان ہوگیا تھا۔

ہری کین مچ کے بعد سب سے بڑا مسئلہ بے گھر افراد کا تھا۔ مختلف رپورٹوں اور متضاد بیانات کے مطابق بے گھر ہو جانے والے افراد کی تعداد ڈیڑھ سے تین کروڑ تھی۔ اتنی بڑی تعداد کو گھر فراہم کرنا ان ترقی پذیر ممالک کے لئے بہت بڑا مسئلہ تھا۔ جس سے نمٹنے کے لیے وسطی امریکہ کے ان ممالک کو بیرونی امداد کی اشد ضرورت تھی بیرونی دنیا نے دل کھول کر امداد بھیجی اور وسطی امریکہ کے ممالک کو قرض دینے والے ممالک امریکہ اور دوسرے ملکوں نے ہنڈوراس اور نکارا گوا کے قرضے تک معاف کر دیئے۔ مچ وسطی امریکہ سے نکل کر میکسیکو کے جزیرہ نما پر حملہ آور ہوا اور خلیج میکسیکو کو عبور کرتے ہوئے ایک سمندری طوفان بن گیا اور فلوریڈا میں بھی جانی و مالی نقصانات کا باعث بنا۔

1999ء..... ہری کین فلائیڈ

اس ہری کین کے ساتھ ہونے والی بارشوں نے مشرقی امریکی ریاستوں میں بڑے پیمانے پر تباہی مچائی۔ تقریباً 30 ارب ڈالر کے مالی نقصان کا اندازہ لگایا گیا تھا۔ ہری کین فلائیڈ Floyd ساحلی مقامات پر آیا اور اس کی وجہ سے کیپ فیئر Cape fear کے نزدیک شمالی کیرولینا میں بہت سے لینڈ سلائیڈ کے واقعات رونما ہوئے۔

یہ ہری کین 16 ستمبر 1999ء کو رات 2 بجے 104 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ہواؤں کے ساتھ حملہ آور ہوا اور اس نے مشرقی کیرولینا اور نیو جرسی کے شمال مشرقی حصوں اور ملحقہ علاقوں میں بڑے پیمانے پر تباہی مچائی اور شدید نقصانات کا باعث بنا۔ یہ ہری کین اس سے پہلے آنے والے کسی بھی ہری کین سے زیادہ انسانی مصائب اور ماحولیاتی اثرات کا باعث بنا تھا اس سے پہنچنے والے نقصانات کا تخمینہ 30 ارب ڈالر لگایا گیا تھا۔

شمالی کیرولینا کے نصف مشرقی حصے میں اس ہری کین کی وجہ سے 20 انچ بارش ہوئی جو اس حصے میں بہنے والے ہر دریا اور ندی نالے میں طغیانی کا باعث بنی۔ اس طوفان میں گھر کر 57 افراد جاں بحق ہوگئے اور اس کی وجہ سے آنے والے سیلاب نے بھی شدید نقصانات پہنچائے۔ اس سیلاب کی وجہ سے اس علاقے کے دریاؤں میں سیلاب کے نئے ریکارڈ قائم ہوئے اس علاقے کی تمام آبادیاں کئی دن تک زیر آب رہیں۔ کئی علاقوں میں کئی ہفتوں تک پانی کھڑا رہا ہزاروں گھر زمین بوس ہوگئے اور فصلوں کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ مشرقی کاؤنٹیوں کے انفراسٹرکچر، شاہراہوں، پلوں، دیگر ذرائع رسل و رسائل اور آب رسانی کے نظام کو بھی شدید نقصان پہنچا۔

یہ ہری کین 2 ستمبر کو افریقہ کے مغربی ساحل پر ٹروپیکل موجوں کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ ایک دو دن بعد اس نے فضا کے دباؤ میں کمی کی شکل اختیار کر لی اور پھر 8 ستمبر کو یہ ٹروپیکل ہری کین کی صورت میں ظاہر ہوا۔ 10 ستمبر کو اس طوفان نے مغربی سمت میں بڑھتے ہوئے اس کی ہواؤں نے 156 میل گھنٹہ کی رفتار سے بحر اوقیانوس عبور کیا اور 15 ستمبر کو فلوریڈا کے ساحل تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد اس نے شمالی سمت کا رخ کیا اور شمالی کیرولینا پہنچ کر زمین پر اتر آیا اور پھر لانگ آئی لینڈ کے ساحلوں کے ساتھ چلتا

ہوا مین Main پہنچا اور شدید بارشوں کا باعث بنا۔ یہ طوفان جس راستے سے گذرا وہاں شدید بارشیں برسیں۔ یارک ٹاؤن، ورجینیا میں اس ہری کین کی وجہ سے 18 انچ بارش ہوئی جبکہ میری لینڈ، ڈیلاویر، نیو جرسی، جنوب مشرقی پنسلوانیا اور جنوب مشرقی نیو یارک میں 14 انچ بارش ریکارڈ کی گئی۔ اس ہری کین کے ساتھ 18 ٹورنیڈو بھی تھے جس دن یہ شمالی کیرونیا میں طویل سمندری سفر کے بعد زمین پر اترا تھا اس دن اس علاقے میں یہ بگولے دار طوفان بھی آئے تھے۔ ان میں سے دو انتہائی طاقتور تھے اور F2 کا درجہ رکھتے تھے۔

شمالی کیرولینا کا تاریخی قصبہ پرنس وائل Princevile ۔ اس ہری کین کے ساتھ آنے والے سیلاب میں بری طرح گھر گیا تھا جس کی جہ سے اس قصبے میں بہت سے مکانات بیٹھ گئے اور ان کے مکینوں کو ان کی چھتوں اور دیگر محفوظ مقامات پر پناہ لینا پڑی تھی۔

2000ء.....روسی ایٹمی آبدوز کی غرقابی

زمانہ امن میں ایک ایٹمی آبدوز کی غرقابی کا جو حادثہ پیش آیا وہ روسی ایٹمی آبدوز کروشک Krushk کی غرقابی کا حادثہ تھا جو 2000ء میں پیش آیا تھا۔ یہ سوویت یونین کی تحلیل کے بعد روس میں تیار کی جانے والی ایٹمی آبدوز تھی۔ یہ آبدوز بہت کم عرصہ استعمال میں رہی۔

امریکہ سے سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد روس نے اپنے شمالی بحری بیڑے میں کمی کی مگر اس کے باوجود معیشت کی کمزوری کی وجہ سے روس کا یہ بحری بیڑہ بے توجہی کا شکار ہوتا چلا گیا۔ آبدوزوں کو زنگ آلود ہونے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور ملاحوں کو کئی کئی ماہ تک تنخواہیں نہ دی گئیں۔ بیسویں صدی کے اختتام کے قریب اس بحری بیڑے کو دوبارہ بہتر بنانے کی کوششیں کی گئیں اور ایٹمی آبدوز کروشک ایک مرتبہ پھر 1999ء میں امریکیوں کے خلاف جاسوسی کے مشن پر بحر اوقیانوس میں نکلی۔ اگست 2000ء میں بحیرہ بیرنٹس میں کی جانے والی تربیتی مشقیں بھی سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد پہلی بڑی جنگی مشقیں تھیں جن میں کروشک نے حصہ لیا۔ 12 اگست 2000ء کو تقریباً صبح ساڑھے گیارہ بجے اس آبدوز سے مصنوعی ٹارپیڈو فائر کئے جارہے تھے کہ اچانک آبدوز پر دھماکہ ہوا اور وہ فوری طور پر ساحل سے صرف 85 میل دور 325 فٹ کی گہرائی میں ڈوب گئی۔ پہلے دھماکے کے دو منٹ بعد ایک دھماکہ ہوا اور وہ مکمل طور پر ناکارہ ہوگئی کرسک کو اگلی صبح 5 بجے سمندر کی تہہ میں ڈھونڈ لیا گیا اور دوسرے ملکوں اور روس کے امدادی جہاز بہت جلد اس مقام پر پہنچ گئے۔ بیرونی ملکوں کے جہازوں میں برطانیہ اور امریکہ کے جہاز شامل تھے۔ روسیوں نے ایک زیر آب جانے والا کیپسول چھوڑا مگر سمندر میں تلاطم پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہ آبدوز تک نہ پہنچ سکا۔ آبدوز کے عملے کے زیادہ تر ارکان آبدوز میں دھماکوں اور پانی کے در آنے کی وجہ سے ہلاک ہوچکے تھے مگر کچھ اگلے دن صبح تک زندہ تھے۔ روسی صدر پیوٹن ان دنوں جنوبی روس میں چھٹیاں گذار رہا تھا۔ تاہم اس نے اس حادثے کے متعلق بدھ کے دن تک کوئی بیان نہیں دیا۔ پھر بدھ والے دن روسیوں نے ناروے اور برطانیہ سے اس مسئلے میں امداد طلب کی مگر اس وقت تک عملے کے تمام ارکان جاں بحق ہو چکے تھے۔ جمعہ کے دن صدر پیوٹن چھٹیاں گذار کر واپس ماسکو آ گیا۔ تین دن بعد ناروے کے غوطہ خور کروشک میں داخل ہونے میں کامیاب ہوئے جس کے بعد روسی بحریہ نے یہ اعلان

کیا کہ کرسک کے عملے کے 118 افراد میں سے کوئی زندہ نہیں بچ سکا۔ روسی بحریہ نے پہلے پہل یہ نظریہ پیش کیا کہ عملے کے تمام افراد دونوں دھماکوں کے فوراً بعد جاں بحق ہوگئے تھے لیکن اس کے بعد آبدوز سے ایک لیفٹیننٹ کمانڈر دمتری کولیس نکوف کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ایک تحریر برآمد ہوئی اور یہ بات واضح ہوگئی کہ عملے کے 23 ارکان دھماکوں کے بعد زندہ بچ گئے تھے اور انہوں نے آبدوز کے عقبی حصے میں پناہ لی تھی۔ اس تحریر میں اس نے لکھا تھا کہ یہاں اتنا اندھیرا ہے کہ لکھنا ایک مشکل کام نظر آتا ہے۔ ہمیں اب بچنے کی کوئی امید نہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی بالضرور میری اس تحریر کو پڑھے گا۔ اس لیفٹننٹ کے جنازے پر شمالی بیڑے کے کمانڈر نے کہا کہ کولیسنکوف کی جو تقدیر تھی وہی اب ہم سب کا مقدر نظر آتی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اس آب دوز کے حادثے میں زندہ بچنے والے اس وقت جاں بحق ہوئے جب آبدوز کے اس حصے میں آکسیجن پیدا کرنے والے آلات کام کرنا چھوڑ گئے اور حدت بڑھ جانے کی وجہ سے ایک اور دھماکہ ہوا اور اس سے بچ جانے والے دم گھٹ کر اور آکسیجن کی کمی کا شکار ہو کر مر گئے۔

روسی اخباروں نے صدر پیوٹن کے اس حادثے کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال سے نمٹنے پر شدید تنقید کی اور لکھا کہ روسی طبقہ امراء کے طور طریقے ابھی تک نہیں بدلے.... ابھی تک وہ سچ کی پردہ پوشی کرنے کو اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ اگر پیوٹن اپنے فرض کو صحیح طور پر ادا کرتے تو باقی عملے کی زندگیاں بچ سکتی تھیں اکتوبر 2001ء میں کرشک کو سمندر کی تہہ سے نکالا گیا تو پتہ چلا کہ پہلے دھماکہ سے پیدا ہونے والی حدت سے 4 تار پیڈووں کے وار ہیڈ پھٹ گئے تھے اور دوسرا دھماکہ ان وار پیڈوں کے پھٹنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسی دھماکے نے آبدوز کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ اس سے پہلے روسی حکام کا خیال تھا کہ یہ آبدوز کسی غیر ملکی آبدوز سے ٹکرا کر یا کسی بارودی سرنگ سے ٹکرا کر تباہ ہوگئی۔

2001ء..... نیویارک پر دوسرا بڑا دہشت گردانہ حملہ

1993ء میں ہونے والے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر دہشت گردانہ حملے سے بڑا حملہ اسی سنٹر پر 11 ستمبر 2001ء کو کیا گیا اس کے ساتھ دہشت گردوں نے واشنگٹن میں واقع امریکی محکمہ دفاع کے ہیڈ کوارٹر پینٹاگون کو بھی نشانہ بنایا ان حملوں سے امریکی حکومت ایک نئی صورتحال کا شکار ہوگئی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر نیویارک میں 1993ء میں ہونے والے دھماکے بھی اگرچہ شدید تباہ کن تھے اور ان سے امریکی زندگی بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی تاہم یہ دہشت گردوں کی تنہا کاروائی تھی مگر 11 ستمبر کے واقعات تشدد کا نیا پہلو لئے ہوئے تھے۔ ان میں امریکہ کے تجارتی مرکز کے ساتھ ساتھ فوجی مرکز کو بھی نشانہ بنایا گیا تھا اور ایک جہاز کے اغوا کی واردات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دہشت گرد امریکہ کے سیاسی مرکز وائٹ ہاؤس پر بھی حملہ کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی یہ ایک منظم دہشت گرد کاروائی تھی جس کا منصوبہ امریکہ سے باہر تیار کیا گیا تھا۔

11 ستمبر 2001ء کو نیویارک کی تاریخ کا سب سے ناقابل تصور واقعہ رونما ہوا جس سے خود امریکہ اور پوری دنیا ورطہ حیرت میں پڑ گئی کہ کیا ایسا ہوسکتا تھا؟

ایندھن سے بھرے ہوئے دو مسافر بردار ہوائی جہازوں کو ہوسٹن سے اغوا کیا گیا اور پھر شعوری طور پر ان کو نیویارک میں واقع ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی دو جڑواں عمارات سے ٹکرا دیا گیا اس ٹکراؤ میں جہاں ان جہازوں پر سوار ہر فرد ہلاک ہوگیا جن میں خود دہشت گرد بھی شامل تھے۔ نہ صرف ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں آگ بھڑک اٹھی بلکہ چند گھنٹے بعد یہ دونوں عمارات ریت کے ڈھیروں کی طرح زمین پر ڈھیر ہوگئیں۔ ان عمارتوں کے گرنے سے پہلے جو 2673 افراد ان میں پھنس کر رہ گئے تھے وہ بھی ہلاک ہوگئے۔ ان عمارات میں ہلاک ہونے والے افراد میں آگ بجھانے والے اور پولیس آفیسرز بھی شامل تھے۔ یہ لوگ جائے حادثہ پر پہنچتے ہی اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے ان عمارات میں داخل ہوکر بالائی منزلوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

یہ تباہی نیویارک کے علاقے زیریں مین ہٹن کے 16 ایکٹر رقبے میں پھیلی تھی۔ اس علاقے میں صفائی اور بحالی کا کام پورے ایک سال تک جاری رہا۔ ان عمارتوں کے مالکوں نے پورے عزم کے ساتھ اعلان کیا کہ وہ نئی عمارات اسی جگہ دوبارہ تعمیر کریں گے۔ ان عمارات کے ملبے میں پھنسے رہ جانے والے لوگوں کی لاشیں یا لاشوں کے ٹکڑے ہر روز برآمد ہوتے تھے۔ ان لاشوں کے مغائنے سے ماہرین نے اندازہ لگایا تھا کہ ان میں سے بہت سے لوگ جہازوں سے بہہ نکلنے والے جلتے ہوئے تیل سے بھسم

ہو گئے تھے یا ٹنوں وزنی ملبے کنکریٹ یا اسٹیل کے ٹکڑوں کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے تھے ایسے سینکڑوں لوگوں کی باقیات تک نہ مل سکیں تھیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں لگنے والی آگ میں شیشوں، دفتری سامان، عمارتی پینٹ، انسولیشن اور دیگر عمارتی کیمیکل کے جلنے کی وجہ سے پورے زیریں مین ہٹن میں فضائی آلودگی پھیل گئی۔ اکثر امدادی کارکنوں کے لیے سانس لینے میں مشکلات پیش آئیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں لگنے والی اس آگ سے انسانی صحت پر طویل المیعاد اثرات بھی مرتب ہوئے تھے اور سانس سے متعلقہ صحت کے دوسرے مسائل بھی پیدا ہوئے تھے۔

اس دہشت گردانہ حملے کا اثر اتنا شدید تھا کہ امریکہ اور پوری دنیا میں کیبل ٹی وی کی نشریات روک کر اس حادثے کی خبر نشر کی گئی اور المیہ پیغام نشر کیے گئے یا دیگر ٹی وی نشریات کو معطل کر کے سی این این اور دیگر نیٹ ورکس کی وہ نشریات دکھائی جانے لگیں جن میں اس حادثے کی کوریج نشر کی جا رہی تھیں۔

امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے اس دہشت گردانہ حملے کو امریکہ کی سرزمین پر حملہ تصور کرتے ہوئے ان دہشت گردوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جو اس کاروائی میں ملوث تھے اور امریکی عوام کو یقین دلایا کہ ان مجرموں کو بالضرور کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر کیے جانے والے اس حملے کے دوران ہی ایک اور ہوائی جہاز پینٹاگون کی عمارت سے ٹکرا دیا گیا۔ چوتھا جہاز جو ریاست پنسلوانیا کے ایک کھیت میں گر کر تباہ ہو گیا تھا یقین سے کہا جا رہا تھا کہ یہ جہاز یقینی طور پر وہائٹ ہاؤس سے ٹکرایا جانا تھا۔

امریکی حکومت نے فوراً ہی ان حملوں کا الزام سعودی عرب کے جلاوطن شہری اسامہ بن لادن کے سر لگا دیا اور کہا کہ یہ کاروائی اسامہ کے دہشت گرد نیٹ ورک القاعدہ نے کی ہے کیونکہ اگست 1991ء میں تنزانیہ اور کینیا میں واقع امریکی سفارت خانوں پر بموں سے حملہ بھی اسی تنظیم نے کرایا تھا اور اسامہ بن لادن پہلے ہی بہت سے الزامات میں FBI کو مطلوب تھا۔ 11 ستمبر کے واقعات کے فوراً بعد امریکی حکومت نے اعلان کیا کہ اسامہ بن لادن کو گرفتار کرانے اور اسے سزا دینے میں مدد گار معلومات فراہم کرنے والوں کو ڈھائی کروڑ ڈالر انعام دیا جائے گا۔ امریکیوں کا قیاس تھا کہ القاعدہ کا ہیڈ کوارٹر اور خود اسامہ بن لادن اور طالبان کے زیر اثر افغانستان میں موجود ہے۔ اسی قیاس کے پیش نظر امریکی حکومت نے طالبان اور القاعدہ کے خلاف ایک فوجی مہم شروع کر دی اور افغانستان پر حملے کے بعد نومبر 2001ء میں افغانستان سے طالبان حکومت ختم کر دی گئی۔ یہ بات اور کہ اس ریاستی دہشت گردی میں خود امریکہ نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ہلاک ہونے والے افراد سے سینکڑوں گنا زیادہ افغان شہری اپنی اس فوجی مہم کے دوران قتل کر دیئے جو امریکی حکومت کے نزدیک ایک جائز کاروائی تھی۔

2004ء سماٹرا، انڈونیشیا میں آنے والا زلزلہ اور سونامی

24 دسمبر 2004ء کی صبح تقریباً 8 بجے سماٹرا، انڈونیشیا کے شمالی حصے میں ریکٹر اسکیل کے مطابق 9.1 درجے کا ایک زلزلہ آیا۔ اس زلزلے سے پیدا ہونے والے بحر ہند میں سونامی نے دنیا کے بڑے حصے کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ تاریخ انسانی کا سب سے ہولناک سونامی تھا۔ اس شدید زلزلے کا مرکز Epicenter سماٹرا سے 100 میل مغرب میں جزیرہ سمیولو Simeulue کے قریب سمندر کی تہہ میں واقع تھا۔ یہ زلزلہ 9.3 درجے تک پہنچا اور دنیا میں آنے والا دوسرا شدید زلزلہ تھا۔ اور اتنا طاقتور تھا کہ اس کی وجہ سے زمین کی محوری گردش ایک سیکنڈ کے کچھ حصے کے لیے دھیمی پڑ گئی تھی۔ پہلے جھٹکے کے بعد درجن بھر مزید جھٹکے محسوس کیے گئے۔ اس زلزلے کا دورانیہ بھی بہت طویل تھا یہ تقریباً دس منٹ تک جاری رہا۔ سمندر کی تہہ میں 1000 میل تک 50 فٹ چوڑی دراڑ پڑ گئی اور 7 کیوبک میل کے علاقے کا پانی سونامی کی موجوں میں بدل گیا۔ اس سونامی نے نہ صرف مغربی سماٹرا بلکہ تھائی لینڈ، انڈیا، سری لنکا اور کئی اور دور دراز کے مقامات کو تباہ کر کے رکھ دیا اور کم از کم 250000 افراد جاں بحق ہو گئے۔

بحر الکاہل کے زلزلوں کی آمد کے علاقے میں سونامی سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لیے 1948ء سے اس علاقے میں ایک وارننگ سسٹم متعارف کرایا گیا تھا۔ اس قسم کا کوئی وارننگ سسٹم بھی بحر ہند کے علاقے میں متعارف نہیں کرایا گیا تھا اس لیے بحر ہند کے ساحلی علاقے اس سونامی کی آمد سے بے خبر تھے۔ اور اسی بے خبری کے عالم وہ اس سونامی کا شکار ہو گئے۔ اکثر اوقات سونامی کی آمد کے مواقع پر پہلی علامت یہ نمودار ہوتی ہے کہ ڈرامائی طور پر سمندر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اپنے پیچھے تڑپتی ہوئی مچھلیاں اور حیرت زدہ سمندر میں تیرنے والوں کو چھوڑ جاتا ہے۔ پھر جب یہ لہروں کے تموج کے ساتھ واپس لوٹتا ہے تو جو لوگ ڈوبنے سے بچ جاتے ہیں وہ یا تو ہزاروں ٹن کچرے سے ٹکرا کر تباہ ہو جاتے ہیں یا پھر کچلے جاتے ہیں۔ یہ پلٹ کر آنے والی سمندری موجیں اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ اس لیے 2004 کے سونامی نے تھائی لینڈ کے ساحلوں پر تعمیر کردہ سیاحتی ہوٹلوں کو اور انڈونیشیا اور سری لنکا کے ساحلوں پر آباد ماہی گیروں کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

سونامی کی پہلی موج نے انڈونیشیا کے ساحلوں سے زلزلے کی آمد کے صرف 15 منٹ کے بعد ٹکرائی۔ اس کی بلندی انڈونیشیا کے صوبے اچے Aceh کے ساحلوں پر جزیرہ سماٹرا میں تقریباً 100 فٹ تھی۔ اس کے بعد موجیں مسلسل اگلے سات گھنٹے تک تاراج کرتی رہیں۔ انڈونیشیا کے بعد ملائیشیا کا نمبر تھا۔ سینکڑوں فٹ پانی کی دیواریں ملائیشیا کے ساحلوں سے ٹکراتی رہیں اور تباہی مچاتی رہیں۔ میانمار (برما)، تھائی لینڈ، بنگلہ دیش، سری لنکا، انڈیا اور حتیٰ کہ دور دراز واقع صومالیہ تک سونامی کی موجوں نے تباہی مچائی صومالیہ جو 4500 میل کے فاصلے پر واقع تھا وہاں سونامی نے 176 افراد کو ہلاک اور 50 ہزار افراد کو بے گھر کر دیا۔ جنوبی افریقہ میں 8 اموات واقع ہوئیں اور ڈربن کی بندرگاہ کو بند کرنا پڑا۔ بحر ہند میں واقع زیریں علاقے جیسے جزائر مالدیپ، نکوبار اور جزائر انڈیمان تقریباً ڈوب کر رہ گئے۔ جبکہ ایشیا اور مشرقی افریقہ کے سرسبز گھاس کے میدان شاداب ہرے رنگ سے خالی مٹیالے رنگ کے ہو گئے۔

کچھ لوگ جو ساحلی علاقوں سے بروقت تباہی سے بچنے کے لیے نکل گئے وہ انڈونیشیا کے جزیرہ سمیلو کے کچھ لوگ تھے۔ اس جزیرے میں 1907ء میں بھی ایک شدید سونامی آیا تھا۔ اس وقت سے یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ اس جزیرے کے باشندے زلزلے کے پہلے جھٹکے کو محسوس کرتے ہی فوراً ساحلی مقامات چھوڑ کر جزیرے کے اندرون واقع پہاڑی مقامات میں پناہ لے لیتے تھے۔ تھائی لینڈ میں چھٹی پر آئی ہوئی ایک برطانوی لڑکی نے جو جغرافیہ میں سونامی کی علامتوں کے متعلق پڑھ چکی تھی جب سمندر کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو اس نے شور مچا دیا جس سے بہت سے لوگ ساحل کو چھوڑ کر بروقت چلے گئے۔ اسی طرح ایک نزدیکی مقام کمالا بے Kamalabay پر ایک سکاٹش ٹیچر نے سونامی کی علامتیں دیکھ لوگوں کو خبردار کر دیا اور سیاحوں سے بھری ہوئی ایک بس کو ڈوبنے سے بچا لیا مگر کچھ لوگ زیادہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوئے اور اس سونامی کی موجوں میں گھر گئے۔ سری لنکا میں سیاحوں کے لیے ایک مشہور ریل گاڑی چلائی جاتی ہے جس کا نام کوئین آف دی سی Queen of the see ہے۔ اس دن یہ گاڑی صبح 7:30 پر کولمبو سے گیلے شہر کے لیے روانہ ہوئی۔ اس گاڑی میں بہت سے بچے بھی سوار تھے۔ دو گھنٹے بعد یہ گاڑی ایک ساحلی قصبے پیرالیا Peralya کے اسٹیشن پر کھڑی تھی کہ ایک بڑی موج نے اس کا راستہ روک لیا اور گاڑی پانی میں گھر گئی۔ جب یہ گاڑی پانی میں گھری ہوئی کھڑی تو بہت سے مقامی لوگ اس آس میں اس گاڑی پر سوار ہو گئے کہ شاید یہ انہیں کسی محفوظ مقام تک لے جائے۔ کچھ لوگ اس کے ڈبوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے کہ مزید موجوں سے بچا جائے مگر 20 فٹ اونچی ایک موج نے اس گاڑی کو لائن سے ہٹا کر درختوں اور آس پاس کے گھروں سے ٹکرا دیا اور سمندر کا پانی ڈبوں میں بھر گیا۔ اس طرح اس گاڑی پر سوار بہت سے لوگ مارے گئے اور صرف چند درجن خوش نصیب لوگ زندہ بچے۔ حکومتی اعداد شمار کے

مطابق اس ٹرین پر سوار 2000 لوگ جاں بحق ہو گئے تھے۔

قصبہ پیرالیا مکمل طور پر تباہ ہو گیا سوائے چند عمارات کے۔ اس سونامی کو باکسنگ کے دن کا سونامی بھی کہا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق اس سونامی نے 310000 لوگوں کی جانیں ضائع کر دی تھیں۔ صرف سماٹرا میں جاں بحق ہونے والوں کی تعداد 94000 تھی، سری لنکا میں 30 ہزار لوگ مارے گئے، انڈیا میں مرنے والوں کی تعداد 9000 تھی، تھائی لینڈ میں 6000 ۔ مرنے والوں میں زیادہ تعداد سیاحوں کی تھی۔

اس سانحے میں 91 برطانوی باشندے مارے گئے۔ ان لوگوں کو یہ شکایات بھی تھیں کہ اس خطرے سے خبردار کرنے کے لیے ان تمام ملکوں میں کوئی وارننگ سسٹم سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ تاہم اس شدید سونامی کی زد میں آنے والے ممالک کی دنیا بھر نے دل کھول کر مدد کی۔ انڈونیشیا سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ملکوں میں سے ایک تھا۔ اس کو ورلڈ فوڈ پروگرام کے تحت بہت سی کھانے پینے کی اشیا بھجوائی گئیں۔ سری لنکا کے لوگوں کا گذارا زیادہ تر ماہی گیری پر تھا۔ اس ملک میں 80 فی صد ماہی گیری کی کشتیاں سونامی کی لہروں نے تباہ کر ڈالیں تھیں۔ اگرچہ اس ملک کو بھی بھرپور امداد دی گئی مگر اس کے باوجود 50 کیس ایسے سامنے آئے جن میں سری لنکا کے ماہی گیروں کی بیویاں اپنے خاوندوں کو برسر روزگار کرنے کے لیے اپنے گردے تک بیچتی ہوئی پائیں گئیں وہ صرف 600 پاؤنڈ کی حقیر سی رقم کے لیے۔

2005ء ..... ہری کین کیٹرینہ۔

ہری کین کیٹرینہ Hurricane katrina امریکہ کی تاریخ کا سب سے ہولناک اور مہنگا ترین ہری کین تھا اور بحر اقیانوس سے اٹھنے والا چھٹا شدید ترین سمندری طوفان تھا۔ اور امریکی سرزمین پر آنے والا تیسرا بڑا طوفان تھا۔ یہ طوفان اگست 2005ء کے آخری حصے میں آیا تھا۔ اور اس خلیج کے امریکی ساحلی علاقوں میں شدید تباہی مچائی تھی۔ اس طوفان سے نیو اورلین اور لوئزیانہ میں جو تباہی مچی تھی اسے میڈیا نے انتہائی توجہ سے کورCover کیا تھا۔ اس طوفان سے پیدا ہونے والی حس سمندری موج نے نیو اورلین پر حملہ کیا تھا وہ 27 فٹ بلند تھی۔ اس موج سے شہر کو سیلاب سے بچانے والے حفاظتی پشتے بہہ گئے تھے جن کے بعد ایک قریبی جھیل کا پانی اس شہر میں داخل ہوگیا اور یہ شہر ڈوب کر رہ گیا۔

کیٹرینہ گیارہوں ایسا طوفان تھا جسے کوئی نام دیا گیا تھا۔ یہ طوفان بحراوقیانوس میں جزائر بہاماس کے قریب 23 اگست کو پیدا ہوا تھا اور اس نے کیٹیگری نمبر 1 کے ہری کین کی حیثیت سے جنوبی فلوریڈا کو عبور کیا اور پھر خلیج میکسیکو پر سے گذرتے ہوئے یہ اب تک آنے والے تمام طوفانوں سے شدید طوفان کی شکل اختیار کرگیا، تاہم 29 اگست کی صبح کو جب یہ طوفان نیو اورلین کے قریب زمین پر اترا تو کمزور پڑ کر کیٹگری 3 کا طوفان بن چکا تھا۔اس طوفان سے پیدا ہونے والے سمندری تلاطم نے الباما، مسسپی اور لوئزیانہ کے علاقوں میں شدید تباہی مچائی اور بہت سے شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جو حفاظتی پشتے نیو اور لینز کی جھیل پونٹ چارٹین Pontchartnn کے پانی سے حفاظت کے لیے تعمیر کیے گئے تھے انہیں طوفانی موجوں نے کھوکھلا کر دیا جس کے نتیجے میں اس شہر کا 80 فی صد حصہ اور اس کے مضافاتی علاقے اس جھیل کے سیلابی پانی میں ڈوب گئے۔

یہ ہری کین اگست کے تیسرے ہفتے میں جزائر بہاماس کے قریب بحراوقیانوس میں پیدا ہوا تھا اور اگلے سات دنوں میں اس نے ایک ٹروپیکل طوفان سے تباہ کن ہری کین کی شکل اختیار کرلی۔ پہلے یہ فلوریڈا کے علاقے میں زمین پر اترا اور پھر اس نے لوئزیانہ، البامہ اور مسسپی کے خلیجی ساحلی علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ان علاقوں میں اپنے پیچھے طوفانی تباہی کے اثرات چھوڑ گیا۔ جو چیز بھی اس کے راستے میں آئی یہ اسے تباہ و برباد کرتا چلا گیا۔ تاریخی شہر نیو اورلینیز اس کی وجہ سے سیلاب میں گھر گیا

جس کے نتیجے میں 1300 افراد ہلاک ہوگئے۔ اتنے شدید جانی و مالی نقصانات کی وجہ سے یہ امریکہ کی تاریخ کا بدترین ہری کین ثابت ہوا۔ اسی سے پیدا ہونے والے سمندری تلاطم سے 27 فٹ بلند امواج پیدا ہوئیں جنہوں نے نیو اورلینز کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس نے وہ حفاظتی پشتے تباہ کر دیئے جو اس شہر کو ایک قریبی جھیل کے پانیوں سے بچانے کے لیے تعمیر کئے گئے تھے۔ اس شہر کا بڑا حصہ سطح سمندر سے نیچا تھا اس لیے جھیل کے پانی میں ڈوب گیا۔

اگرچہ امریکہ کی دیگر ریاستیں، فلوریڈا، البامہ اور لوئزیانہ اس ہری کین سے شدید طور پر متاثر ہوئیں تھیں مگر سب سے زیادہ نقصان نیو اورلینز کو پہنچا۔ اس شہر کی آبادی 10 لاکھ نفوس پر مشتمل تھی اور یہ اس علاقے کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اس کے حفاظتی پشتے تباہ ہونے کے بعد یہ شہر ایک بڑی جھیل کا منظر پیش کر رہا تھا اور اس کی شاہراہوں پر کشتیوں کے ذریعے سفر کیا جارہا تھا۔ اس سیلاب کی وجہ سے شہر کے ذرائع مواصلات، ٹیلی فون اور بجلی سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ 27 فٹ بلند سمندری لہروں کے حملہ آور ہونے کی وجہ سے حفاظتی پشتے سمندری پانی میں بہہ گئے۔ یہ پشتے اتنی بلند امواج کا مقابلہ کرنے کے لیے تعمیر نہیں کئے گئے تھے اس وجہ سے تباہ ہوگئے جس کے بعد سیلابی ریلوں نے شہر کو برباد کر کے رکھ دیا۔ یہ شہر شکاگو کی آگ سے تباہی اور سان فرانسسکو کی 1906ء کے زلزلے کی وجہ سے تباہی سے بھی زیادہ متاثر ہوا۔

جیسے ہی ہری کین کیٹرینہ اس علاقے سے گذر کر خلیج میکسیکو میں داخل ہو کر شمال کی طرف مڑا، امریکہ کی وفاقی حکومت نے اس شہر کے متاثرین کے لیے خوراک اور پانی کی فراہمی کا انتظام وسیع پیمانے پر کر دیا۔ اور وسیع پیمانے پر امدادی کاروائیاں شروع ہوگئیں۔

2005ء..... پاکستان میں آنے والا تباہ کن زلزلہ

8 اکتوبر 2005ء کو صبح 8 بج کر 52 منٹ پر پاکستان کے بڑے حصے میں ایک ہولناک زلزلے نے تباہی مچا دی۔ اسلام آباد آزاد کشمیر، پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں اس قیامت خیز زلزلے نے قیامت صغریٰ بپا کردی۔ یہ زلزلہ ریکٹر اسکیل پر میگنی چیوڈ 7.6 درجے کا تھا۔ اس کا دورانیہ 6 منٹ اور 8 سیکنڈ تھا۔ ان ہولناک منٹوں میں زلزلے کے چار بڑے جھٹکے محسوس کیے گئے جو اتنے تباہ کن تھے کہ 2004ء میں آنے والے بحر ہند کے سونامی کی تباہی بھی پیچھے رہ گئی اور اس زلزلے نے اتنی تباہ کاری مچائی کہ پاکستانی قوم سوگ اور صدمے میں ڈوب گئی۔ اس سوگ اور صدمے میں عالمی برادری نے پاکستانی قوم کا ساتھ دیا اور بھرپور مالی امداد بھجوائی۔ سربراہان عالم نے پاکستان کی اس قدرتی آفت پر افسوس اور یک جہتی کا اظہار کیا۔ عالمی مالیاتی اداروں اور اسلامی ممالک نے خصوصی طور پر برادر ملک پاکستان کو فوری طور پر مدد فراہم کی تاہم مالی نقصان امداد سے کہیں زیادہ تھا، آبادیوں کی آبادیاں ملبے کا ڈھیر بن گئیں تھیں۔ 38000 مربع میل کا علاقہ تباہ کاری کی زد میں آ گیا تھا۔

حکومت پاکستان نے اس زلزلے کی تباہ کاریوں کے متعلق جو اعداد و شمار عالمی ڈونرز کانفرنس میں پیش کیے ان کے مطابق صوبہ سرحد (پختونخواہ) میں 413 کلومیٹر طویل شاہراہیں اور آزاد کشمیر میں 398 کلومیٹر طویل سڑکوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ آزاد کشمیر میں 3924 اسکول و کالج اور صوبہ سرحد میں 2159 تعلیمی اداروں کی عمارات منہدم ہوگئیں تھیں۔ آزاد کشمیر میں 5552 اور سرحد میں 1715 طلبہ و طالبات عمارتی ملبے کے نیچے دب کر جاں بحق ہوگئے تھے۔ طلبا و طالبات کے ساتھ 858 اساتذہ بھی اس قدرتی آفت کی نذر ہوگئے تھے۔ آزاد کشمیر یونیورسٹی میں جاں بحق ہونے والے طلبا کی تعداد 200 تھی جبکہ 4 اساتذہ بھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مجموعی طور پر 4 لاکھ 72 ہزار 383 مکانات و عمارات صفحہ ہستی سے مٹ گئے تھے۔ ان میں سے 230770 کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا جبکہ 241613 مکانات آزاد کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ صوبہ سرحد کے 110 ہسپتالوں اور بنیادی صحت کے مراکز کو اور آزاد کشمیر کے 264 بنیادی صحت کے اداروں کو شدید نقصان پہنچا تھا یا وہ زمین بوس ہوگئے تھے۔ 86 ٹیلی فون ایکسچینج اور 33225 ٹیلی فون لائنیں تباہ ہوگئیں تھیں۔ آزاد کشمیر میں ہونے والے جانی نقصانات کی

تعداد 43363 افراد تھی جبکہ صوبہ سرحد میں 29360 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ مجموعی طور پر 35 لاکھ افراد اس زلزلے سے متاثر ہوئے تھے جبکہ 5 لاکھ خاندان بے خانماں ہوگئے تھے۔ زخمیوں کی تعداد 128167 بتائی گئی تھی اس قدرتی آفت سے جہاں شہریوں کو جانی و مالی نقصان پہنچا وہیں اس کی لپیٹ میں آکر 456 فوجی شہید اور 766 زخمی ہوئے۔ اس طرح زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں بچا جہاں جانی و مالی نقصان نہیں ہوا ہو، تاہم مندرجہ بالا تمام اعداد و شمار سرکاری ہیں جبکہ غیر سرکاری طور پر عالمی اداروں نے جو اعداد و شمار مرتب کئے وہ ان سے کہیں زیادہ تھے اور گھمبیر صورتحال کو واضح کرتے تھے۔ اقوام متحدہ کے مرتب کردہ اعداد و شمار کے مطابق اس قدرتی آفت سے 2004ء میں آنے والے سونامی سے زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا تھا اور ہلاکتوں کا اندازہ دو لاکھ افراد تھا، جبکہ 50 لاکھ سے زائد افراد اس آفت سے بری طرح متاثر اور بے گھر ہوگئے تھے۔ پاکستان کے زلزلے سے متاثر علاقوں میں اکتوبر کے فوراً بعد جب موسم سرما شروع ہوا تو وہ مزید تباہی کا پیغام لایا۔ عالمی امداد کے ناکافی ہونے اور ملکی وسائل کے محدود ہونے کی وجہ متاثرین زلزلہ کو غذا، ادویات اور دیگر ضروریات زندگی کی کمیابی کا سامنا کرنا پڑا جس سے ان علاقوں میں مزید 10 لاکھ سے زائد انسانی زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں۔ یونیسف کی مرتب کردہ رپورٹ کے مطابق زلزلے میں ہلاک ہونیوالوں میں 20 ہزار سے زائد بچے بھی شامل تھے۔ انسانی حقوق کی علمبردار ملکی و غیر ملکی تنظیموں نے یہ خطرہ بھی ظاہر کیا کہ متاثر علاقوں میں جو بچے زندہ بچے ہیں ان کے بھکاری بن جانے کا اغلب امکان ہے۔ ان تمام حقائق کے باوجود اور اسلامی ممالک اور دیگر ممالک کی طرف سے بھیجی جانے والی امداد کے باوجود متاثرین کی بحالی کا کام غیر تسلی بخش طور پر ہوا دوسری طرف انسانیت کے علمبردار مغربی ممالک نے بھی اس پیمانے پر پاکستانی قوم کی مدد نہیں کی جس پیمانے پر سونامی سے متاثر ہونے والی اقوام کی تھی۔

2006ء..... تائیوان میں آنے والا شدید زلزلہ

26 دسمبر 2006ء کو تائیوان میں ریکٹر اسکیل پر 7.1 پوائنٹ درجے کا زلزلہ آیا۔ اس زلزلے کا مرکز Epicenter جزیرہ تائیوان سے پندرہ میل جنوب مغرب میں زیر آب واقع تھا۔ یہ زلزلہ چین کے جنوبی سمندر میں چودہ میل کی گہرائی پر آیا تھا اس زلزلے سے جہاں بہت سی اموات واقع ہوئیں اور عمارات کو نقصان پہنچا وہیں اس کی وجہ سے سمندر میں کئی زیر آب کیبل بھی ٹوٹ گئے جس سے براعظم ایشیا کے کئی حصوں میں ٹیلی کمیونیکیشن منقطع ہوگئیں۔ یہ اتفاقاً 2004 میں بحر ہند میں آنے والے زلزلے اور سونامی کی سالانہ برسی کے دن آیا تھا جس سے جنوب مشرقی اور جنوبی ایشیا کی ساحلی آبادیوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا ایسا ہی اتفاق اس زلزلے اور 2003 میں آنے والے ایران کے زلزلے میں پایا جاتا تھا۔ اس زلزلے نے جنوبی ایران کے شہر بم کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

اس زلزلے کے نتیجے میں نیوز ایجنسیوں کی رپورٹ کے مطابق جنوبی تائیوان میں بہت سے گھر زمین بوس ہوگئے اور بہت سی عمارات میں آگ لگ گئی تھی۔ ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے مہمان بجلی کا نظام درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ایلی ویٹرز (لفٹ) میں پھنس کر رہ گئے۔ ٹیلی فون لائنز کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے ٹیلی فون کا نظام بھی درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ تاہم جانی نقصان بہت کم ہوا تھا اور صرف دو افراد ہلاک اور 42 افراد زخمی ہوئے تھے یہ زلزلہ پورے تائیوان کے طول و عرض میں محسوس کیا گیا تھا۔ اور دارالحکومت ٹیپی بھی اس زلزلے سے متاثر ہوا تھا۔ اگرچہ ٹیپی زلزلے کے مرکز سے 300 میل دور واقع تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کے 3000 گھروں میں بجلی معطل ہوگئی، تاہم بجلی کے نظام کو صرف ایک دن بعد بحال کر دیا گیا۔ ایک ایٹمی پاور پلانٹ اس زلزلے کے شدید جھٹکوں کی وجہ سے متاثر ہوا تھا تاہم اسی ہنگامی صورتحال پر قابو پا لیا گیا اور تابکاری کو پھیلنے سے روک دیا گیا۔ ہانگ کانگ کے باشندے بھی اس زلزلے سے اتنے خوفزدہ ہوئے کہ بڑی تعداد میں عمارتوں کو چھوڑ کر شاہراہوں اور گلیوں میں نکل آئے تاکہ اگر ان کی رہائشی عمارات اس زلزلے سے زمین بوس ہونے لگیں تو جانی نقصان کم ہو ان کے نزدیک یہ زلزلہ قریبی علاقے میکاؤ میں آیا تھا۔ چین کی سرزمین پر اس زلزلے کو دو صوبوں گونگ ڈونگ Guangdong اور فیوجیان Fujian میں محسوس کیا گیا۔ مگر ان علاقوں میں کسی بڑے نقصان کی

ع نہیں ملی۔

سماٹرا میں آنے والے دسمبر 2004 کے زلزلے اور اس سے پیدا ہونے والے سونامی جیسے خطرات سے خبردار ہونے کی وجہ سے تائیوانی حکام نے سونامی سے بچنے کے وارننگ زلزلے کے فوراً بعد جاری کر دی تاہم سونامی تائیوان کے زلزلے کے بعد پیدا نہیں ہوئی تاہم سمندر میں زیر آب ٹیلی کمیونیکیشن کیبلز کو شدید نقصان پہنچا جس کے بعد تائیوان کی سب سے بڑی ٹیلی کمیونیکیشن کمپنی کو اعلان کرنا پڑا کہ ملائیشیا، سنگاپور تھائی لینڈ اور ہانگ کانگ سے 98 فی صد رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔ اور اس کو بحال کرنے میں تین ہفتے کا وقت لگے گا۔

تائیوان جغرافیائی طور پر اس علاقے میں واقع ہے جہاں اکثر زیادہ زلزلے آتے ہیں۔ 1999ء کے ستمبر میں آنے والے زلزلے میں 2000 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ 2015ء میں تائیوان میں ایک شدید زلزلہ آیا تھا۔ 2006ء میں آنے والے اس زلزلے کے جھٹکے پورے تائیوان میں محسوس کئے گئے تھے۔ ایک اخباری رپورٹر ہوٹل کے جس کمرے میں ٹیپی میں ٹھہرا ہوا تھا وہ کمرہ بری طرح ہلنے لگا تھا اور خود ہوٹل کی عمارت پندرہ سیکنڈ تک چوں چوں کرتی رہی تھی۔ دارالحکومت کی بہت سی شاہراہوں میں دراڑیں پڑ گئیں تھیں جبکہ بہت سے بڑے پلوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ شہر میں کئی مقامات پر آگ بھڑک اٹھی تھی جو بجلی کی زیریں لائنوں کی وجہ سے لگی تھی۔ بہت سی عمارتوں میں زلزلے کی وجہ سے ان میں رکھی ہوئی الماریوں سے سامان نیچے آ گرا تھا۔

تائیوان کے بہت سے جنوبی شہروں میں بجلی فیل ہوگئی تھی اور رہائشی عمارتوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ ایک ہوٹل کی عمارت اس بری طرح لرزی تھی کہ اس کے بہت سے مکین خوفزدہ ہو کر سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ تائیوان کے قومی ٹیلی ویژن کی نشریات میں دکھایا گیا کہ ساحلی مقامات پر عمارتوں کے ملبے میں پھنسے ہوئے افراد کو امدادی جماعتیں ملبے کو ہٹا کر نکال رہی تھیں۔ بہرحال اس زلزلے سے سب سے زیادہ نقصان زیر آب ٹیلی کمیونیکیشن کے کیبل کو پہنچا تھا جس سے تائیوان کا ایشیا بھر سے رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔ چائنا کمیونیکیشن گروپ نے بتایا تھا کہ یورپ اور امریکہ سے بھی رابطہ منقطع ہوگیا ہے اور انٹرنیٹ کنکشن بھی منقطع ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ چین اور جنوبی کوریا میں بھی اس زلزلے میں ٹیلی کمیونیکیشن کو شدید نقصان پہنچا تھا۔

2007ء.....گرین برگ، کنساس امریکہ میں آنے والا ٹورنیڈو

امریکہ میں 1999ء کے بعد آنے والے پہلے EF5 ٹورنیڈو نے گرین برگ کا قصبہ مکمل طور پر تباہ کر دیا یہ قصبہ جنوب مغربی کنساس میں واقع ہے، یہ ٹورنیڈو 4 مئی 2007ء کو آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس علاقے میں شدید بارشوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا اور یہاں کے ندی نالوں میں بھی سیلاب آ گیا تھا۔ محکمہ موسمیات کی رپورٹ کے مطابق گرین برگ کو ٹورنیڈو کی آمد کے بعد خالی کروالیا گیا تھا اور قصبہ کئی دن تک بند بھی رہا تھا۔ کنساس کے ٹرانسپورٹ کے محکمے کے ایک ترجمان کے مطابق گرین برگ کو دوسرے علاقوں سے ملانے والی امریکی شاہراہ 54 کو شدید نقصان پہنچا تھا اور اسے دوبارہ ایک ہفتے بعد کھولا گیا تھا۔ اس طوفان سے تقریباً 85 میل تک کا راستہ خراب ہوگیا تھا۔ نیشنل ویدر سروس نے بعد ازاں بتایا کہ جمعہ 4 مئی کو رات 9:45 منٹ پر جس ٹورنیڈو نے گرین برگ کو گھیر لیا تھا وہ ایک F5 طاقت کا ٹورنیڈو تھا۔ اس کے ساتھ 205 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوائیں چل رہی تھیں۔ یہ ٹورینڈو زمین پر تقریباً آدھ گھنٹہ تک رہا اس دوران اس نے 22 میل کا سفر کیا اور اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو تباہ کر دیا۔ 95 فی صد گرین برگ کا قصبہ تباہ و برباد ہوگیا۔ عمارتوں کی چھتیں اور دیواریں ان سے اس ٹورنیڈو نے اس طرح غائب کر دیں جیسے کوئی غیبی طاقت انہیں اڑا کر لے گئی ہو۔

امریکہ کے محکمہ موسمیات نے اس ٹورنیڈو کی آمد سے تقریباً 39 منٹ پہلے اس 1.7 میل چوڑے ٹورنیڈو کی آمد کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ اس کے علاوہ ڈوج سٹی Dodge کے موسمیاتی مرکز نے 10 سے 12 منٹ پہلے ٹورنیڈو سے نمٹنے کے لیے ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس ٹوئسٹر کے F5 طاقت کا طوفان ہونے کی تصدیق کر دی گئی جس کے ساتھ چلنے والی ہوائیں 205 میل فی گھنٹہ کی رفتار تک ہوسکتی تھیں۔

ریاست کنساس کے دیگر علاقوں کی طرح گرین برگ بھی شدید بگولہ دار طوفانوں سے آشنا علاقہ ہے تاہم 2007ء میں آنے والے اس طوفان سے کئی سال پہلے تک یہاں اس شدت کا کوئی طوفان نہیں آیا تھا۔ شاید اس وجہ سے اس قصبہ کو جوڈی گارلینڈ کی فلم The wizardofooz میں مرکزی مقام کے طور پر دکھایا گیا تھا۔ یہ قصبہ ریاست کنساس کے جنوب مغربی حصے میں اوکلاہاما کے باڈر سے 50 میل شمال میں

واقع یہاں تقریباً 1500 افراد رہتے تھے۔ اتنی سی آبادی رکھنے والے قصبے میں اس طوفان سے ہونے والی ہلاکتیں کافی اہم تھیں۔ جبکہ اس قصبے کے مضافات میں بھی دواموات واقع ہوئی تھیں۔ اس طوفان کے بعد وفاقی حکومت نے اس قصبے کو ایک طوفان زدہ اور مصیبت زدہ علاقہ قرار دے دیا تھا اور مالی امداد فراہم کی تھیں اور اس وقت کے امریکی صدر بش نے اس علاقے کا فوری طور پر دورہ کیا تھا۔

Noaa امریکی حکومت کے کام میں ڈیپارٹمنٹ کی ایک ایجنسی ہے جو 200 سال سے امریکہ میں موسمیاتی پیشین گوئیاں کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارے کو 1807ء میں امریکی صدر تھامس جیفرسن نے موسمیاتی پیشین گوئیوں کا کام سپرد کیا تھا۔

2008ء..... کے ٹو، کا حادثہ

یکم اگست 2008 کو 11 کوہ پیماؤں کی ایک جماعت جس کا تعلق غیر ممالک سے تھا پاکستان میں واقع دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی k.2 پر کوہ پیمائی کی ایک مہم کے دوران ہلاک ہوگئی۔ جبکہ تین افراد شدید زخمی ہوئے۔ k.2 دنیا کا دوسرا بلند ترین پہاڑ ہے جبکہ پہلے نمبر پر نیپال میں واقع ماؤنٹ ایورسٹ آتا ہے۔ k.2 کی بلندی 8611 میٹر (2.51، 28فٹ) ہے۔ یہ قراقرم کے کوہستانی سلسلہ میں واقع ہے جو ہمالیہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر واقع نہیں ہے۔ یہ پاکستان کے گلگت بلتستان کے علاقے میں چین کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ اسے کوہ پیما ایورسٹ سے زیادہ دشوار کن چوٹی قرار دیتے ہیں۔ اور یہ دنیا کا دوسرا خطرناک ترین پہاڑ بھی کہلاتا ہے۔ اس چوٹی کا وہ حصہ جو Bottleneck کہلاتا ہے۔ کوہ پیمائی کی تاریخ میں سب سے خطرناک اور دشوار کن حصہ ہے۔

جولائی کے مہینے میں اس چوٹی کو سر کرنے کے لیے سال کا سب سے بہتر موسم ہوتا ہے۔ 31 جولائی 2008ء کو کوہ پیماؤں کے کئی گروپ کیمپ IV پر چوٹی سر کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ان گروپوں میں امریکی، فرانسیسی، ناروئین، جنوبی کوریائی شامل تھے۔ ان کے ساتھ نیپال سے آئے ہوئے شرپا بھی تھے جو کوہ پیمائی میں معاون ہوتے ہیں۔ ایک بین الاقوامی کوہ پیما جماعت کو ایک ڈچ کمپنی Norit نے سپانسر کیا تھا۔ اس کوہ پیما جماعتوں کے ہمراہ پاکستانی کوہ پیماؤں نے یکم اگست کو ایک مشترکہ مہم سر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس میں کچھ ہسپانوی اور اطالوی کوہ پیما بھی شامل ہوگئے تھے۔

پاکستانی کوہ پیما قلیوں High altitud porter اور شرپاؤں نے جمعہ یکم اگست کو آدھی رات کے بعد Fixed lines تیار کرنا شروع کر دیں تھیں۔ ان کے ساتھ ایک تنہا ہسپانوی کوہ پیما البرٹو زیرین Alberto zerain بھی کام میں شامل تھا۔ یہ ہسپانوی کوہ پیما کیمپ 3 سے اسی رات یہاں پہنچا تھا۔ اسی دوران پاکستانی قلیوں میں سے شاہین بیگ کو بلندی کی بیماری کی علامات کی وجہ سے واپس کیمپ بھیج دینا پڑا۔

رات 3 بجے کے بعد جب کوہ پیماؤں نے پہاڑ کو سر کرنا شروع کیا تو پاکستانی HAPS اور نیپالی شرپا بھی ان کے اوپر لائنیں بچھانے میں مصروف ہوگئے۔ یہ لوگ آخر K.2 کے سب سے خطرناک

Bottleneck تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جیسے ہی یہ بوٹل نیک پہنچے ایک کوہ پیما پہاڑ سے نیچے گر کر
ک ہوگیا۔

2 اگست کو صبح 8 بجے کوہ پیماؤں کی یہ جماعت بوٹل نیک والے حصے پر چڑھ رہی تھی کہ سربیائی کوہ پیما
ارین مینڈک نے اپنی کوہ پیمائی کی رسیاں الگ کر کے دوسرے کوہ پیماؤں کو راستہ دینے کا فیصلہ کیا مگر وہ
پنی کوہ پیمائی کی رسیاں کھولنے کے فوراً بعد اپنا توازن کھو بیٹھا اور بوٹل نیک میں 320 فٹ نیچے جا گرا اور
وری چل بسا۔ امدادی جماعت نے وہاں پہنچ کر موقع پر اسے مردہ پایا۔ اس حادثے کے بعد جو پہلا کوہ
یما دوپہر تین بجے تک K.2 کی چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہوا وہ ہسپانوی کوہ پیما رابرٹو زیرین تھا۔ وہ بغیر
کسی پریشانی کے بوٹل نیک سے گذر کر چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔

البرٹو کے چوٹی پر پہنچنے کے دو گھنٹے بعد پہاڑ کی چوٹی کے نزدیک سے گلیشیائی برف کا ایک بڑا ٹکڑا
علیحدہ ہو کر کسی ایوا لانچ کی طرح نیچے گرا اور کوہ پیمائی کی لائنز توڑتا چلا گیا۔ اسی طرح کے دو مزید برفانی
ٹکڑے گرنے سے کوہ پیماؤں کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح ایوا لانچ گرنے سے بالاخر 11
کوہ پیماؤں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی جبکہ صرف دو ڈچ کوہ پیماؤں کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے بچایا جاسکا11
ہلاک ہونے والے کوہ پیماؤں میں پاکستانی محکمہ سیاحت کے مطابق تین کوریائی کوہ پیما، دو نیپالی، دو پاکستانی
اور فرانسیسی اور ناروئین کوہ پیما شامل تھے۔ یہ K.2 پر ہلاک ہونے والوں (کسی ایک مہم میں) کی سب
سے بڑی تعداد تھی۔

2009ء..... اٹلی میں لا اقیلا کا ہولناک زلزلہ

2009ء میں وسطی اٹلی کے علاقے ابروز وریجن Abruzzo regin میں 6 اپریل کو ریکٹر اسکیل 5.8 اور 5.9 درجے کا شدید زلزلہ آیا۔ اس زلزلے کا مرکز Epicenter ابروزو کے دارالحکومت لا L'Aquila کے نزدیک واقع تھا۔ اس زلزلے کا سب سے بڑا جھٹکا صبح 03:32 منٹ پر محسوس کیا تھا۔ اس زلزلے سے سب سے زیادہ نقصانات بھی لا اقیلا اور اس کے مضافات میں رونما ہوئے۔ اس علاقے میں دسمبر 2008 کے بعد سے زلزلے کے ہزاروں جھٹکے محسوس کیے گئے تھے۔ جن میں سے کم از کم 8 جھٹکے ریکٹر اسکیل پر 3.5 درجے کے تھے۔

یہ زلزلہ اٹلی کے پورے وسطی علاقوں میں محسوس کیا گیا اور اس سے 308 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ یاد رہے کہ یہ 1980ء کے بعد اٹلی میں آنے والا سب سے ہولناک زلزلہ تھا۔ اس زلزلے کے بعد کی جانے والی انکوائری سے انکشاف ہوا کہ موسمیاتی پیشین گوئیاں کرنے والے قومی کمیشن کے 7 ارکان کو ناکافی اور نامکمل معلومات بہم پہنچانے کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ 22 اکتوبر 2012 میں ان لوگوں کو اس زلزلے کا شکار ہو کر مرنے والے افراد کا قاتل گردانا گیا اور 10 نومبر 2014 کو کچھ اطالوی سائنسدانوں کو غلط پیشین گوئیاں کرنے کا مجرم قرار دیا گیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ کیلی فورنیا میں آنے والے ریکٹر اسکیل پر اسی درجے کے زلزلے سے ایک فرد بھی ہلاک نہیں ہوا تھا۔

اس زلزلے کی آمد کا سبب سائنسدانوں نے مرکزی اٹلی کے علاقے میں ارضیاتی پرتوں کے متحرک ہونے کو قرار دیا تھا یہ زلزلہ زیر زمین انتہائی کم گہرائی پر یعنی صرف 5.88 میل کی گہرائی پر روم سے 60 میل دور واقع قصبے لا اقیلا کے نزدیک آیا تھا۔ اس زلزلے کے دوران عجیب وغریب روشنیاں دیکھنے میں آئیں تھیں۔ اٹلی دنیا کا وہ علاقہ ہے جہاں اکثر و بیشتر زلزلے آتے رہتے ہیں۔ تاہم یہاں ہولناک اور انتہائی زلزلے بہت کم آتے ہیں۔ یہاں آنے والا آخری زلزلہ مولیس Molise کے علاقے کا زلزلہ تھا جس میں 30 افراد کی موت واقع ہوئی تھی۔ یہ زلزلہ ری ایکٹر اسکیل پر 5.9 درجے کا تھا۔ موجودہ زلزلے کا مرکز لا اقیلا شہر ایک قدیم خشک جھیل کی تہہ میں تعمیر کیا گیا تھا اور یہاں 1315، 1349، 1452، 1501، 1646، 1703، 1706 اور 1959 میں بھی زلزلے آنے کا ریکارڈ تھا۔ 1703ء میں آنے

والے زلزلے نے وسطی اٹلی کے بیشتر علاقوں کو نقصان پہنچایا تھا اور اس زلزلے میں لا اقیلا کا شہر بھی مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا جبکہ 5000 کے قریب افراد جاں بحق ہوگئے تھے۔

موجودہ زلزلے نے بھی ازمنہ وسطی کے اس قدیم شہر کو شدید نقصان پہنچایا اور 3000 سے 11000 عمارات کو نقصان پہنچا اور کئی عمارات زمین بوس ہوگئیں۔ اس زلزلے میں ہلاک شدگان کی تعداد 297 افراد تھی۔ ان میں ایک یونانی دو مقدونین اور دو چیک قومیت کے لوگ بھی شامل تھے جبکہ 2 فلسطینی اور 5 رومانیہ کے شہری بھی مارے گئے تھے۔ ایک فرانسیسی اور ایک یوکرینی اور ایک اسرائیلی بھی مرنے والوں میں شامل تھا۔ 1500 کے لگ بھگ لوگ زخمی ہوئے تھے۔ اس زلزلے کا شکار ہونے والوں میں 20 بچے بھی شامل تھے۔ بے گھر ہونیوالوں کی تعداد 65000 بتائی گئی تھی۔ زلزلے کے بڑے جھٹکوں کی آمد کے اگلے دن بھی چند چھوٹے جھٹکے محسوس کیے گئے تھے۔ سب سے زیادہ نقصانات بھی لا اقیلا شہر میں ہوئے تھے جبکہ اس شہر کے نزدیک واقع گاؤں پیگانیکا Paganica بھی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔

لا اقیلا شہر کی بہت سی ازمنہ وسطیٰ سے تعلق رکھنے والی عمارات کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ اس شہر کے ایک قدیم گرجا گھر Bernardo, Basilica of saint کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ یہ قدیم گرجا گھر زمانہ احیا العلوم Renassance سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی طرح 18 ویں صدی سے تعلق رکھنے والے گرجا گھر کا گنبد بھی اس زلزلے کا شکار ہوگیا تھا۔

جہاں لا اقیلا کی قدیم عمارات کو شدید نقصان پہنچا تھا وہیں اس شہر کی جدید عمارات بھی اس زلزلے کا شکار ہوئیں تھیں۔ مثال کے طور پر لا اقیلا کی یونیورسٹی کی اقامت گاہ زمین بوس ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ کئی ایسی عمارات کو بھی جو زلزلہ پروف کہلاتی تھیں شدید نقصان پہنچا تھا۔

40000 افراد جو اس زلزلے سے بے گھر ہوگئے تھے انہیں کیمپوں میں پناہ لینا پڑی تھی جبکہ بے گھر ہونے والے 10 ہزار افراد نے ساحلی مقامات پر واقع ہوٹلوں میں اقامت اختیار کی تھی۔ بہت سے دیگر بے گھر افراد اپنے عزیز و اقرباء کے ہاں قیام پذیر ہوگئے تھے۔

2010ء..... پاکستان میں آنے والے قیامت خیز سیلاب

پاکستان میں ان قیامت خیز سیلابوں کا آغاز جولائی میں ہوا تھا۔ یہ سیلاب مون سون کی شدید بارشوں کی وجہ سے خیبر پختونخواہ (صوبہ سرحد) سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے صوبوں میں آئے تھے۔ ان سیلابوں کی وجہ سے پاکستان کے کل رقبے کا تقریباً پانچواں حصہ متاثر ہوا تھا۔ پاکستان کی حکومت کی طرف سے فراہم کردہ معلومات Data کے مطابق ان سیلابوں سے پاکستان کے 4 کروڑ افراد متاثر ہوئے تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگ جائداد کے نقصانات، جانی نقصانات انفرا سٹرکچر کی تباہی اور دیگر بے اندازہ نقصانات کا شکار ہوئے تھے۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے پہلے پہل پاکستان کے لیے 460 ملین امریکی ڈالر کی امداد طلب کی تھی جو ہنگامی حالات میں لوگوں کی بحالی کے لیے خرچ کیا جانا تھی۔ بانکی مون کے الفاظ میں اس نے اپنی زندگی میں اس سے بڑی قدرتی آفت کہیں نہیں دیکھی تھی۔ تاہم اس کی درخواست پر مطلوبہ رقم کا صرف 20 فی صد 15 اگست 2010 تک وصول ہوا تھا۔ اقوام متحدہ کے مطابق امداد تیزی سے وصول نہیں ہو رہی تھی جبکہ اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق پاکستان میں سیلاب کے بعد تقریباً 2 کروڑ افراد غیر صاف شدہ پانی پینے پر مجبور تھے۔ پاکستان کی معیشت کو انفراسٹرکچر اور کھیتوں میں کھڑی فصلوں کی تباہی سے سخت دھچکا پہنچا تھا۔ انفراسٹرکچر کو پہنچنے والے نقصانات کا اندازہ تقریباً 4 بلین امریکی ڈالر بتایا گیا تھا۔ جبکہ مکمل طور پر پاکستانی معیشت 43 بلین امریکی ڈالر کے نقصانات کا شکار ہوئی تھی۔ ان قیامت خیز سیلابوں کی آمد کا سبب 2010ء میں ہونے والی شدید بارشیں تھیں۔ امریکہ کے خلائی ادارے ناسا نے لانینا Lanina کے تحت ہونے والی بارشوں کا جو نقشہ جاری کیا تھا اس میں مون سون کے شدید بارشیں دکھائی گئیں تھیں۔ 21 جون 2010ء کو پاکستان کے محکمہ موسمیات نے پیشین گوئی کی تھی کہ جولائی سے ستمبر 2010ء میں پاکستان کے شمالی علاقوں کے شہروں میں سیلاب کے پانی کے ریلے داخل ہونے کا خطرہ ہے۔ پاکستان کے محکمہ موسمیات نے جولائی اور اگست کے مہینوں میں سالانہ اوسط سے کہیں زیادہ بارشیں ریکارڈ کی تھیں جس سے دریاؤں اور ندی نالوں میں پانی کی سطح 1988، 1995 اور 1998ء میں آنے والے سیلابوں سے کہیں زیادہ بلند ہوگئی تھیں۔ 1994ء کے بعد

ریکارڈ کی گئیں تھیں جو گذشتہ 80 سال میں سب سے
ا تھیں۔

پاکستان میں 1973ء اور 1976ء میں دریائے سندھ میں آنے والے شدید سیلابوں کا مقابلہ
کرنے کے لیے پاکستان فیڈرل فلڈ Flood کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس نے گذشتہ سالوں میں سیلاب
کے بچنے کے لیے 900 ملین ڈالر کی امداد سے حفاظتی پشتے وغیرہ تعمیر کئے تھے۔ تاہم یہ پروٹیکشن 2010
کے سیلاب کے سامنے ناکافی اور غیر موثر ثابت ہوئے۔

مون سون کی بارشوں کے اگست کے پہلے ہفتے میں شروع ہونے کی پیشین گوئی کی گئی تھی جو گذشتہ
واع سال میں ہونے والی سب سے زیادہ بارشیں ثابت ہوئیں۔ 24 گھنٹے میں خیبر پختونخواہ میں 200 ملی
میٹر (7.9) اور پنجاب میں 274 ملی میٹر 10.87 انچ) بارش کا تھا۔ 30 جولائی تک تقریباً 5 لاکھ افراد
ان بارشوں کی وجہ سے اپنے گھر چھوڑ دینے پر مجبور ہوگئے۔ اقوام متحدہ کے مطابق خیبر پختونخواہ کے 36
ضلعوں میں تقریباً ان بارشوں سے 950000 افراد متاثر ہوئے جبکہ صرف ایک دن بعد ایک ملین افراد
متاثر ہونے کی رپورٹ دی گئی۔ اگست کے وسط تک یہ تعداد بڑھ کر 4 کروڑ یا 20 ملین ہوگئی۔ اگست
کے وسط تک پاکستان وفاقی سیلاب کمیشن کے مطابق 1540 افراد ان سیلابوں کی وجہ سے جاں بحق ہوگئے
تھے۔ اور 2088 افراد شدید زخمی تھے 55722 گھر تباہ ہو جانے کے بعد تقریباً 2000000 افراد بے گھر
ہوگئے تھے۔ ایک ماہ بعد جاں بحق ہونے والوں کی تعداد 1781 ہوگئی 2966 زخمی ہو چکے تھے اور تقریباً
1.89 ملین گھر تباہ ہو چکے تھے۔ خیبر پختونخواہ کے وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین کے بیان کے مطابق
اس صوبے کا انفراسٹرکچر دہشت گردی کی وجہ سے پہلے ہی تباہ حال تھا جو کچھ باقی تھا اسے ان سیلابوں نے
تباہ کر کے رکھ دیا اس کے ساتھ ہی میاں صاحب نے اس قدرتی آفت کو اس صوبے کی تاریخ کی سب
سے بڑی آفت قرار دیا۔ اور بتایا کہ اس آفت کے بعد تقریباً 80 لاکھ افراد خوراک کی کمی کا شکار ہو جائیں
گے۔

قراقرم ہائی وے جو پاکستان کو چین سے ملاتی ہے اس سیلاب کی وجہ سے اس ہائی وے کا ایک پل
تباہ ہو جانے کے بعد بند کر دی گئی۔

صوبہ سندھ میں 8 اگست 2010ء کو دریائے سندھ سکھر کے نزدیک اپنے کناروں سے باہر آ گیا
جس سے مورخان نامی ایک گاؤں پانی میں ڈوب گیا دوسری طرف اسی سیلاب کی وجہ سے سندھ میں امن
و امان قائم کرنا بھی مشکل ہوگیا۔ لیٹروں نے اس سیلاب کا فائدہ اٹھایا اور کشتیوں پر جا کر گھروں کو لوٹنے
گ

اگست کے آغاز میں سیلاب نے دریائے سندھ کے ساتھ جنوب کا رخ کیا اور مغربی پنجاب کے وسیع علاقے کم از کم 1400000 ایکٹر زمین زیر آب آ گئی اور فصلیں تباہ ہوگئیں۔ دوسری طرف صوبہ سندھ میں بھی کپاس، گنا، چاول اور تمباکو وغیرہ کی فصلیں تباہ ہوگئیں۔ سیلابوں اور بارشوں سے 7 لاکھ ایکٹر زمین کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

ستمبر کے وسط تک آخر سیلاب اترنے لگے تاہم سندھ کے بعض علاقوں میں کچھ نئے سیلابوں کی آمد کی خبریں بھی آنے لگیں۔ متاثرہ علاقوں کے لوگ ابھی تک بھی اپنے گھروں کو واپس نہیں لوٹ سکے تھے۔ 2010ء میں آنے والے ان سیلابوں کے بعد پنجاب کی حکومت نے 22 ایسے گاؤں تعمیر کیے جن میں سیلاب سے متاثرہ لوگوں کو پناہ دی گئی ان گاؤں میں 1885 سنگل سٹوری گھر تعمیر کیے گئے اور دیگر لوازمات زندگی بہم پہنچائے گئے۔

ان سیلابوں کے دوران پاکستانی فوج کو طالبان باغیوں سے جنگ بند کرنے کے امدادی کاروائیوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑا تھا۔ جس سے طالبان کو دوبارہ منظم ہونے کا موقع مل گیا۔ تاہم پاکستانی فوج نے سیلاب سے متاثرہ لوگوں کو خوراک پہنچا کر دوسری طرف امریکیوں کو بھی اپنا امیج بہتر بنانے کا موقع فراہم کیا۔

دوسری طرف پاکستانی طالبان نے بھی ایسے علاقوں میں جہاں پاکستانی حکومت مفقود تھی امدادی کاروائیاں کیں۔ اگست میں طالبان کے ایک ترجمان نے پاکستانی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ مغربی ملکوں سے جو بنیادی طور پر یہودی اور عیسائی ممالک ہیں امداد قبول نہ کرے تو طالبان 20 ملین ڈالر کے فنڈ اس غیر ملکی امداد کے بدلے میں فراہم کریں گے۔

اس کے علاوہ ایک امریکی افسر کے مطابق طالبان نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ وہ پاکستان میں امدادی کام کرنے والے غیر ملکیوں پر حملے کریں گے۔ اس پر اقوام متحدہ نے اپنے ورکروں کو سکیورٹی فراہم کرنے کے انتظامات کرنے کا اعلان کیا۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے بھی اعلان کیا کہ صوبہ خیبر پختونخواہ میں پہلے طبی امداد فراہم کرنا سکیورٹی کی وجہ سے مسئلہ بنا ہوا ہے۔

اس پر طالبان کے ایک ترجمان نے بیان دیا کہ طالبان امدادی جماعتوں پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور نہ ہی انہوں نے ایسی کوئی دھمکی دی ہے۔ تاہم اس بیان کے باوجود 25 اگست کو طالبان نے وادی سوات میں 3 امریکی عیسائی مشنریوں کو قتل کر دیا۔

2011ء..... کرائسٹ چرچ

نیوزی لینڈ میں آنے والا تباہ کن زلزلہ

22 فروری 2011ء کو دوپہر 12:51 منٹ پر نیوزی لینڈ کے دارالحکومت کرائسٹ چرچ میں ریکٹر اسکیل پر 6.3 درجے کا زلزلہ آیا۔ یہ زلزلہ نیوزی لینڈ کے جنوبی جزیرے کے علاقے کنٹربری میں آیا تھا۔ اس کا مرکز Epicenter لطل ٹن کی بندرگاہ کے 2 کلومیٹر مغرب میں اور کرائسٹ چرچ کے جنوب مشرق میں واقع تھا کرائسٹ چرچ اس زمانے میں نیوزی لینڈ کا دوسرا بڑا اور گنجان آباد شہر تھا۔ اس زلزلے نے اس شہر کو بری طرح نقصان پہنچایا اور 185 افراد جاں بحق ہوگئے۔ یہ نیوزی لینڈ کی تاریخ کی دوسری بڑی قدرتی آفت تھی۔

زلزلے سے کرائسٹ چرچ کا مرکزی حصہ اور مشرقی مضافاتی بستیاں شدید طور پر متاثر ہوئیں تھیں۔ عمارتوں اور انفراسٹرکچر کو بری طرح نقصان پہنچا تھا۔ اس سے پہلے 4 ستمبر 2010 کو کنٹربری کے علاقے میں 7.1 درجے کا ایک اور زلزلہ آیا تھا جس نے عمارتوں کو کمزور کر دیا تھا موجودہ زلزلہ جنوبی جزیرے پر آیا تھا اور اس کے جھٹکے شمالی جزیرے کے نشیبی علاقوں میں بھی محسوس کیے گئے تھے۔ اس زلزلے کے ابتدائی جھٹکے تقریباً 10 سیکنڈ تک محسوس کیے گئے تھے۔ تاہم اتنے مختصر وقت کے باوجود ان جھٹکوں سے پہنچنے والا نقصان شدید تھا جس کی وجہ ماہرین نے یہ بتائی کہ چونکہ اس زلزلے کا مرکز انتہائی کم گہرائی پر واقع تھا اور ستمبر کے زلزلے نے بھی کرائسٹ چرچ کی عمارتوں کی بنیادیں ہلا کر پہلے رکھ دیں تھیں۔ اس زلزلے سے کرائسٹ چرچ کی آبادی کو پہنچنے والے نقصان کے بعد یہ شہر نیوزی لینڈ کے شہری علاقوں میں دوسرے یا تیسرے نمبر پر چلا گیا تھا۔

185 ہلاک شدگان کا تعلق 20 ملکوں سے تھا۔ ان میں سے تقریبات آدھے لوگ کنٹربری ٹیلی وژن کی 6 منزلہ عمارت کے زمین بوس ہو جانے اور اس میں آگ لگ جانے کی وجہ سے ہلاک ہوئے تھے۔ نیوزی لینڈ کی حکومت نے اس زلزلے کے بعد ملک میں ہنگامی حالت نافذ کر دی تھی جو آئندہ 11 اپریل 2011 تک نافذ العمل رہی۔

115 افراد کنٹربری ٹیلی وژن کی عمارت میں ہلاک ہوئے تھے جبکہ 18 افراد PGC ہاؤس کی عمارت کے گرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ اس عمارت کا ایک حصہ کولمبو اسٹریٹ سے گذرنے والی ایک بس پر گرنے کی وجہ سے یہ ہلاکتیں ہوئیں تھیں۔ اس کے علاوہ مزید 28 افراد شہر کے مرکزی حصے میں کئی مقامات پر جاں بحق ہوئے تھے کرائسٹ چرچ کی مضافاتی بستیوں میں 12 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ بعض ہلاک ہونیوالوں کے شدید زخمی ہونے کی وجہ سے ان کی شناخت تک نہ ہوسکی۔ تقریباً 6600 سے (6800) لوگوں کو معمولی زخم آئے تھے انہیں مرہم پٹی کرکے ہسپتالوں سے فارغ کر دیا گیا۔ جبکہ 2200 زخمیوں کو شدید چوٹیں لگنے کی وجہ سے کرائسٹ چرچ کے ہسپتال میں زیر علاج رکھا گیا۔ امدادی کاروائیاں تقریباً ایک ہفتے تک جاری رہیں اور پھر بحالی کی کوششوں میں تبدیل ہوگئیں زندہ بچنے والوں میں سے آخری فرد کو زلزلے سے اگلے دن ملبے سے نکال لیا گیا تھا۔

شاہراہوں اور پلوں کو پہنچنے والے نقصانات کی وجہ سے امدادی کاروائیوں میں رکاوٹ پڑی اور یہ کام تیزی سے انجام نہ پا سکا بہت سی گاڑیاں روڈ پر گرے ہوئے ملبے سے ٹکرا گئیں۔ شہر کے مرکزی حصے میں دو چلتی ہوئی بسوں پر عمارتی ملبے کے بڑے ٹکڑے آ گرنے سے وہ تباہ ہوگئیں۔ چونکہ یہ زلزلہ دوپہر کو عین لنچ ٹائم پر آیا تھا۔ اس لئے فٹ پاتھ پر بڑی گہما گہمی تھی۔ کچھ لوگ فٹ پاتھ پر عمارات گرنے کی وجہ سے جاں بحق ہوگئے تھے۔

شہر کے مرکزی حصے میں زیادہ تر نقصان قدیم عمارات کو پہنچا خصوصاً ان عمارات کو جو زلزلہ پروف عمارات کی تعمیر سے پہلے کی تھیں۔ 28 فروری کو نیوزی لینڈ کے وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ جن اتھارٹیوں کی طرف سے 4 ستمبر 2010 کے زلزلے کے بعد محفوظ قرار دی جانے والی عمارتوں کے منہدم ہونے کی انکوائری کی جائے گی اور ان کے خلاف مقدمات چلائے جائیں گے کہ ان کے غلط فیصلے کی وجہ سے اتنے افراد ہلاک ہوئے۔

زلزلے کے بعد 3 مارچ 2011 تک جن نقصان زدہ عمارات کا معائنہ کیا گیا ان پر سرخ یا پیلے اسٹیکر لگا دیئے گئے جو ان عمارات کی سیفٹی کے مسائل کو نمایاں کرتے تھے۔ بعض قومی ورثے کی عمارات پر سرخ اسٹیکر لگا دیئے گئے اور فروری 2015 تک ان کا گرایا جانا لازمی قرار دے دیا گیا۔

2011-12ء..... مشرقی افریقہ میں خشک سالی اور قحط

جولائی 2011ء سے جون 2012 تک ایک شدید قحط اور خشک سالی نے مشرقی افریقہ کے پورے علاقے کو متاثر کیا۔ یہ گذشتہ 60 سال میں اس علاقے میں آنے والی سب سے بڑی قدرتی آفت تھی۔ اس خشک سالی سے صومالیہ، جبوتی، ایتھوپیا اور کینیا میں شدید قحط کی صورتحال دیکھنے میں آئی جس سے تقریباً دو کروڑ کے لگ بھگ افراد کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں۔ بہت سے لوگ اس قحط سالی سے پریشان ہو کر جنوبی صومالیہ کے علاقے سے فرار ہو کر نزدیکی ہمسایہ ممالک کینیا اور ایتھوپیا میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے جہاں لوگوں کے بڑی تعداد میں ایک ہی جگہ اکٹھے ہو جانے کی وجہ سے صفائی اور ستھرائی کے فقدان اور کم خوراکی کی وجہ بہت سی اموات واقع ہوئیں۔ مشرقی افریقہ کے دیگر ممالک جن میں سوڈان، جنوبی سوڈان، اور یوگنڈا کے کچھ حصے شامل تھے، قحط سالی کا شکار ہو گئے۔

صومالیہ کے حکام کے مطابق اس خشک سالی سے زیادہ تر صومالیہ کے جنوبی حصے کے کسان متاثر ہوئے تھے جبکہ شمالی حصے میں اس کی علامات کم دکھائی دیں تھیں۔ 20 جولائی کو اقوام متحدہ نے سرکاری طور پر اس ملک کے کم از کم دو علاقوں میں قحط پڑنے کا اعلان کیا تھا صومالیہ کے کسی علاقے میں تقریباً 30 سال بعد اقوام متحدہ کی طرف سے قحط پڑنے کا یہ اعلان کیا گیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی ممالک کی حکومتیں متاثر علاقوں میں امداد نہ پہنچانے کی کوششوں میں مصروف تھیں تاکہ الشباب نامی جنگجو گروپ کو کمزور کیا جا سکے۔ اس گروپ کے خلاف وہ جنگ میں ملوث تھیں تاہم 2012ء کے شروع میں صورتحال بدل گئی اور بارشوں کی وجہ سے خشکی سالی اختتام کو پہنچی اور بہت سے لوگ اپنے گھروں کو واپس آ گئے اس طرح جنوری 2012 میں قحط سالی بہت کم ہو گئی۔

موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے 2011ء میں کینیا اور ایتھوپیا میں بارش نہ ہوئی اور اس سے پہلے کے دو سالوں میں صومالیہ میں بھی بارش نہیں برسی تھی۔ بارشوں کی اس کمی کی وجہ سے ان علاقوں میں فصلیں نہ ہو سکیں اور اناج کی قیمتوں اور مویشیوں کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا جبکہ مزدوری کی اجرت میں کمی واقع ہوئی۔ مشرقی افریقہ میں ستمبر میں بارش ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا اس کے علاوہ صومالیہ کے جنوبی حصے میں الشباب نامی باغی گروپ کی سرگرمیوں نے اس بحران کو مزید ہوا دی اور یہ بحران شدید تر

ہوگیا۔ دوسری طرف قحط کی ابتدائی صورتحال میں عالمی برادری نے صومالیہ کے اس مسئلے پر توجہ نہ دی جس کی وجہ سے صورتحال مزید خراب ہوگئی۔ قحط پڑنے سے خبردار کرنے والے وارننگ سسٹم نے اگست 2010ء میں اس خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔ صومالیہ میں امریکہ کے سفیر نے اس قدرتی آفت سے خبردار کرتے ہوئے فوری طور پر صومالیہ کی مدد کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ جون 2011 میں یہ کیفیت کھل کر سامنے آ گئی اور مشرقی افریقہ کے اس علاقے کے 12 ملین لوگ قحط سالی سے متاثر ہوگئے۔ صومالیہ کے جنوبی حصے میں قحط سالی کے اعلان کے بعد آکسفام oxfam نامی تنظیم نے مغربی حکومتوں پر جان بوجھ کر غفلت کرنے کا الزام بھی لگایا۔

20 جولائی 2011ء کو اقوام متحدہ نے صومالیہ کے دو جنوبی علاقوں زیرین شبیل Lower shabelle اور بیکول Bakool میں قحط پڑنے کا اعلان کیا۔ 3 اگست کو مزید علاقوں کے قحط سالی کا شکار ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اکنانومسٹ کے ایک شمارے میں یہ رپورٹ شائع ہوئی کہ یہ قحط سالی عنقریب پورے مشرقی افریقہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

2012ء..... چین کے دارالحکومت بیجنگ میں سیلاب

21 جولائی 2012 کو 24 گھنٹے کے دوران چین کے دارالحکومت بیجنگ میں پانی کے تیز دھارے کے ساتھ بہتا ہوا ایک سیلاب آیا جس کی وجہ سے صرف ایک دن کے اندر اندر 56933 افراد کو محفوظ مقامات پر منتقل کرنا پڑا اس کے علاوہ 79 افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس سیلاب سے تقریباً 10 ارب یوآن (چینی کرنسی) یا 1.6 بلین ڈالر کا مالی نقصان بھی اس شہر کو پہنچا۔ کم از کم اس شہر کے 8200 مکانات اور عمارتیں تباہ ہوگئے اور کم از کم بیجنگ کے 30 لاکھ شہری اس بلائے بے درماں سے متاثر ہوئے۔

بیجنگ کی فینگ شان Fangshan ڈسٹرکٹ اس سیلاب سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا علاقہ تھی۔ یہ ڈسٹرکٹ بیجنگ کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس علاقے میں سب سے زیادہ بارش 18 انچ یا 460 ملی میٹر ریکارڈ کی گئی جبکہ باقی شہر میں 170 ملی میٹر یا 6.7 انچ بارش برسی۔ یہ بیجنگ میں 1951ء کے بعد سب سے زیادہ بارش برسنے کا ریکارڈ تھا۔ فینگ شان ڈسٹرکٹ میں بہنے والے دریائے جوما Juma میں سیلاب آ گیا اور 88000 کیوبک فیٹ پانی بہنے لگا۔ فینگ شان میں رہنے والی ایک چینی خاتون کے مطابق اس دریا کا پانی 1.3 میٹر بلند ہوگیا اور صرف دس منٹ کے اندر اندر اس کے گھر میں گھس آیا۔

بیجنگ انٹرنیشنل ایرپورٹ میں اس سیلاب کا پانی در آنے کی وجہ سے تقریباً 500 فلائٹس معطل کرنا پڑیں جس سے 80 ہزار کے لگ بھگ مسافر متاثر ہوئے۔

بیجنگ میں آنے والا یہ سیلاب چین میں موسم بہار میں آنے والے سیلاب کا ایک حصہ تھا جو اس سال موسم گرما تک جاری رہا۔ ان سیلابوں سے چین کے جنوب مغربی علاقے جن میں گوانگ سی ژوانگ کا خود مختار علاقہ اور شمال مشرقی چین جس میں بیجنگ بھی شامل ہے اور چین کے دیگر قصبات اور شہر بھی اس سیلاب سے بری طرح متاثر ہوئے۔ 2011ء میں ایک شدید طوفان بادو باراں بیجنگ میں طوفانی بارش کے بعد سیلاب کا باعث بنا تھا۔ اسی طرح جولائی 2007ء میں بھی ایک طوفان بادو باراں نے بیجنگ میں 22 افراد کی جان لے لی تھی تاہم 2012ء میں آنے والے سیلاب نے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیے اور شدید جانی و مالی نقصان کا باعث بنا تھا۔

2012ء..... جنوبی بھارت سائیکلون نیلم کی زد میں

سائیکلون نیلم Cyclone nilam وہ شدید خطرناک طوفان تھا جس نے 2010 میں آنے والے سائیکلون جال Jal سے زیادہ نقصانات پہنچائے۔ یہ سائیکلون خلیج بنگال میں 28 اکتوبر کو پیدا ہوا پھر ایک کم شدت والے سمندری طوفان کی حیثیت سے یہ سری لنکا کے علاقے ٹرنکو مالی Trincomalee کی طرف بڑھا۔ چند دنوں کے اندر اندر ااس کم شدت کے طوفان نے ایک سائیکلون کی شکل اختیار کرلی اور 31 اکتوبر کو یہ مہابالی پورم Mahabali puram کے نزدیک زمین پر اتر آیا اس کے ساتھ 50 میل فی گھنٹہ کی رفتار کی ہوائیں بھی تھیں۔ بھارت کے صوبے چنائی Chenai (مدراس) میں اس نے میرینہ بیچ Mariana Beech کے مقام پر حملہ کیا جس سے ساحلی ریت اور سمندری پانی ساحلی علاقے سے 100 میل اندر تک گھستے چلے گئے۔ چنائی شہر میں اس سائیکلون کے حملے کے بعد تمام اسکول اور کالج بند کر دیئے گئے اور اگلے تین دن تک بند رہے۔

اس طوفان کی وجہ سے مہا بالی پورم کے علاقے سے کم از کم 3000 لوگوں کا انخلا کیا گیا اور چنائی میں اسکولوں اور کالجوں نے یکم نومبر تک تعطیل کا اعلان کر دیا کیونکہ 282 اسکولوں کو امدادی مرکزوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس دن تمام سرکاری اور نجی دفاتر بھی 3 بجے دن ہی بند کر دیئے گئے تاکہ ٹریفک کا رش کم کیا جاسکے۔ اس طوفان کے بعد امدادی کیمپ ناگاپٹنم اور دوسرے علاقوں میں قائم کئے گئے۔ مہابالی پورم میں بجلی فیل ہوگئی اور ہوا کی شدت سے 90 درخت جڑوں سے اکھڑ گئے اور بہت سی کاٹیج بھی تباہ ہوگئیں۔ اس سائیکلون سے اگرچہ جانی نقصان بہت کم پہنچا مگر مالی نقصان کا گراف خاصا بلند تھا جبکہ اموات صرف چند واقع ہوئیں۔ اس سائیکلون سے پہنچنے والے مالی نقصانات کا اندازہ کم از کم 10 ملین ڈالر سے 15 ملین ڈالر لگایا گیا۔ بعد ازاں بھارت کی ریاست آندھرا پردیش نے اس طوفان سے پہنچنے والے مالی نقصانات کا اندازہ 200 کروڑ یا 29 ملین ڈالر بتایا۔

بنگلور میں موسلا دھار بارش اور تیز ہواؤں سے کم از کم 86 درخت جڑ سے اکھڑ گئے اور ایک درخت پولیس کمشنر کی رہائش گاہ کی دیوار پر گرنے کی وجہ سے کافی نقصان پہنچا اسی طرح درختوں کے بجلی کے تاروں پر گرنے سے بھی نقصانات ہوئے اس طوفان کے دوران 150000 افراد کو آنندھرا پردیش کے ضلع نیلور Nillore سے منتقل کرنا پڑا۔ نیلور کے علاوہ چتور کے ضلع میں بھی شدید بارش ریکارڈ کی گئی تھی پرا کا شام کے ضلع میں سیلاب کی وجہ سے ایک شاہراہ بند ہوگئی اس شاہراہ پر تیز ہواؤں نے ایک ٹرک کو الٹا دیا تھا۔ تیلوگوز بان کے ایک ٹی وی چینل RV9 نے خبر دی کہ نیلور کے ضلع میں لوگ طوفان کے بعد سب سے زیادہ متاثر افراد تھے سائیکلون نیلم کی وجہ سے آندھرا پردیش کے ساحلی علاقوں میں شدید بارشیں برسیں جو مزید نقصانات کا باعث بنیں۔

2013ء.....فلپائن میں ٹائفون ہے یان

ٹائفون ہے یانTyphoon haiyan کو فلپائن میں سپر ٹائفون یولینڈا Super typhoon yolanda کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ گرم خطوں میں آنے والا شدید ترین سمندری طوفان تھا جس نے فلپائن اور جنوب مشرقی ایشیا کے بہت سے حصوں میں تباہی مچائی۔ یہ فلپائن میں آنے والا سب سے خطرناک سمندری طوفان تھا۔ اس طوفان سے صرف فلپائن میں 6300 افراد ہلاک ہوگئے۔ غیر سرکاری ریکارڈ کے مطابق یہ فلپائن کی تاریخ میں ہواؤں کی رفتار کی وجہ سے بھی سب سے شدید سمندری طوفان تھا۔ جنوری 2014ء تک اس طوفان کی زد میں آکر مرنے والوں کی لاشیں دریافت ہوتی رہیں تھیں۔

یہ بحرالکاہل میں 2013 میں آنے والا تیرہواں سمندری طوفان تھا۔ یہ مائیکر نیشیا کے کم فضائی دباؤ کے علاقوں مس یکم اور 2 نومبر 2013 کو پیدا ہوا تھا۔ جہاں سے یہ مغربی سمت میں آگے بڑھا اگلے دن اس نے ایک ٹروپیکل ڈیپریشن کی شکل اختیار کرلی۔ پھر ایک ٹروپیکل سمندری طوفان کی صورت میں اسے ہے یان Yaiyan کا نام دیا گیا۔ 4 نومبر 2013 رات 12 بجے اس نے مزید شدت اختیار کرلی اور 5 نومبر کو یہ کیٹیگری 5 کی شدت کا سمندری طوفان بن گیا پھر 7 نومبر کو جاپان کی موسمیاتی ایجنسی JMA نے اس سائیکلون کے ساتھ چلنے والی ہواؤں کو 300 کلومیٹر فی گھنٹہ یا 145 میل فی گھنٹہ سے چلنے والی ہوائیں قرار دیا جو کسی سائیکلون کے ساتھ چلنے والی سب سے تیز ہوائیں تھیں۔ جبکہ ہانگ کانگ آبزرویٹری نے ان کی رفتار 285 کلومیٹر فی گھنٹہ قرار دی۔ ان ہواؤں نے ہے یان کو غیر سرکاری طور پر اس علاقے میں آنے والا سب سے شدید طوفان قرار دے دیا۔ پھر یہ سائیکلون فلپائن میں جیووان Guiuan کے مقام پر زمین سے ٹکرایا۔ پھر آہستہ آہستہ کمزور پڑتا ہوا یہ بحیرہ جنوبی چین پر سے گذرتا ہوا شمال مغرب کی طرف مڑا اور اس نے آخر کار شمالی ویت نام کو گھیر لیا۔ 10 نومبر کو جاپان کی موسمیاتی ایجنسی نے اسے ٹراپیکل ڈیپریشن قرار دے دیا۔

6 نومبر 2013 کو اس سائیکلون نے فلپائن کے علاقے میں داخل ہونے سے پیشتر Pagasa پبلک سٹارم وارننگ سگنل نمبر الگایا گیا۔ پھر جب یہ طوفان فلپائن میں داخل ہوا تو سٹارم وارننگ کو لوزون کے علاقے تک وسیع کر دیا گیا۔

جنوبی چین کے تین صوبوں، ہینان Hainan گوانگ ڈونگ Guandong اور گوانگسی Gunanxi لیول تھری کی ہنگامی صورتحال نافذ کر دی گئی اور جنوبی بحیرہ چین سے ماہی گیری کی کشتیوں کو واپس بلا لیا گیا۔ 9 نومبر کو ہانگ کانگ کی موسمیاتی آبزرویٹری نے شدید مون سون کی وارننگ کی جو 13 نومبر تک برقرار رہی۔

ویت نام کے وزیراعظم Nguyen tan dung نے ریاستی سطح پر اس ہری کین کے نقصانات سے بچنے کے لیے تیاریوں کا اعلان کر دیا اور تقریباً 6 لاکھ افراد کو جنوبی اور وسطی صوبوں کے ان علاقوں سے نکال لیا گیا جہاں طوفان کی آمد کا خطرہ تھا۔ سمندر میں موجود بحری جہازوں کو بھی اس ہری کین کی آمد سے خبردار کر دیا گیا ویت نام کی حکومت نے چین اور انڈونیشیا اور فلپائن اور ملائیشیا کی حکومتوں کو درخواست کی کہ ٹائیفون میں گھر جانے والے ملاحوں کی مدد کی جائے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آیا تھا کہ اس ٹائفون کو فلپائن میں یولنڈا کا نام دیا گیا تھا۔ اس سمندری طوفان نے فلپائن کے جزیرے لیٹ Leyte پر شدید تباہی مچائی اور جزیرے پر موجود بہت سے شہروں اور قصبوں کو برباد کر دیا فلپائن کے ادارے نیشنل ڈس ایسٹر رسک ریڈکشن N.D.R.R نے ایک رپورٹ کے مطابق اس طوفان سے فلپائن میں 6300 اموات واقع ہوئیں۔ جبکہ کئی علاقوں میں شرح اموات کا پتہ نہ چل سکا۔ صرف ایک شہر ٹیک لوبان Tacloban میں 10 ہزار سے زائد لوگ اس طوفان سے متاثر ہوئے تھے۔ فلپائن کی صدر بینگنو اکینوسوم کے مطابق صرف جزیرے لیٹ میں 2500 افراد ہلاک ہوئے تھے جبکہ ریڈ کراس کے مطابق 22000 افراد لاپتہ تھے ٹیک لوبان میں انٹرنیشنل ایر پورٹ ٹرمینل کی بلڈنگ 17 فٹ بلند طوفانی موجوں کے ہاتھوں تباہ ہوگئی تھی۔

فلپائن کے مغربی ساحل کے مقام ایسٹ سیمر Eastsamar کے مقام پر یہ طوفان پہلے پہل زمین پر اترا تھا جس کی وجہ سے یہ علاقہ بری طرح متاثر ہوا۔ اس قصبے کی ہر عمارت کو جزوی طور پر نقصان پہنچا تھا۔ اور بہت سی عمارات زمین بوس ہوگئیں تھیں۔ بہرحال اس ٹائفون سے سب سے زیادہ متاثر فلپائن ہوا تھا جبکہ اس طوفان نے جمہوریہ چین اور تائیوان، ویت نام میں بھی شدید تباہی مچائی تھی۔

2014ء..... بدخشاں میں مٹی کے تودے گرنے سے ہلاکتیں

افغانستان کے صوبے بدخشاں کے ضلع آرگو میں 2 مئی 2014ء کو مٹی کے تودے گرنے سے ان
ت اموات واقع ہوئیں۔ اموات کی تعداد 350 سے 2700 تک بتائی جاتی ہے۔ تقریباً 300 کے
یب مکانات ان تودوں کے گرنے سے مٹی کے نیچے دب گئے جبکہ 14000 کے قریب متاثر ہوئے۔
ی امدادی جماعتیں پہلے تودے گرنے کے بعد امدادی کاموں میں مصروف تھیں کہ دوسرا تودہ گر گیا اور
دادی کاروائیوں میں رخنہ پڑ گیا۔ 2 مئی کو صوبہ بدخشاں کے ضلع آرگو میں مٹی کے تودے گرنے کے
ہرے واقعات پیش آئے۔ یہ تودے ایک پہاڑ کی ایک ڈھلوان سے گرے تھے اور ان سے آب باریک
ی گاؤں سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔تودے گرنے کی ابتدا جمعہ کے دن دوپہر 11 بجے سے 1 بجے تک
ئی یاد رہے کہ جمعہ کا دن افغانستان میں ایک ہفتہ وار چھٹی اور عبادت کا دن ہے اور اس دن زیادہ تر
وگ اپنے گھروں میں ہی رہتے ہیں۔ پہلی بار تودے گرنے کے بعد ساتھی دیہاتیوں نے ان لوگوں کو نکالا
جو تودے میں یا مٹی اور کیچڑ میں دب گئے تھے۔ دوسری بار تودے گرنے سے امدادی کاروائی کرنے والوں
کی بڑی تعداد تودوں کے نیچے دب گئی یا ہلاک ہوگئی۔ بعد کے تودوں نے پورے گاؤں کو ہموار کر دیا اور
چھپا لیا اور اس پورے ایریا پر 33 سے 98 فٹ موٹی مٹی کی تہہ جم گئی۔ تودے گرنے سے ایک ہفتہ پیشتر
شمالی افغانستان میں موسلا دھار بارشیں ہوئی تھیں جن سے بیشتر علاقوں میں سیلاب کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی
اور تودے گرنے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔

تودے گرنے سے تقریباً 1000 گھر متاثر ہوئے جبکہ 300 مکانات مٹی میں دفن ہو گئے۔ اس
گاؤں کے ایک تہائی مکانات ہزاروں ٹن مٹی اور پتھروں کے نیچے دب گئے۔ ڈھلوانی علاقہ ہونے کی وجہ
سے اوپر سے گرتے ہوئے اس کیچڑ اور مٹی نے پانی کی لہر کی شکل اختیار کرلی جو اپنے راستے میں آنے
والی ہر شے کو تباہ کرتی چلی گئی۔ ابتدائی رپورٹوں میں بتایا گیا تھا کہ تقریباً 350 افراد تودوں کے نیچے دب
کر ہلاک ہوگئے ہیں اور 2500 کے قریب لا پتہ ہیں۔ پھر اگلے دن صوبہ بدخشاں کی حکومت نے اعلان
کیا کہ اموات کی جو تعداد ابتدائی رپورٹوں میں دی گئی تھی وہ مقامی لوگوں نے بتائی تھی اور کسی تیکنیکی ٹیم
نے یہ اعداد و شمار اکٹھے نہیں کیے تھے۔ تاہم حکام کا خیال تھا کہ شرح اموات 500 سے تجاوز نہیں کرے

گی۔ اقوام متحدہ نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ 350 افراد کی موت مصدقہ ہے مگر مزید تودے گرنے کے خطرے کی وجہ سے ابھی مزید لاشیں نہیں ڈھونڈی جا سکیں۔

افغان فوج سے کچھ دستے اس متاثرہ علاقے میں بھیجے گئے تا کہ امدادی جماعتوں کی مدد کریں اور امدادی کاروائیوں میں حصہ بٹائیں۔ امریکی اتحادی افواج نے بھی بیان دیا کہ اگر ان سے مدد طلب کی گئی تو وہ اس کام کے لیے تیار ہیں مزید تودے گرنے کے خطرے کی وجہ سے آس پاس کے گاؤں کے باشندوں کو وہاں سے نکال لیا گیا۔ ایک افغان رکن پارلیمنٹ، محمد زکریا سودا نے بیان دیا کہ ہلاک ہونیوالوں کی تعداد 1000 تک پہنچ سکتی ہے۔ امدادی جماعتوں کے پاس ناکافی اورزار ہونے کی وجہ امدادی کارروائیاں تیز تر نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ ایک تیسرے تودے کے گرنے کے خطرے کی وجہ سے بھی امدادی کاروائیوں کے راستے میں رکاوٹ تھی آخر تیسرے دن کام رک گیا۔ سرکاری بیان میں بتایا گیا کہ 4 مئی کو امدادی کاروائیوں ناکافی اوزاروں کی بنیاد پر روک دی گئیں تاہم جب اس حکومتی فیصلے کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں تو کام دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ بدخشاں کے گورنر نے بیان دیا کہ تودے بڑی تعداد میں گرنے کی وجہ تمام مٹی ہٹا کر لاشیں ڈھونڈنے کا کام انسانی سکت سے باہر ہے۔ یہ بھی ایک سانحہ ہے کہ ہم مزید کچھ نہیں کر سکتے گورنر نے مزید کہا کہ چونکہ لاشیں نکالنے کا کام مزید آگے نہیں بڑھ سکتا اس لیے تودے گرنے کے اس مقام کو ایک اجتماعی قبر یا قبرستان کی حیثیت دی جاتی ہے۔ تاہم اس نے مزید بیلچے اور کدال فراہم کرنے کی اپیل بھی کی۔

افغانستان کے اس وقت کے صدر جناب حامد کرزئی نے قیمتی انسانی جانوں کے زیاں پر تہہ دل سے افسوس کیا۔ امریکہ کے صدر بارک اوبامہ نے بیان دیا کہ امریکی قوم کی ہمدردیاں افغان قوم کے ساتھ ہیں جو اس شدید سانحہ کا سامنا کر رہی ہے۔ ہم ہر طرح سے اپنے افغان دوستوں کے ساتھ ہیں۔

2015ء..... کراچی میں گرمی کی شدید لہر

جون 2015ء میں جب موسم انتہائی گرم ہوا تو پاکستان کے دل کراچی کو گرمی کی ایک شدید ہلاکت خیز لہر نے گھیر لیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جون میں بجلی کی بدترین لوڈشیڈنگ بھی جاری تھی اور پانی بھی نایاب تھا۔ ان تمام حالات نے مل کر شہر قائد میں صرف تین دن کے اندر 1200 سے زاد افراد کو لقمہ اجل بنا دیا۔ نہ صرف تین دن بلکہ گرمی کی یہ شدید لہر کراچی میں مزید کئی دن تک جاری رہی جس سے اموات کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گرمی کی اس لہر کو تو ایک قدرتی آفت قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر زندگی اور موت کے اس کھیل میں ہم متعلقہ حکام کی سنگین غفلت کو بھلا کیا نام دیں؟ جس کی اس غفلت کی وجہ سے کراچی جیسے بڑے شہر میں مردہ خانوں میں لاشیں رکھنے کی جگہ تک کم پڑ گئیں، دوسری طرف کراچی والے اس سنگین ذہنی اذیت سے بھی گذرے کہ مرنے والے عزیزوں اور پیاروں کی لاشوں کو آخری غسل دینے کے لیے پانی تک میسر نہیں تھا۔ ایسے میں کوئی باپ، بھائی اور بیٹے کی لاش کو لئے ایک سرد خانے سے دوسرے سرد خانے کے چکر لگانے پر مجبور تھا تو کوئی اپنے پیاروں کی لاشوں کو اس شدید گرمی میں گلنے سڑنے سے بچانے کے لیے گورکنوں کو منہ مانگی قیمت دینے پر مجبور ہوگیا۔ کراچی کے شہریوں کو اپنے پیاروں کی تدفین کے لیے ہزاروں روپے ادا کرنے کے باوجود قبر کی بکنگ کے عذاب کو بھی سہنا پڑا۔

جون 2015ء میں مقدس اسلامی مہینے رمضان المبارک کی بھی تشریف آوری تھی۔ اس لیے جو بے چارے گرمی کی لہر اور لوڈ شیڈنگ کرنے والوں کی مہربانی سے لقمہ اجل بنے ان میں سے اکثریت نے روزے رکھے ہوئے تھے۔ ادھر لو لگنے اور ہیٹ سٹروک کے ان مریضوں کو جب ہسپتال لے جایا گیا تو ان میں سے بیشتر افراد نمکیات اور پانی کی کمی کا شکار تھے کچھ تو ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گئے جبکہ کچھ نے ہسپتال پہنچ کر دم توڑ دیا۔ گرمی کی شدت سے مرنے والوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو 50 سال کی عمر سے تجاوز کر چکے تھے۔ رمضان المبارک کے دوسرے روزے کے دن کراچی میں سب سے زیادہ اموات واقع ہوئیں۔ 20 جون 2015ء کو کراچی میں سال کا گرم ترین دن ریکارڈ کیا گیا۔ حتیٰ کہ کراچی میں اس دن درجہ حرارت 45 سنٹی گریڈ تھا جبکہ جیک آباد، سکھر اور لاڑکانہ میں 48 سنٹی گریڈ کراچی کی تاریخ میں سب سے زیادہ گرمی 9 مئی 1938ء کو پڑی تھی جب یہاں درجہ حرارت 48 سنٹی

گریڈ تک پہنچ گیا تھا۔ کراچی میں آنے والی گرمی کی اس لہر میں ہلاک ہونے والوں کی بڑی تعداد غریب اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ رمضان المبارک کے ایام میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی مگر یہ وعدہ کبھی پورا نہیں ہوا تھا اور کراچی کے شہری ماہ صیام میں سحری اور افطاری اندھیرے اور شدید گرمی میں کرنے پر مجبور تھے۔ 12 سو قیمتی جانوں کے زیاں کے بعد بھی بجلی فراہم کرنے والے حکام کے کانوں پر جوں نہیں رینگی اور انہوں نے اپنی روایتی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوڈشیڈنگ جاری رکھی۔ جہاں سندھ اسمبلی میں لوڈشیڈنگ موضوع بحث بنی رہی وہیں تحریک انصاف کے ایک راہنما خرم شیر زماں نے اسمبلی میں سندھ حکومت اور محکمہ الیکٹرک کے خلاف لوڈشیڈنگ اور گرمی سے مرنے والوں کے قتل کے الزام میں FIR درج کرانے کا مطالبہ بھی کیا جو بے سود ہی رہا۔ پاک فوج کی طرف سے اس قدرتی آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے متاثرہ افراد کو طبی امداد فراہم کرنے کے لیے ہیٹ اسٹوک سنٹر قائم کر دیئے گئے مگر ان کوششوں کے باوجود اموات کا سلسلہ جاری رہا۔

2015ء..... حج کے موقع پر دو شدید سانحات

ہر سال دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں مسلمان فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے مقامات مقدسہ، سعودی عرب میں جمع ہوتے ہیں۔ سعودی عرب کی حکومت کے لیے 20 لاکھ سے زائد حجاج کرام کے لیے ضروری انتظامات کرنا ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم سعودی حکومت یہ چیلنج قبول کر کے ہمیشہ ہی بہتر انتظامات کے لیے کوشاں رہتی ہے مگر ان بہتر انتظامات کے باوجود ہجوم بیکراں میں بھگدڑ مچنے اور دوسرے حادثات پیش آنے کے خطرات موجود رہتے ہیں 2015ء میں حج کے موقع پر یک نہ شد دو شد حادثات پیش آئے جو حج کی تاریخ کے بڑے حادثات ہیں ان حادثات سے پوری دنیا کے مسلمانوں کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں تھیں۔

انہی دو سانحات میں سے ایک سانحہ مکہ شریف میں طوفان باد کے چلنے کی وجہ سے ایک انتہائی وزنی کرین کا حرم شریف میں گرنا تھا جس میں بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں جبکہ دوسرا سانحہ بھی اسی سال حج کے دوران منیٰ کے میدان میں رمی جمرات یعنی شیطان مجسم کو کنکریاں مارتے ہوئے پیش آیا۔ اگرچہ حج کی تاریخ کے جدید زمانے میں ایسے حادثات کئی بار پیش آچکے ہیں مگر اس سال پیش آنے والا حادثہ پچھلے تمام حادثوں سے الم ناک تھا۔ سعودی عرب کے سرکاری ذرائع کے مطابق اس حادثے میں شہید ہونے والوں کی تعداد 789 افراد تھی مگر بین الاقوامی میڈیا کی رپورٹ اور متاثر ہونے والے 42 ممالک کے مطابق اس حادثے میں 2431 حاجی شہید ہوئے تھے جبکہ 400 سے زائد لاپتہ بھی ہوگئے تھے۔

2015ء میں پیش آنے والے اس سانحے میں زیادہ تعداد ایرانی حجاج کرام کے شہید ہونے کی تھی کل ایرانی 464 حاجی شہید ہوئے تھے۔ دیگر ممالک میں افریقی ملک مالی کے 312، نائیجیریا کے 274، مصر کے 190 بنگلہ دیش کے 137، انڈونیشیا کے 129، بھارت کے 114، کیمرون کے 106، پاکستان کے 83 اور نائیجریا کے 78 حاجی شہید ہوئے اس کے علاوہ الجزائر، بینن، برکینا فاسو، برونڈی، چاڈ، ایتھوپیا، جبوتی، گیمبیا، گھانا، عراق، آئیوری کوسٹ، چین اردن، کینیا، لبنان، لیبیا، ملائیشیا، مارشئس، مراکش، برما، ہالینڈ، اومان، فلپائن، سینگال، صومالیہ، سری لنکا، سوڈان، تنزانیہ، ترکی، تیونس اور یوگنڈا کے حاجی بھی اس سانحے میں شہید ہوئے۔

سعودی عرب کے سرکاری ذرائع کے مطابق یہ حادثہ اس طرح پیش آیا کہ حاجیوں کے دو ہجوم جمرات کے پل پر آمنے سامنے سے آتے ہوئے آپس میں ٹکرا گئے۔ جس مقام پر یہ دونوں ہجوم ٹکرائے وہاں دو تنگ راستے آپس میں ملتے تھے راستہ نہ ملنے اور پیچھے سے آنے والے حاجیوں کا دباؤ پڑنے کی وجہ سے بہت سے حاجی زمین پر گر کر کچلے گئے۔ سعودی حکومت کی جانب سے حج کے انتظامات پر ناکافی توجہ دینے کی وجہ دینے کی وجہ سے ہجوم بے قابو ہوگیا اور لوگوں پر قابو نہ پایا جاسکا۔ جس کی وجہ سے دنیا بھر میں سعودی انتظامیہ پر انتظامات پر توجہ نہ دینے پر سوال اٹھائے گئے۔ منیٰ میں 1997ء میں خیموں میں لگنے والی آگ کے بعد سے سعودی حکومت نے فائر پروف خیمے فراہم کئے تھے موجودہ سانحہ کے بعد سعودی عرب کے شاہ سلمان نے اس افسوسناک سانحہ پر میڈیا پر خطاب کرتے ہوئے یقین دلایا کہ حج کے انتظامات کا از سرنو جائزہ لیا جائے گا اور حادثے کی وجوہات جاننے کی بھی مکمل کوشش کی جائے گی۔ بعد ازاں سعودی حکام نے اس حادثے کی جو وجوہات بیان کیں ان کے مطابق افریقی ممالک سے آنے والے حجاج نے سعودی حج قوانین کی پابندی نہیں کی تھی اگرچہ حج کے احکامات جا بجا حجاج کرام کی راہنمائی کے لیے راستوں پر آویزاں کئے جاتے ہیں۔ اسی لاقانونیت کی وجہ سے یہ سانحہ پیش آیا۔ حادثہ اتنا بڑا تھا کہ ہزاروں امدادی کارکن اور سینکڑوں گاڑیاں رات گئے تک امدادی کاموں میں مصروف رہیں جبکہ اس دوران ہزاروں کارندوں کو حادثے کے باوجود جاری مناسک حج کی ادائیگی میں مصروف حجاج کرام کی دیکھ بھال اور نظم وضبط قائم رکھنے کی ذمہ داریاں نبھانا پڑیں۔

منیٰ کے اس سانحے کے عینی شاہدین کے مطابق یہ حادثہ اس وقت پیش آیا جب ایک معذور شخص اپنی وھیل چیئر سے پھسل کر نیچے گرا اور پھر بہت سے دیگر افراد اس پر گر پڑے۔ پھر صورتحال اتنی خراب ہوئی کہ لوگ سانس لینے کے لیے ایک دوسرے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہزاروں انسان لہروں کی طرح حرکت کر رہے ہیں۔ اچانک آپ ہی آپ آگے کی طرف بڑھنے لگتے پھر آپ ہی آپ پیچھے کی جانب گرنے لگتے تھے۔ ان حالات میں بھگدڑ مچنے کے بعد لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے اور کچلے جانے لگے بزرگ اور خواتین حاجیوں کی چیخ و پکار ہر طرف سنی جارہی تھی مگر ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

پاکستان کی حکومت نے پہلے تو ایک غیر ملکی اخبار میں شائع ہونے والی اس خبر کو کہ اس سانحے میں 236 پاکستانی حجاج کرام بھی شہید ہوئے ہیں ماننے سے انکار کر دیا مگر جب عوام نے شور مچایا تو وزیراعظم نواز شریف نے لاپتہ حاجیوں کا پتا چلانے کے لیے خصوصی احکامات جاری کئے۔

2015ء..... نیپال میں آنے والا بدترین تاریخی زلزلہ

کسی نے سال 2015ء کے لیے کیا خوب کہا، ''اے گئے سال تیرا ہر دن تھا درد کی دھوپ اور کرب کی چھاؤں لیے'' یہ واقعہ ہے کہ بعض سالوں کی یادیں بیش تر تلخ اور پتھریلی ہوتی ہیں انہیں سالوں میں سے ایک 2015ء تھا۔ اس سال بہت سے ایسے واقعات تاریخ عالم میں رونما ہوئے جنہیں سانحات کا نام دیا جاسکتا ہے انہیں حادثات و واقعات عالم میں امسال 25 اپریل کو نیپال میں آنے والا بدترین زلزلہ بھی شامل تھا۔ یہ زلزلہ نیپال کی تاریخ میں گذشتہ 80 سالوں میں آنے والا سب سے بدترین زلزلہ تھا۔ اس کی ریکٹر اسکیل پر شدت 7.8 درجے تھی۔ اس زلزلے کی وجہ سے نیپال میں 9 ہزار اموات واقع ہوئیں اور 23 ہزار سے زائد افراد شدید زخمی ہوئے۔ اس سے پہلے 1934ء میں نیپال میں ایک شدید زلزلہ آیا تھا جس میں تقریباً 17 ہزار افراد ہلاک ہوگئے تھے اور دارالحکومت کھٹمنڈو کا ایک چوتھائی حصہ تباہ ہوگیا تھا۔ ماہرین ارضیات کی رائے کے مطابق 2015 کا زلزلہ بھی انہیں خطوط پر آیا تھا۔ جن کے تحت نیپال میں سات سو برس پہلے بھی دو بڑے زلزلے آئے تھے۔ زمین میں دراڑیں پڑنے کے بعد ارضی دباؤ کے ایک سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی وجہ سے اس تباہ کن آفت نے شدید نقصانات پہنچائے اس زلزلے کا شکار زیادہ تر نیپال کا وہ مرکزی علاقہ بنا تھا جہاں کھٹمنڈو اور پوکھارا کے شہر آباد ہیں۔ اس زلزلے کے جھٹکے صرف ایک منٹ تک محسوس کیے گئے مگر اس ایک منٹ میں ہی قیامت صغریٰ بپا ہوگئی اور بھاری جانی و مالی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ اس زلزلے سے نیپال کے تاریخی ثقافتی ورثے کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ یونیسکو کی طرف سے کھٹمنڈو میں بین الاقوامی ورثہ قرار دیئے جانے والے سات مقامات میں سے چار کو اس زلزلے میں شدید نقصان پہنچا۔ جبکہ اس شہر کے 80 فی صد مندر تباہ ہوگئے۔ تباہ ہونے والی دیگر عمارات میں کھٹمنڈو کا دہرا گرین ٹاور بھی شامل تھا۔ یہ ٹاور 1832ء میں تعمیر کیا گیا تھا اور اسے نیپال کے پہلے وزیراعظم کے نام پر تھمسن ٹاور بھی کہا جاتا تھا۔ اس ٹاور کی 200 سیڑھیاں تھیں جن پر چڑھ کر پورے شہر کا نظارا کیا جاسکتا تھا۔ کھٹمنڈو کے پرانے شہر میں واقع دربار اسکوائر میں بھی تباہی کے مناظر دیکھنے میں آئے، بھکتا پور کے مرکزی مندر کی چھت مکمل طور پر تباہ ہوگئی۔ جبکہ 16ویں صدی میں تعمیر کیے جانے والا وٹسالا مندر بھی تباہ ہوگیا۔ اس مندر کے ریتلے پتھر کی دیواروں پر سونے کا پانی چڑھا

ہوا تھا اس بڑی تباہی کے بعد 12 مئی کو نیپال میں دوبارہ زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے گئے۔ جن کی شدت ریکٹر اسکیل پر 7.3 تھی تاہم اس بعد کے زلزلے سے پہلے کی نسبت بہت کم جانی و مالی نقصان ہوا۔ 150 کے قریب ہلاکتیں ہوئیں مگر امدادی سرگرمیاں تعطل کا شکار ہوگئیں۔ زمین کی دو بڑی بالائی پرتوں Tectonicplates کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے نیپال نے 80 برسوں میں دو بڑے زلزلوں کا سامنا کیا۔ 1934ء میں آنے والا زلزلہ جس کا پہلے ذکر کیا گیا ریکٹر اسکیل پر 8.0 درجے شدت کا تھا۔ اس کے علاوہ 1988ء میں ایک شدید زلزلے سے نیپال میں 1500 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ یاد رہے کہ یورایشیا (یورپ اور ایشیا) اور انڈیا کی بالائی پرتوں کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے اس ہمالیائی خطے میں زلزلے آتے ہیں۔ انڈیا کی پرتیں یورایشیائی پرتوں کے نیچے شمال کی جانب سالانہ 45 ملی میٹر کھسک رہی ہے۔ اس عمل کو سائنسی اصطلاح میں تھرسٹ فالٹ Thrust fault کہا جاتا ہے۔ یہ مقام ہمالیائی پہاڑی سلسلے پر مشتمل ہے۔ ماہرین کے مطابق نیپال میں بیشتر زلزلے تھرسٹ فالٹ کی وجہ سے آتے ہیں۔ انہیں زلزلوں کی وجہ سے ہمالیائی پہاڑوں کی ایک چوڑی پٹی نیچے سرک گئی ہے جبکہ اس سے ملحقہ کھٹمنڈو باسن Basin بھی اسی وجہ سے بلند ہوگیا ہے۔

حکومت نیپال نے 2015ء میں آنے والے دونوں زلزلوں کی وجہ سے ہونے والے نقصانات پر جو رپورٹ شائع کی اس کے مطابق اس ناگہانی آفت کے نتیجے میں 5 لاکھ کے قریب گھر تباہ ہوگئے اور 28 لاکھ افراد بے گھر ہوگئے۔ حکومت کے تخمینہ کے مطابق ان زلزلوں سے نیپال کی معیشت کو تقریباً سات بلین ڈالر کا نقصان پہنچا ہے۔ اس زلزلے بعد نیپال کے لوگوں کو صحت کی سہولیات سے محرومی اور صاف پانی کی فراہمی جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا آبی نظام متاثر ہونے کی وجہ سے نیپال کے بعض حصوں میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی۔ زلزلے کے بعد ملکی اور غیر ملکی تنظیموں نے امدادی کاروائیوں کا آغاز کر دیا تھا اور متاثرین کے لیے عارضی پناہ گاہوں اور گھروں کی تعمیر کی گئی تھی اور ڈھائی لاکھ بچوں کے لیے عارضی کلاس رومز کا بندوبست کیا گیا تھا۔

2015ء.....فرانس کا نائن الیون

پیرس یورپ کے دل کی حیثیت رکھتا ہے اور خوشبوؤں کا شہر کہلاتا ہے۔ جمعہ 13 نومبر کو فرانس کے اسی خوشبوؤں کے شہر اور دارالحکومت میں لوگ معمولات زندگی میں مشغول تھے اور ہمیشہ کی طرح اس کے بازاروں میں اور شاہراہوں پر بڑی گہما گہمی تھی۔ شہر کے اوپیرا ہاؤس اپنے میوزیکل اور غنائیہ اوپیراز پیش کر رہے تھے۔ موسیقی کے دلدادہ اپنی پسند کے گلوکاروں کی خوش گلوئی سے محظوظ ہو رہے تھے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ 2001 میں نیویارک میں پیش آنے والے آگ و خون کے کھیل کو آج پیرس میں بھی دہرایا جائے گا۔ جدید زمانے میں اگرچہ ترقی یافتہ ممالک کے ہر شہری کی جان کی حفاظت کا دعویٰ کیا جاتا ہے مگر اس دن فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک کی حکومت خود اپنے بھی دارالحکومت میں ایسا کرنے میں ناکام رہی۔ دہشت گردوں کے کچھ گروہوں نے پیرس میں قیامت صغریٰ بپا کر دی۔ ریستوران، کیفے اور بیٹا کلاں تھیٹر کے کنسرٹ ہال میں موسیقی کے ایک پروگرام میں اور دیگر مقامات پر موجود سینکڑوں شہری چشم زدن میں گولیوں، بم دھماکوں اور آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ حملہ آور دہشت گردوں نے نہ صرف لوگوں پر فائرنگ کی بلکہ بہت سوں نے خود کو لوگوں کے درمیاں خودکش دھماکوں سے اڑا دیا۔ موسیقی کے کنسرٹ ہال میں خوش گلوئی کی بجائے لوگوں کی چیخنے چلانے اور واویلا کرنے کی آوازیں اس وقت بلند ہونا شروع ہوگئیں جب دہشت گردوں نے 100 سے زائد لوگوں کو یرغمال بنا کر درجنوں کو بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس تھیٹر میں ہلاک کئے جانے والوں میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی۔ ان دہشت گردانہ کاروائیوں میں ہلاک ہونے والے صرف فرانس کے شہری ہی نہیں تھے بلکہ برطانیہ، چلی، میکسیکو، اسپین، مراکش اور پرتگال کے علاوہ بھی کئی اور ممالک کے لوگ شامل تھے۔ دہشت گردوں نے انتہائی منظم اور منصوبہ بندی سے کئے گئے ان حملوں میں کم از کم 130 افراد ہلاک کر دیئے جن میں 88 صرف بیٹاں کلاں تھیٹر میں موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مارے گئے۔ عالمی میڈیا نے پیرس میں ہلاکتوں کی تعداد 180 سے بھی زائد بتائی ہے۔ یہ فرانس کی تاریخ کی سب سے بڑی دہشت گردانہ کاروائی تھی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک ایک ہی موقع پر ہونے والی سب سے زیادہ ہلاکتیں۔ اس دہشت گردانہ کاروائی میں 366 افراد زخمی ہوئے پیرس کو خون اور آگ میں نہلانے والے

دہشت گردوں میں سے کچھ تو خودکش دھماکوں سے ہلاک ہو گئے تھے جبکہ کچھ کو سیکورٹی فورسز نے ہلاک کر دیا۔ اطلاعات کے مطابق اس ساری کاروائی میں سات دہشت گردوں نے حصہ لیا تھا۔ عراق و شام اور دنیا کے مختلف ملکوں میں دہشت گردی میں ملوث انتہا پسند تنظیم دولت اسلامیہ عراق و شام (داعش) نے پیرس میں کیے گئے ان دہشت گردانہ حملوں کی ذمہ داری قبول کرلی اور کہا کہ یہ کاروائی شام اور عراق پر فرانس کی طرف سے کیے جانے والے داعش پر حملوں کے جواب میں کی گئی ہے ہم امریکہ سمیت دیگر مغربی ممالک میں ایسے ہی مزید حملے کریں گے دوسری طرف فرانسیسی صدر نے ان دہشت گردانہ حملوں کو فرانس پر کیے جانے والے حملے سے تعبیر کیا اور بتایا کہ ان حملوں کی منصوبہ بندی شام میں کی گئی تھی اور ان کو عملی جامہ بیلجیم اور فرانس میں موجود دہشت گردوں نے پہنایا ہے۔ اس حملے کے بعد فرانس نے ہنگامی حالت کے نفاذ کا اعلان کر دیا اور اپنی سرحدوں کو مکمل طور پر سیل کر دیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ کچھ حلقوں کی طرف سے یہ شک ظاہر کیا جارہا تھا کہ شام اور دیگر عرب ممالک سے آنے والے سینکڑوں مہاجرین میں بہت سے دہشت گرد بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فرانس نے جوابی کاروائی کے طور پر شام میں داعش کے خلاف اپنا فضائی آپریشن بھی تیز کر دیا اور فرانسیسی طیاروں نے داعش کے ٹھکانوں پر شدید بمباری کی۔

پیرس میں دہشت گردی کے اس واقعہ کے 5 دن بعد سینٹ ڈینس Saint denis میں پولیس مقابلے میں مبینہ طور پر ان حملوں کا ماسٹر مائینڈ عبدالحامد عیاود اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مارا گیا۔

تاہم اس کے تیار کردہ دہشت گردی کے اس پلان میں کاروائی بھرپور طریقے سے انجام دی گئی تھی۔ یہاں تک کہ جدید آلات سے لیس فرانسیسی اہل کار اور جگہ جگہ لگے ہوئے سی سی ٹی وی کیمرے اور جاسوسی کا موثر نظام ان مسلح دہشت گردوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے وقت نہ پکڑ سکا۔ کنسرٹ ہال کے بعد دوسرا بڑا حملہ دہشت گردوں نے فٹ بال اسٹیڈیم کے باہر کیا تھا۔ یہ دہشت گردی اس سے بھی سنگین تھی کہ اس اسٹیڈیم میں فٹ بال میچ دیکھنے کے لیے خود فرانسیسی صدر اپنی کابینہ کے ارکان سمیت موجود تھا۔ اور جرمنی کے وزیر خارجہ فرنک والٹر بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے کیونکہ یہ میچ جرمنی اور فرانس کے درمیان کھیلا جارہا تھا کسی ملک کے صدر کی کسی جگہ موجودگی کے وقت سکیورٹی بہت سخت ہوتی ہے مگر اس کے باوجود دہشت گرد اپنی کاروائی میں کامیاب رہے تھے۔ پیرس کے دو اور مقامات پر، پیزا سنٹر، جاپانی ہوٹل اور کمبوڈیا کے ایک ریستوران پر بھی دہشت گردوں نے حملہ کیا اور گولیوں کی بوچھاڑ سے درجنوں بے گناہ انسانوں کو خون میں غلطاں کر دیا گئی اور مقامات مثلاً ریوڈی البرٹ Rued alibert ریوڈی لا فونٹین، ریوڈی کیمرون پر فائرنگ کے واقعات پیش آئے جبکہ خودکش بمباروں نے اسٹیڈیم ڈی

فرانس، بولیوارڈ والٹیئر میں دھماکے کئے اس کے علاوہ جب سکیورٹی فورسز نے جوابی کاروائی کی تو مقابلے کے دوران دو دہشت گردوں نے خود کو بیٹا کلاں تھیٹر کے مقام پر بموں سے اڑا دیا۔ فرانسیسی حکام کے مطابق اس دہشت گردانہ کاروائی کے دوران دہشت گرد نہ صرف جدید اسلحے سے لیس تھے بلکہ انہوں نے خودکش جیکٹیں بھی پہن رکھی تھیں۔ جن سے یہ واردات مزید تباہ کن بن گئی۔ اسٹیڈیم کے باہر ایک خودکش بمبار کو ایک سکیورٹی اہل کار نے روک لیا تھا جس پر اس نے فوری دھماکہ کرکے خود کو اڑا لیا۔ یہ بھی دہشت گردوں کی منصوبہ بندی کا ایک حصہ تھا کیونکہ حملے کے بعد جب لوگ بڑی تعداد میں اس اسٹیڈیم سے نکلے تو دہشت گردوں نے ان کو نشانہ بنایا۔ بیٹاں کلاں تھیٹر میں ایک امریکی موسیقاروں کا طائفہ ایگل آف ڈیتھ میٹل Eagle of death تقریباً 1500 سامعین کو موسیقی سے محظوظ کر رہا تھا کہ اچانک کلاشنکوفوں سے مزین 3 نقاب پوش دہشت گرد ہال میں داخل ہوگئے اور انہوں نے نہتے سامعین پر اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ اس تھیٹر میں فائرنگ کرنے سے پہلے دہشت گردوں نے اللہ اکبر کا نعرہ بھی لگایا تھا۔ یہاں کچھ کہنا مشکل ہے کہ کیا فرانسیسی حکومت نے یہ بیان جاری کرکے اس واردات کو مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال دیا تھا یا ڈالنا چاہا تھا؟

2016ء..... ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں برف کا طوفان

22 سے 24 جنوری 2016 کو ایک بڑے برفانی طوفان کی وجہ سے بحر اوقیانوس کے وسطی حصے اور شمال مشرقی امریکی ریاستوں میں 3 فٹ (۹۱ سنٹی میٹر) کے قریب برفباری ہوئی جو سائنسدانوں کے مطابق ٹیکساس کے علاقے میں 21 جنوری کو فضائی دباؤ کم ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہونے والے برفانی طوفان کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اسے موسمیاتی ماہرین نے ایک تاریخی برفانی طوفان Historic blizzard کا نام دیا ہے۔ اس کے علاوہ موسمیاتی ماہرین کے مطابق اس برفانی طوفان سے بحر اوقیانوس کے وسطی حصوں میں دو فٹ برف باری ہونے کی وجہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مشرقی حصے پر جمود طاری ہوگیا موسم سرما کے ایک ماہر پال کوسین Paulcocin کے مطابق یہ برفانی طوفان 10 شدید برفانی طوفانوں میں سے ایک تھا۔

20 سے 22 جنوری 2016ء کو گیارہ امریکی ریاستوں کے گورنروں اور واشنگٹن ڈی سی کے میئر نے برفانی طوفان سے پیدا ہونے والے مصائب کی پیش بندی کرتے ہوئے ہنگامی حالت نافذ کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اندازاً 103 ملین لوگ اس برفانی طوفان سے متاثر ہوئے جبکہ کل 33 ملین لوگوں کو اس برفانی طوفان سے خبردار کیا گیا تھا۔ شاہراہوں پر جمی برف کو ہٹانے کے لیے بھی ہزاروں گیلن برائن Brine اور روڈ سالٹ استعمال کیا گیا تاکہ اس برفباری کے اثرات کم کئے جاسکیں۔ نیو یارک، نیوجرسی اور نیو آرک میں 23 سے 24 جنوری تک سفر کرنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ اس برفانی طوفان کو کئی غیر سرکاری نام بھی دیئے گئے مثلاً موسم سرما کا طوفان جوناس اور سنوزیلا Snowzilla وغیرہ وغیرہ۔

7 امریکی ریاستوں میں اس طوفان کے دوران 30 انچ سے زائد برفباری ہوئی جبکہ ماؤنٹ میچل M.Mitchell پر سب سے زیادہ برفباری 66 انچ (176 ملی میٹر) ریکارڈ کی گئی۔ یہ پہاڑی چوٹی شمالی کیرولینا میں واقع ہے۔

برف میں ڈھکی شاہراہوں پر کئی سو حادثات رونما ہوئے جن میں سے کچھ حادثات بڑے تھے اور ان میں بڑی تعداد میں لوگ جاں بحق اور زخمی ہوئے۔ کم از کم اس طوفان کی وجہ سے ہونے والے حادثات میں 53 افراد جاں بحق ہوگئے جن میں سے 12 ورجنیا میں، 9 پنسلوانیا میں 6 نیو جرسی، 6 نیویارک،6

شمالی کیرولینا اور 4 جنوبی کیرولینا کے علاوہ 3 میری لینڈ، 3 واشنگٹن ڈی سی، ایک آرکنساس، ایک ڈیلاویر، ایک جارجیا اور ایک کینٹکی میں ہلاک ہوا تھا۔ مالی نقصانات 500 ملین ڈالر سے 300 بلین ڈالر کے درمیان ہوئے۔ یہ طوفان کیٹگری 4 کرپلنگ Crippling کا طوفان تھا برفانی طوفان کے ساتھ ساتھ پہلے ایک ہلکا سا طوفان البرٹاکلپر Albertaclipper بھی آیا۔ جس کے بعد وسطی بحیرہ اوقیانوس کے علاقوں میں شدید برفباری شروع ہوگئی۔ 20 جنوری کو واشنگٹن میں ایک انچ برفباری ہوئی۔ مگر اس سے شاہراہوں پر پھسلن پیدا ہوگئی۔ 21 جنوری کو کئی علاقوں میں ٹریفک جام کے واقعات بھی پیش آئے۔ صرف ورجینیا سٹیٹ پولیس نے 767 روڈ حادثات کی اطلاع دی جن میں 392 گاڑیاں بے کار ہوگئیں۔

22 جنوری کے دوپہر کے وقت سے کیرولینا کے ساحلوں کے ساتھ فضائی وبا کی کمی کا شکار ایک نیا علاقہ سامنے آیا۔ جیسے جیسے برفانی طوفان وسطی جارجیا میں داخل ہوا۔ 25 جنوری کو برفانی طوفان متحدہ امریکہ کے مشرقی ساحل سے پرے چلا گیا اور روزمرہ کی زندگی بحال ہوگئی۔

تاہم 21 اور 22 جنوری کو گورنرز آف ڈیلاویر، جارجیا کینٹکی، میری لینڈ، نیویارک، نیو جرسی، شمالی کیرولینا، پنسلوانیا مغربی ورجینیا اور ٹینیسے اور میئر آف واشنگٹن ڈی سی نے ہنگامی حالت کے نفاذ کا اعلان کر دیا تھا تاکہ برفانی طوفان سے بچا جاسکے۔

ایئر لائنز نے 1000 سے زائد پروازیں معطل کر دیں اور سینکڑوں ہوائی جہاز گراؤنڈ کر دیئے گئے تھے۔ جبکہ 23 جنوری کی دوپہر تک معطل کی جانے والی پروازوں کی تعداد 10 ہزار سے بھی تجاوز کر گئی جبکہ 2000 سے زائد پروازیں لیٹ ہوگئیں۔ واشنگٹن میں شدید برف باری کی وجہ سے ہنگامی حالت کے نفاذ کا مطلب یہ تھا کہ شہری رات 9:30 منٹ کے بعد سنوفالنگ ہونے کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ واشنگٹن کے میئر نے شہریوں پر زور دیا کہ وہ برف کے اس طوفان کے دوران اپنے اپنے گھروں میں ٹھہریں اور محتاط رہیں۔

کتابیات و ویب سائٹس

The Great fire of Rome by stephen D.C. Angus. M. Gun, Encyclopedia of disasters.

K. Bradley Penuel, Encyclpedia of Disaster relief, John withington, disasterous history of the world.

List 25. com, 25 worst disasters ever recorded wikipedia list of natural disasters by death toll disasterium, great disasters in the history

Infoplease.com. Disasters of the year 2001

Infoplease.com. disasters of the year 2002

Infoplease.com. disasters of the year 2003

Fire Disasters by annweil.

The world worst disasters of the 20th century, Hamly books

The great influenza, the story of the dead liest pandemic by John M.barry.

Ten worst disaster of the time.

Natural disasters, Patrick L. Abbott.

Int the wake of disasters by Harold. G Koeng

Great disasters by Robert Dolezal

Great disasters in the history by Brenda Z.Gujberson

Air disasters and near misses, Paul simpson

The titanic disaster by peter Benolt

The Exxon Valdez oil spill by Peter B.N.

Disasters man made by David white & Anton Richer.

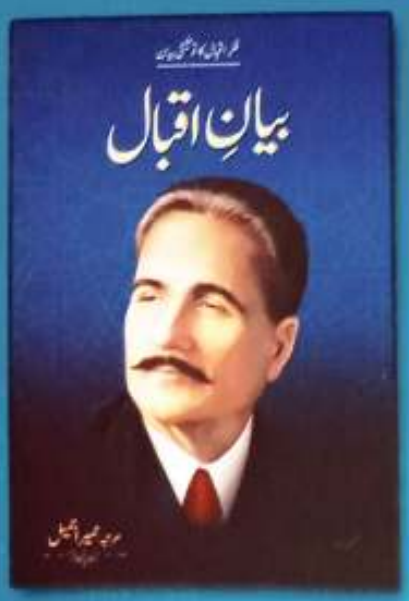

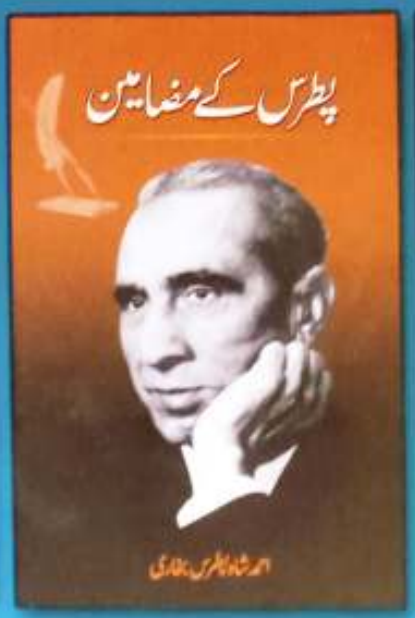

دُعا پبلی کیشنز
الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور
فون 0300-8476417 / 042-37233585
E-mail:duapublications@gmail.com

Rs 695/-